مجلۂ عثمانیہ

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیر

شیخ محمد خلیل اللہ

بی۔ اے (عثمانیہ)

شریک مدیر

میر اکبر علی ناصری

متعلم بی۔ اے (عثمانیہ)

مہتمم

۹	موجودہ جنگ اور صنعتی جھگڑے	جناب محمد ناصر علی

جلد (۱۴) شمارہ (۱ و ۲)

مجلس انتظامی

سال تعلیمی ۱۳۴۹-۵۰ف

صدر

مولوی قاضی محمد حسین صاحب
ام اے۔ ال ال۔ بی (کنٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب ام اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصۂ انگریزی)

وی۔ یس۔ کرشن صاحب ام۔ اے (آکسن) لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ یس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

کرشن دیال بھٹناگر بی۔ یس سی (عثمانیہ) مہتمم ... حصۂ انگریزی مجلہ عثمانیہ

(ارکان ...)
نگر، دہلی

محمد عمر مہاجر صاحب صدر انجمن اتحاد
حامد الرحمن صاحب شریک مدیر حصۂ انگ...

Title Printed at The Fine Press

مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۴) شمارہ (۱ و ۲)

مجلس مشاورت

مولوی قاضی محمد حسین صاحب
ام اے۔ ال ال۔ بی (کنٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب ام اے، پی ایچ۔ ڈی۔ (لندن) ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ انگریزی)

دی۔ یس۔ کرشن صاحب ام۔ اے، (آکسن) لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

...ات جامعہ عثمانیہ

9	موجودہ جنگ اور صنعتی جھگڑے	جناب محمد ناصر علی

اِطلاع

(۱) تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔
(۲) خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
(۳) چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

چندہ

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	بارہ	روپیہ	سالانہ پیشگی
(۲) ارباب جامعہ، اصحاب اقتدار اور اداروں سے	آٹھ	″	″
(۳) عام خریداروں سے	چھ	″	″
(۴) طلبار قدیم، رفاہیہ انجمنوں اور مطالعہ خانوں سے	پانچ	″	″
(۵) طلبہ جامعہ عثمانیہ سے	چار	″	″
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵	شلنگ	″
(۷) بلاد یورپ کے طلبار قدیم سے	۱۰	″	″
(۸) فی رسالہ	دو	روپیہ	

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہوں گے [illegible] بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔
(۱) بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کا [illegible]
وی پی کے اخراجات ۴ آنے کا [illegible]

Title Printed at The Fine Pre[illegible]

فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۴) شمارہ (۱ و ۲)

نشان سلسلہ	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
	قرارداد تعزیت مادر دکن		ھ
۱	افسانۂ ما	شیخ محمد خلیل اللہ مدیر	و
۲	غزل	عالیجناب نواب معین الدولہ بہادر معین امیر پائیگاہ	۱
۳	خطبۂ صدارت	جناب محمد عمر صاحب مہاجر ام۔ اے (آخری) صدر انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیہ	۲
۴	شاعری میری نظر میں	جناب عبدالقیوم خان صاحب باقی ام، اے عثمانیہ لکچرار۔ ادبیات اردو	۷
۵	بیسویں صدی (نظم)	″ ″ ″ ″	۲۵
۶	علمیات یا نظریہ علم	جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ام اے۔ پی۔ ایچ ڈی بار ایٹ لا پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۲۷
۷	غزل	جناب سیماب اکبر آبادی	۳۸
۸	گولکنڈے کا تمدن	جناب عبدالمجید صاحب صدیقی ام۔ اے۔ ال ال۔ بی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ	۳۹
۹	موجودہ جنگ اور صنعتی جھگڑے	جناب محمد ناصر علی صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ	۴۴

نمبر سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۰	امجد کی رباعیاں	جناب عظیم الدین صاحب محبت متعلم ام۔ اے (آخری)	۵۲
۱۱	غریب (نظم)	" "	۵۴
۱۲	ایک رات (افسانہ)	جناب عبدالرشید صاحب قریشی متعلم ام۔ اے (ابتدائی)	۵۵
۱۳	سیرت محمدی کا مطالعہ	جناب رائے نارائن پرشاد صاحب سریواستو متعلم ام۔ اے (ابتدائی)	۶۲
۱۴	غزل	جناب عبدالحفیظ صاحب قتیل متعلم ام۔ اے (ابتدائی)	۷۳
۱۵	سکون	جناب علی احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)	۷۴
۱۶	حسین گزارش (نظم)	" "	۷۶
۱۷	پھول کی سرگزشت	شیخ محمد خلیل اللہ متعلم ال۔ ال بی (آخری)	۷۸
۱۸	گیٹس	جناب عزیز احمد صاحب (عثمانیہ)	۸۱
۱۹	چھٹیوں میں	جنابہ احمد النساء بیگم ثریا جبیں صاحبہ متعلم بی۔ اے (آخری)	۹۰
۲۰	ایک خط (نظم)	جناب قادر محی الدین صاحب اثیر متعلم بی۔ اے (آخری)	۹۳
۲۱	بھکارن (افسانہ)	جناب محمد علی صاحب منیر متعلم بی۔ اے (آخری)	۹۴
۲۲	غزل	جناب محمد خلیل الرحمٰن صاحب متعلم بی۔ اے (آخری)	۱۰۵
۲۳	محمود گاوان کے مزار پر (نظم)	جناب محمد نعیم الدین صاحب صدیقی متعلم بی۔ اے (آخری)	۱۰۶
۲۴	علم تاریخ کی ماہیت اور اہمیت	جناب محمد عبدالعزیز صاحب صدیقی متعلم بی۔ اے (آخری)	۱۰۷
۲۵	شباب (نظم)	جناب مرزا متین احمد صاحب سروش متعلم بی۔ اے (آخری)	۱۱۲
۲۶	ہمارا نصب العین	جنابہ رضیہ صاحبہ متعلم بی۔ اے (ابتدائی)	۱۱۳
۲۷	غزل	جناب امیر احمد صاحب خسرو متعلم بی۔ اے (ابتدائی)	۱۱۹
۲۸	چھتری (افسانہ)	جناب سید مبارز الدین احمد صاحب متعلم بی۔ اے (ابتدائی)	۱۲۰
۲۹	یاد ہے (نظم)	جناب عظیم (عثمانیہ) سابق طالب علم	۱۳۱

نمبر سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۳۰	شام	جناب امجد علی خان صاحب یوسف زئی متعلم بی۔ اے (ابتدائی)	۱۳۲
۳۱	حقیقت غم (نظم)	جناب احمد معین الدین صاحب بزمی متعلم بی۔ اے (ابتدائی)	۱۳۹
۳۲	نامیاتی کیمیا اور اس کا ارتقار	جناب معین الدین حسن صاحب عثمانی متعلم بی۔ ایس سی (آخری)	۱۴۰
۳۳	حیدرآباد میں صنعت شکر سازی	جناب سید انوار حسین صاحب متعلم بی۔ ایس سی (آخری)	۱۴۵
۳۴	میرا مقبول شاعر	جناب احمد علی صاحب متعلم سال دوم	۱۴۹
۳۵	نور و ظلمت (افسانہ)	جنابہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ متعلم سال دوم	۱۵۵
۳۶	ٹیگور کی شاعری اور اس کے محرکات	جناب سید احمد حسین صاحب متعلم سال اول	۱۶۱
۳۷	اُردو ڈرامہ	جناب رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی متعلم سال اوّل	۱۶۵
۳۸	عجیب اتفاق (افسانہ)	جناب شیخ امیر الدین حسین صاحب متعلم سال اول	۱۷۶
۳۹	بت تراش (افسانہ)	جناب سید نعیم الدین احمد صاحب متعلم سال اول	۱۸۲
۴۰	ابھاگن (افسانہ)	ایس وائی انسیم متعلم سال اول	۱۸۵
۴۱	خطبۂ صدارت	جناب ابوالمکارم محمد فہیم الدین صاحب متعلم ال۔ ال بی (آخری) صدر بزم قانون	۱۸۹
۴۲	خطبۂ صدارت	جناب سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفر چشتی متعلم ام۔ اے (آخری) صدر بزم دینیات	۱۹۳
۴۳	کلیسا (نظم)	جناب منظور حسین صاحب شور ام۔ اے۔ ال۔ ال بی پروفیسر مارس کالج ناگپور	۲۰۲
۴۴	ہندوستانی مصنوعات پر جنگ کے اثرات	جناب احمد خان صاحب متعلم ام۔ اے (آخری) سابق مدیر حصہ اُردو	۲۰۴
۴۵	غزل	جناب خورشید احمد صاحب جامی۔	۲۲۱
۴۶	جواب (نظم)	جناب جمیل احمد فاروقی۔ بی۔ ایس سی (عثمانیہ)	۲۲۲

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۴۷	عہد نبوت میں دنیا کی اخلاقی اور مذہبی حالت	جناب شعیب اللہ خان صاحب متعلم سال اوّل شریک بیر	۲۳۳
۴۸	تعزیت مادر دکن	میر اکبر علی صاحب ناصری متعلم بی۔ اے (ابتدائی)	۲۴۲
	کلیہ کی خبریں	〃 〃 〃	۲۴۳
۴۹	غزل	جناب ڈاکٹر کرپا شنکر صاحب حشمؔ	۲۴۹

قرارداد تعزیت

علیا حضرت بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ

ہم جمیع اساتذہ و عہدہ داران و مدیران طلبہ اور ملازمین جامعہ عثمانیہ اعلیٰحضرت جلالت الملکت شہنشاہ دکن بندگانعالی مدظلہم العالی کی والدہ ماجدہ علیا حضرت بڑی بیگم صاحبہ (نور اللہ مرقدھا) کی وفات حسرت آیات پر اپنے انتہائی جذبات عقیدت و وفاداری کے ساتھ اپنے دلی حزن و ملال کا اظہار کرتے ہیں اور بارگاہ خسروی میں اپنی گہری ہمدردی اور پرخلوص تعزیت بکمال ادب پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہوئے بہ صمیم قلب دست بدعا ہیں کہ باری تعالیٰ علیا "مادر دکن" مرحومہ کو بہشت بریں میں جگہ عطا فرمائے اور اس ناقابل تلافی سانحہ عظیم پر (جو مدت العمر بھولا نہیں جا سکتا) ہمارے مشفق و مہرباں ہر دلعزیز شاہ ذیجاہ سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نیز معزز خانوادہ آصفی و پس ماندگان والا تبار کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین

افسانۂ ما

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

تقریباً گزشتہ دو سال سے یہ ہو رہا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے مجلہ کی کابینہ کا انتخاب عین اُس وقت ہوتا ہے جبکہ تمام طلبا ر اپنے اپنے امتحانوں کی تیاری میں مصروف ہو جاتے ہیں میدانی کھیل بند ہو چکتے ہیں۔ خوش گپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ کوئی نوٹس کی تکمیل میں منہمک تو کوئی مطالعہ سرسری کی کتابوں کی فراہمی میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ "سلام علیکم" کے ساتھ ہی "وعلیکم السلام" کہہ دیا اور اپنے کمرے کی طرف لپکے' زبردستی کسی کو روک کر کہتے بھی ہیں کہ بھیّا ! نیا شمارہ بہت جلد نکلنے والا ہے اپنا کوئی مضمون عنایت کیجئے" تو فوراً جواب ملتا ہے کہ "بھائی اب کوئی نیا مضمون لکھنے کے لئے تو وقت نہیں ہے البتہ کوئی مضمون لکھا ہوا اگر موجود ہے تو فرصت سے نکال دونگا۔"

ایسی صورت میں کیونکر ممکن تھا کہ وقت پر شمارہ نکالیں۔ لیکن باوجود ان تمام مشکلات کے ہم نے کافی مضامین فراہم کئے اور یقین جانئے ہم اپنے فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہوتے اور کئی روز پیشتر زیر نظر شمارہ آپ حضرات کے ہاتھ میں ہوتا اگر انتظامی دقتیں سدِ راہ نہ ہوتیں اور اہل مطبع ناگوار اور طویل تاخیر نہ کرتے۔

قارئین کے گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا مجلہ صرف موجودہ طلبار و طالباۃ کے ادبی ذوق کا ترجمان ہے اس کی حیثیت کسی علمی تحقیقاتی انجمن کے ترجمان کی نہیں۔ اس لئے ہم نے

خاص طور پر اس کا لحاظ رکھا ہے اور جہاں تک ہمارا اپنا خیال ہے مضامین پر ہمارے تبصرہ اور تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ آپ کا مخصوص حق ہے جسے ہم تلف کرنا نہیں چاہتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نومشقوں کی تحریریں خام اور سطحی ہوتی ہیں لیکن مجلس مشاورت کی توجہ سے ان کی خامیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان کا ذوق' مسلسل مشق اور ہماری حوصلہ افزائی ان نومشقوں کو ایک دن پختہ کار بنا کر رہے گی۔ جہاں ہمارا مقصد ادبی معیار کو اونچا کرنا ہے وہاں طلبار و طالباۃ میں ادبی شوق و ذوق بڑھانا بھی ہے۔

ہمارے بھائیوں کو مجلہ کے معیار کے متعلق شکایت ہے۔ بیشک ہم تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ دور "دورِ صحافت" ہے۔ تحریر اشاعت علم کا نہ صرف ایک نہایت اہم ذریعہ ہے بلکہ پختہ تحریریں انسانی فضیلت میں چار چاند لگاتی ہیں۔ مگر ہم ان معترض برادران سے پوچھتے ہیں کہ خود انہوں نے اس "علمی فرض" کی طرف کبھی اپنی توجہ بھی برتی ہے ؟..... جواب نہایت مایوس کن ہوتا ہے ایک ایسے ادارۂ علمی میں جہاں ۱۴ سو طالب علم اور کئی سو طالباۃ مختلف علوم کی اعلیٰ تعلیم پاتے ہوں اس جامعہ کے "ترجمان علمی" کے لئے ہر ۳ مہینے میں بدقت تمام مضامین فراہم ہوتے ہیں اور وہ بھی وقت پر نہیں۔ یہ بات کس قدر تعجب خیز اور افسوس ناک ہے۔ الزام سے قبل مورد الزام کا سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن پھر بھی ہم مایوس نہیں ہیں کیونکہ اس سال چمن ادب میں بہت سی ایسی نوخیز کلیاں دکھائی دے رہی ہیں جن سے ذوقِ ادب کی بو آ رہی ہے۔

شہر جامعہ کے دو گوشوں میں اس سال دو اقامت خانوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہاں کے ارباب حل و عقد بہت اچھے پیمانہ پر ان کو چلا رہے ہیں لڑکے اس طرف بہت مائل نظر آ رہے ہیں۔ بعض ارباب جامعہ بھی اس شہر کے قلب و نظر کے ایک حصہ کو آباد کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اس کی سابقہ رونق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً طلبائے سال اوّل کے قیام کو لازمی کر دینے سے یہاں کی زندگی میں چہل پہل اور دلچسپیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس سال ہماری جامعہ کی تمام ٹیموں نے اپنے اپنے کھیلوں اور

اسپورٹس میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ہم سارے کپتانوں کو مبارکباد دیتے ہیں خاص کر معتمد صاحب کو بھی کہ انہیں کی کوششوں سے ٹینس ٹیم نے بھی ایک دفعہ بڑے اور شاندار کپس حاصل کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح قیادت ہی میں کامیابی کا راز ہے۔ فٹ بال میں مسٹر عبد الکریم، اتھلیٹک اسپورٹس اور ہاکی میں مسٹر ایوب۔ کرکٹ میں مسٹر اصغر اور مسٹر احمد حسین جیسے ہونہار کھلاڑیوں کا اضافہ محسوس کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہم سب لے خود ستائی اور خود نمائی سے بچتے رہیں تو جامعہ کی ٹیموں کو بہت زیادہ تقویت حاصل ہوگی۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس سال انجمن اتحاد کے انتخابات میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ جس کی وجہ سے اس کی دلچسپی صرف گھریلو کھیلوں کی حد تک رہ گئی ہے۔ البتہ ابھی ابھی قدیم و جدید طلبا میں ایک مباحثہ ترتیب دیا گیا تھا جو بہت دلچسپ رہا۔

ذیلی انجمنوں میں شعبۂ قانون کی انجمن نے تو شروع سال میں بہت زندہ دلی بتائی لیکن بعد میں بالکل مردہ بن گئی۔ ہاں۔ ایک دفعہ سر مارس گویر کو مدعو کیا تھا۔

بزم سائینس کا تو ہم صرف نام ہی سنتے آرہے ہیں مگر یہ کہاں منعقد ہوتی ہے اب تک کسی کو نہیں معلوم۔

بزم معاشیات اور بزم تاریخ دو ایک سال پیشتر بہت زور و شور سے کام کیا کرتی تھیں لیکن اب وہ بھی خاموش ہیں۔

بزم اردو فارسی عربی کے کمرہ میں تو صرف ایک میز پڑی ہوتی ہے معلوم نہیں کس کی ملک ہے۔

فلسفی حضرات تو شاید بزم کے قائل ہی نہیں۔ اب رہی بزم دینیات تو وہ اپنے جلسے الگ ہی کرتی ہے۔

ان بزموں کو تو خیر جانے دیجئے یہاں ایک بزم موسیقی و ڈرامہ بھی قایم ہے لیکن اس کا بھی کوئی پروگرام گانے یا معاشری جلسے سے متعلق ابتک نہیں ہوا۔ حالانکہ دستور کے غیر تحریری دفعہ کی رو سے نئی وزارت منتخب ہوتے ہی ایک معاشرتی جلسہ ضرور ترتیب دیتی ہے۔

آخر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ عالی جناب نائب معین امیر معز زار کان مجلس نگرانی اور ان شفیق اساتذہ کا دلی شکریہ ادا کروں جنھوں نے فرائض کی تکمیل میں میری گرانقدر امداد فرمائی۔

امید ہے کہ ان کی یہ بزرگانہ شفقت حسب معمول جاری رہے گی۔

جناب مولوی وحید الرحمٰن صاحب پروفیسر طبیعیات خازن اعزازی اور جناب کرشن دیال صاحب مہتمم مدیر بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنے اوقات مجلہ کے نذر کئے۔

اس شمارہ کی کاپیوں اور پروف کی تصحیح میں میرے دوست اور شریک کار جناب اکبر علی ناصری صاحب نے میرا بہت ہاتھ بٹایا۔ ان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کیا جاتا ہے۔

"مدیر"

شیخ محمد خلیل اللہ بی۔اے (عثمانیہ)
مدیر حصہ اردو

AZAM STEAM PRESS.

غزل

نواب معین الدولہ بہادر معین امیر پائیگاہ

جسے غم ہو فرقتِ یار سے، جسے عشق ہو رخِ یار سے
اُسے کیا خزاں سے ہے واسطہ، اُسے کیا غرض ہے بہار سے

کبھی ایسا رنگِ جنوں نہ تھا، کبھی ایسا سوزِ دروں نہ تھا
کہوں کیا میں ہائے بہار کو، یہ لگی ہے آگ بہار سے

یہ جو دل میں ایک سرور ہے، یہ جو دل کو ایک سکون ہے
ترے بھولے پن کے نثار میں، نہ چمن سے ہے نہ بہار سے

مِرا آشیانہ ہی جل گیا، مِرا دل ہی سب سے اُتر گیا
مجھے ضد ہے باغ کی سیر سے، مجھے چڑ ہے نام بہار سے

میں ہوں ایسے رنگ سے باغ میں، کہ کسی طرح کا بھی واسطہ
نہ تو گل سے ہے نہ تو خار سے، نہ خزاں سے ہے نہ بہار سے

ترے حسن پر ہیں نثار گل، ترے رُخ پہ غش ہیں ہزار گل
مِرے حق میں تو ہی بہار ہے، مجھے کام کیا ہے بہار سے

یونہی دن خزاں کے دکھائے گی؟ یونہی سر پہ آفتیں لائے گی؟
جو چمن میں آئے بہار پھر، تو میں اتنا پوچھوں بہار سے

نہ تو جیب جیب رہا مِرا، نہ تو پیرہن رہا پیرہن
جو بہار کا یہی رنگ ہے، تو خزاں ہی اچھی بہار سے

میں خیالِ پیرِ مغاں میں ہوں معینؔ ارنگ بے خودی کہوں کیا کہوں
نہ خزاں سے ہے مجھے آگہی، نہ میں آشنا ہوں بہار سے

خطبۂ صدارت انجمن اتحاد

" محمد عمر صاحب مہاجر بی اے (عثمانیہ) صدر انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کا

فی البدیہ خطبہ جو قابل صدر نے کرسی نشینی کے جلسہ میں سنایا تھا" "ادارہ"

آپ حضرات نے انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کی صدارت کا اعزاز بخشتے ہوئے مجھ سے اور میرے رفقاء سے جو توقعات وابستہ فرمائی ہیں ان کا میں دل سے احترام کرتا ہوں۔ اس موقعہ پر جب کہ ہمارے کام کی ابتدا ہو رہی ہو میرا یہ کہنا کہ میں اور میرے ساتھی یہ کریں گے اور وہ کریں گے زیادہ مناسب نہیں ہے۔ لیکن اس موقعہ پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ضمیر کی پوری پاکی اور صداقت پر کامل ایقان کے ساتھ وہی کریں گے جس کو ہم انجمن کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھیں۔

انجمن اتحاد کے اغراض و مقاصد میں اگر ایک طرف طلبہ کی تحریری، تقریری اور تنظیمی صلاحیتوں کی تربیت ہے تو دوسری طرف اس کے دائرۂ عمل میں طلبہ کی عزت نفس کی حفاظت ان کے ذہنی رجحانات کی نمایندگی اور ان کے جائز مطالبات کی ترجمانی بھی ہے۔ میں تقریر، تحریر اور تنظیم سے متعلق اپنے نظام نامہ کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

پہلے مجھے تحریری صلاحیتوں سے متعلق کچھ کہہ لینے دیجئے۔ گزشتہ وزارتوں نے تقریری صلاحیتوں کے اجاگر کرنے میں بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں عثمانیہ برادری ان کی ہمیشہ ممنون رہے گی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریر کے مقابلہ میں عثمانین کے تحریری کارناموں سے دوسروں کو روشناس کرانے میں کوشش کم کی گئی ہے۔ میں اور میرے رفقا سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کریں گے۔ ہم ایسے مضامین اور مقالے شائع کرانے کی کوشش کریں گے جو عثمانین کے تحریری جوہر کو نمایاں کر سکیں۔ میں اس موقع پر جناب معین امیر کی

توجہ ایک مرحوم ادارہ کی طرف منعطف کراؤں گا۔ میری مراد لٹریری اکاڈمی سے ہے جس کا رقمی اور علمی سرمایہ عرصہ دراز سے معطل پڑا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اکاڈمی کا الحاق جامعہ سے اور انجمن سے ہو جانا چاہیے اب سے چار سال قبل جناب نائب معین امیر جامعہ نے بھی ایک علمی ادارہ لٹریری سرکل کی بنا ڈالی تھی۔ جس میں متعدد اچھے مقالے پڑھے گئے تھے۔ لیکن اب یہ ادارہ کچھ خاموش سا ہو گیا ہے۔ انجمن اتحاد کی مرکزیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ یہ ادارہ انجمن اتحاد کی نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتا رہے تو بے جا نہ ہوگا۔

تقریر کے سلسلہ میں، میں نے اور میرے رفقا نے طے کیا ہے کہ صرف تقریری جلسے کرنے پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ فن خطابت کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہو۔ ہم انجمن کے کتب خانہ میں ایسی کتابیں فراہم کریں گے جو اس مطلب کے لئے مفید ہوں۔ میں حضرات اساتذہ سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس خصوص میں اپنے معلومات سے مستفید فرماتے رہیں گے۔ عثمانین تقریری صلاحیتوں کے اعتبار سے ہندوستانی جامعات کے طالب علموں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اس امتیاز کو برقرار رکھنا ہمارا فرض ہے۔ جہاں تک بیرونی اصحاب فکر کی تقریروں کا تعلق ہے ہم ہر مکتب خیال کے آدمی کو بلالحاظ اس کے کہ وہ کس جماعت یا ادارہ سے تعلق رکھتا ہے، بلا کر ایک متعلم کی حیثیت سے اس کے خیالات سنیں گے۔ یہ سمجھ لینا قبل از وقت ہوگا کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ لینا چاہتے ہیں ہماری حیثیت بہرحال متعلمانہ رہے گی۔

مجھے جناب معین امیر سے خاص طور پر عرض کرنا ہے کہ مجلہ عثمانیہ عثمانین کا آرگن ہے۔ اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ملک کے باخبر حلقے اور صاحب ذوق حضرات ہمیشہ منتظر رہتے ہیں کہ ملک کی نوجوان نسل کے اس ترجمان کو دیکھا کریں۔ پہلے محکمہ تعلیمات میں مجلہ عثمانیہ خریدا جاتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب اور مصالح کی بنا پر اس کی خریداری بند ہو گئی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ جناب معین امیر اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

انجمن اتحاد طلبہ کی انجمن ہے۔ اس کا بجٹ ان کا بجٹ ہے، وہی اس کے کاروبار اور انتظام کے ذمہ دار ہیں اگر ہم کوئی غلطی کریں تو اس پر احتساب کا حق صرف طلبا کو ہوگا۔ اگر ہم اچھا کام کریں تو انکی ستائش ہی

سب سے بڑا صلہ ہے۔ اس ادارے میں ان کا ہر عمل صرف ان کا ہی ہوگا۔ میں احترام کرتا ہوں ان مشوروں کا جو طلبہ برادری کے علاوہ ہم کو دوسری طرف سے ملتے ہیں۔ میں احترام کرتا ہوں ان بزرگوں کا جن کے مشوروں نے ہماری مدد کی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ مشورے صرف مشوروں کی حیثیت رہیں (تالیاں)

تقریری، تحریری اور تنظیمی صلاحیت کو بڑھانے کے علاوہ طلباء کی معاشرتی اور سماجی سنوار بھی اس انجمن کے فرائض میں داخل ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے میں آپ سے اشتراک کی درخواست کرتا ہوں۔ ہر جامعہ کا ایک معاشرتی ماحول ہوتا ہے۔ اس کا سمجھنا ان کے لئے دشوار ہے جو جامعہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس ماحول کی روایات اور اس کے وقار کو قائم رکھنے میں اپنی پوری صلاحیتیں مرکوز کردیں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر مقام پر ان روایات کا پورا پورا احترام کیا جائے۔ طلبہ کی جماعت کھیل کے میدانوں میں ہو، درسی جماعتوں میں ہو یا ریل کے ڈبوں میں اس کا ایک خاص وقار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ طرز عمل اس وقار کے شایان شان ہونا چاہئے۔ جہاں ہماری عزتِ نفس کا سوال ہو اور اس وقار کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو ہم مقابلہ کریں گے اور مجھے امید ہے کہ اس کوشش میں جامعہ کے ارباب اقتدار بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔

اس موقعہ پر میں بعض ناگوار امور اور قیود کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو رفتہ رفتہ جامعہ کی زندگی پر اثر انداز اور مسلط ہو رہے ہیں اس مجبور اور محروم برادری کو یاد کئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے جو صرف اپنی بے استطاعتی کی وجہ سے جامعہ میں نہیں شریک ہو سکتی۔ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا اصول یقیناً اچھا ہے لیکن زندہ رہنا ایک حق ہے اور دوسروں کو زندہ رہنے دینا ایک فرض ہے، فرض کی ادائی سے پہلے ہر ایک کو اس کا حق ملنا ضروری ہے۔ حق سے محروم کرکے فرض کی ادائی کی توقع نرالی منطق ہے زندہ رہنے کے حق کے معنی یہی ہیں کہ ہم زندگی کی پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ رہیں۔ ایسی مجبوریاں اور پابندیاں ملک کے نوجوانوں کو زندگی کے حق سے محروم کئے دیتی ہیں۔ میں ارباب حل و عقد سے درخواست کرتا ہوں کہ اس ادارے میں جہاں امیر و غریب کا کوئی سوال نہیں ہے اور جو ایک وسیع آغوش تربیت ہے جہاں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس سرچشمہ علم سے سیراب ہو اس قسم کی پابندیاں

کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ باہر سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ جامعہ کی عمارات اقامت خانوں کے انتظامات اور دوسری سہولتوں کے اچھے تاثرات لیکر جاتے ہیں اس کے لئے ارباب جامعہ مبارکباد و ستائش کے مستحق ضرور ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم وہ ذہنی تربیت ہے جو طلبہ کو ملتی ہے۔ اگر اس سے ملک کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو محروم کردیا جائے تو یہ انتظامات یہ شان و شکوہ اور یہ کروفر سب بیکار ہوجاتے ہیں (تالیاں)

عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات یاد آگئی۔ کلیہ فنون کی شاندار عمارت میں بہت سے کمرے مختلف طور پر مختص کردے گئے ہیں بعضوں کے لئے ایک سے زیادہ کمرے ہیں لیکن انجمن اتحاد کو جس کے ذمہ طلبہ کی ذہنی ترقی اور معاشرتی سنوار ہے "تہ خانوں" میں جگہ دی گئی ہے میں جناب معین امیر کو ان کا وعدہ یاد دلاتا ہوں جو انہوں نے اب سے پہلے ایک ایسے ہی مطالبہ کے جواب میں فرمایا تھا۔ مجھے توقع ہے کہ وہ توجہ فرمائیں گے (تالیاں)

میں انجمن اتحاد کے کتب خانہ کا ذکر کروں گا۔ جامعہ کے کتب خانے کی موجودگی میں ہر چند یہ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن ہر انجمن میں ایسا کتب خانہ ضرور ہوتا ہے جس میں زمانہ کی ہر جدید تحریک سے متعلق کتابیں موجود ہوں۔ میں نے علیگڈھ میں انجمن کا کتب خانہ دیکھا ہے وہ ہمارے مستقل کتب خانہ کے اتنا وسیع ہے۔ ہمارے انجمن کے بجٹ میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ وہ زیادہ کتابیں مہیا کرسکے۔ میں ان پروفیسر صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے انجمن کے کتب خانے کو تحفۃً کتابیں عطا فرمائیں۔

برادران! آج حیدرآباد کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں ہماری جو کچھ بھی سرگرمی ہوگی اس انجمن کے توسط سے ہوگی۔ طلبہ کو تقسیم کرنیکی کوشش کی اجازت کسی عنوان سے نہیں دی جاسکتی۔ یہ ایک وسیع آغوش تربیت ہے اس میں طبقوں اور فرقوں کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے بعض تحریکات سے ہم متاثر ہوجائیں۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے اس تاثر سے جامعہ کے عظیم تر مفاد کو نقصان پہونچائیں یہاں جو کردار ہم نے سیکھا ہے وہ بلند کردار ہے جو مسلک عثمانین کا رہا ہے وہ ایک مستقل مسلک ہے۔

اس ذہنی تربیت کے بعد جو ہم یہاں حاصل کرتے ہیں اور ان بے شمار صلاحیتوں کا ثبوت دینے کے بعد جو عثمانین کی زندگی کا طرۂ امتیاز رہی ہیں یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جامعہ چھوڑنے کے بعد ہم کو تنہا ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے ملک کے نظم و نسق میں عثمانین کو ان کے شایان شان مقام ملنا ضروری ہے۔ جامعہ کے ارباب متقدر سے جو حکومت کے نظم و نسق میں بھی بلند ترین مقامات پر فائز ہیں میں درخواست کرتا ہوں کہ عثمانین کے لئے جامعہ کے باہر خوشگوار ماحول اور سازگار فضا رپیدا کریں۔ جناب نائب امیر جامعہ نے کسی موقعہ پر فرمایا تھا کہ "حیدرآباد کو بلند ہونا ہے اور عثمانیہ کے ہاتھوں بلند ہونا ہے" برادران! ملک اور قوم کی تقدیریں بنانے والے آپ ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ حیدرآباد کے افق پر آپ کی قیادت اور سربلندگی کا مژدہ جلی حروف سے لکھا ہوا ہے (تالیاں) اور یہ قیادت ہم کو اس سایہ میں نصیب ہو گی جس کی صاحب جلالت ذات کی خدمت اور اس کے خاندان کے تحفظ اور بقا کے لئے سینہ سپر ہو جانا ہمارا نصب العین ہے۔ (تالیاں) (تالیاں)

میں اعلیحضرت جلالت الملک اور ان کے خاندان کے لئے دعا کا مقدس فریضہ ادا کرتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

محمد عمر مہاجر بی اے (عثمانیہ)

شاعری میری نظر میں

ادب کی سلسبیل

محبی ڈاکٹر زور نے مجھ سے فرمایش کی تھی کہ میں جدید ادب سے متعلق کچھ لکھوں۔ میں نے سوچا کہ ادب کی وسیع اور مسلسل دنیا میں، لفظ جدید اور قدیم کا اصولی تصور پیدا کرنا مشکل ہے، کیونکہ ادب، شعور انسانی کی ایک لہر ہے جو ابتدا سے آج تک جاری ہے اور رہے گی۔ یہاں گارفیلڈ کا ایک قول یاد آیا وہ کہتا ہے —

"جو شخص ادب کی حقیقی روح سمجھ سکتا ہے اسے چاہئے کہ وہ کسی خاص دور کے ادیبوں کو نہ چنے بلکہ ادب کے سرچشمے تک پہنچے اور اس ہلکی سی لہر کا نشان لگائے جو زمانے کے بہتے ہوے دھارے میں ظاہر ہوتی اور خیال کے سمندر میں تبدریج وسیع اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ جدید زمانے کے لوگ اسی قسم کی لہروں کی تلاش میں ہیں"

جب ادب اپنی فطرت میں انسانی جذبات اور شعور کی ایک سلسبیل ہے، تو پھر اس فیض جاریہ میں قدیم اور جدید کی حدبندیاں کیسی؟ تاہم میں جدید ادب کے کسی نہ کسی مفہوم کا منکر نہیں۔ میرے نزدیک جدید ادب سے مراد، بہتے ہوئے دھارے کا وہ حصہ ہے جو وقت کے دُور اور دھندلے میدان سے ہمارے قریب آکر پھیلتا اور زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میرا خیال یہ بھی ہوا کہ اگر میں جدید دور کا ہوں، اور میں نے اپنی تنہائیوں میں شاعری کے چند جدید تصورات کو اپنے اندر بسانے کی سعی کی ہے، تو میرے احساسات یقیناً جدید ہی ہوں گے۔

تھوڑے ہی دن ہوئے، میں نے انگریزی زبان میں دو خود نوشتہ سوانحمریاں پڑھیں۔

اور میرا خیال ہے کہ تازہ لکھے ہوئے مغربی سوانح میں ان دو کا درجہ اس حیثیت سے بہت خاص ہے کہ یہ بڑی آزاد خیالی اور اُپج کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور مصنف ایچ جی ویلز، اور دوسری مشہور خاتون "ایسازورا ڈنکن" کی تصنیف ہے۔ ان دو حُسن کاروں کی ان باکمال آپ بیتیوں کے پڑھنے سے میرے دل پر جو اثر ہوا وہ عجیب ہے۔ وہ یہ ہے کہ وسیع اثرات اور کش مکش کی اس دنیا میں انسانی شعور کچھ نادر غیر اختیاری فضا میں پرورش پاتا ہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے ہیں، اور انسان، علم ماحول اور تجربے کی شورش میں گُھستا ہے، اتنی ہی اسے اپنی فطرت سے بیگانگی سی ہوتی جاتی ہے۔ ویلز کو سَتّر سال میں صحیح طور پر یہ محسوس ہوا کہ جب وہ اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھ رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو خود سے بیگانہ اور غیر دیکھ رہا ہے۔ اسکی فطرت اور عقل یہ کہتی ہے کہ اگر زمانہ سازگار ملتا تو اس کا ذہن کچھ اور ہی سانچوں میں ڈھلتا۔ وہ حیرت سے دیکھتا ہے کہ جس کی وہ سوانح لکھ رہا ہے وہ دنیا کا ویلز ہے، خود نہیں۔ اسی طرح ڈنکن اپنی فطرت کو دنیا کی نام نہاد تہذیب پر فتح پاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتی، اور پھر تذبذب میں پڑ جاتی کہ آخر حیات انسانی کی یہ دوعملی ہے کیا چیز؟ زمانے کی دھوپ چھاؤں میں ان لوگوں کی طرح پلنے بڑھنے سے ہر انسان یہ سوال کر سکتا ہے — کیا میں، میں ہوں؟

صدائے بازگشت | یہی حال شاعری کا ہے۔ انسان جب شاعری کے متعلق اپنی زبان کھولتا ہے، تو وہ اس منزل پر رہتا ہے، جہاں زمانے کے ذوق اور اثرات نے اسے لا کھڑا کیا ہے۔ وہ اسی چٹان سے آواز دیتا ہے، اور اطراف کے پہاڑوں سے اسی کی صدائے بازگشت آتی ہے وہ سوچتا ہے کہ شاعری کے متعلق جو کچھ اس نے سوچا سمجھا آیا وہ خود اس کی غور و فکر کا نتیجہ ہے، یا عمر اور زمانے کی ملمع سازیوں کا؟ اسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ آیا اس نے شاعری پر کچھ کہا ہے یا اُس جُز پر جس کا اسے تجربہ ہوا ہے؟ اس طرح شاعری عمل، یا عمل کا احساس بن کر سامنے آتی ہے۔

آرٹ زندگی کی طرح وسیع ہے، اور آرٹ کی محرکات اتنی ہی لچکدار اور وسیع ہو سکتی ہیں جتنی زندگی کی۔ لیکن یہ ایک ناگزیر بدقسمتی ہے کہ آرٹ اور زندگی پر علم، زمانہ اور تجربے کی ملمع سازیاں ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ اب جس وقت ہم شاعری کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہمارے دل کی آواز میں بہت کچھ زندگی کی رنگینیاں بھی

شامل ہوتی ہیں۔ یہ ساز اپنی آوازوں کے ساتھ ساتھ، عمر رواں کی بہت سی آہٹیں بھی رکھتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو آئیے، سنئے تو یہی کہ اس ٹوٹے ہوئے ساز کی صدا کیا ہے؟ ایک وقت شاعر نے آواز دی تھی —

بینیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل غالب اگر دم سخن، رہ بہ ضمیر من بری

شاعری اور مشرب | جہاں تک میرے تصورات کا تعلق ہے، میں شاعری کو سب سے پہلے ایک مشرب سمجھتا ہوں۔ وہ مشرب جو شاعر کی ذہنی، حسی، بلکہ ایک حد تک عملی زندگی کو گھیر لے۔ سورج کی روشنی ستاروں کی چشمک، پھول کا رنگ و بو، دریا کی ریت، ہر ذرے کی چمک سے لیکر انسان کی مادی غذا تک اس کے اعتقادات، توہمات، ایمان، تصور سے لیکر اس کے سامنے رکھی ہوئی رکابی تک، ہر چیز شاعر کے لئے ایک وبال جان ہے۔ وہ کائنات کی ہر ظاہر اور چھپی ہوئی چیز سے ایک اثر لیتا ہے، وہ جو موجودات سے غیر موجود اور غیر موجود سے موجود کی تخلیق کرتا ہے۔ اس ٹیڑھی چال اور انوکھی طبیعت کی وجہ سے اس کی ہر سانس میں ایک زندگی نظر آتی ہے۔ جس طرح بچہ، غیر شعوری دور سے شعور کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، اُسی طرح شروع شروع میں شاعر کے دل پر زندگی کے اثرات پڑتے ہیں، اور وہ مچلنے لگتا ہے۔ یہ اس کے شعور کا دور اولیں ہے۔ جب جذبات کا تلاطم بڑھتا ہے، تو اس کا دل ہچکولے کھانے لگتا ہے، اسے درد اور غم کی تکلیفیں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ یہ دوسرا دور ہے جسے دور احساس کہہ سکتے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے جب اس کے جذبات کی دنیا بے قابو ہو جاتی ہے اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، تو پہلے پہل اس کا خیال فریاد کرنے لگتا ہے، اور پھر یہ فریاد خیال سے نکل کر لبوں تک آتی، زبان سے ادا ہوتی اور شعر کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ تیسرا دور ہے جسے ہم دور تکمیل و ترتیب کہہ سکتے ہیں۔ چوتھا دور وہ ہوتا ہے جب اس کا درد، احساس، ضبط و اضطراب، باقاعدہ طور پر ایک مدرسہ، ایک خبط، ایک مسلک بن جاتا ہے، اور اس کی زندگی ہر وقت اس کے احساسات کے جھولے میں جھولنے لگتی ہے۔ یہ اس کا مشرب ہے۔ اس آخری دور پر آکر شاعر کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو شاعر کے نام سے موسوم کرے اگر شاعری کے پیچیدہ نظام اور لچکدار عمل میں یہ ترتیب قائم نہ رہ سکے تب بھی شاعری کا ایک مشرب کی حیثیت اختیار کر لینا غیر یقینی ہے۔

ایقان اور اثر | شاعرانہ مشرب کی روح رواں کیا ہے؟ اس کی روح رواں دو چیزیں ہیں، ایک ایقان دوسرے اثر۔ ایک حُسن کار ساری دنیا سے الگ اپنا ایک ایقان رکھتا ہے، جسے آپ اس کے مذہب، مشرب، اس کی دنیا، نقطہ نظر، کسی لفظ سے بھی

تعبیر کرسکتے ہیں۔ وہ معدوم اور موجود، ہر چیز کے متعلق اپنی ایک دلسوز اور جانگداز رائے رکھتا ہے۔ یہ رائے کسی خاص قانون، مذہب، تمدن، عمل، تہذیب یا علم کے تابع نہیں ہوتی، بلکہ اپنی واردات کے تحت، اور ساری زندگی کا نچوڑ ہوتی ہے۔ جب یہ پختہ ہوجاتی ہے تو دنیا کی کوئی قوت اسے اپنے مقام سے ہٹا نہیں سکتی۔ اس طرح اثر کی حد تک، شاعر سرتاسر جذبات کا پتلا ہوتا ہے۔ وہ بلاتعین دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا اثر لیتا اور اس اثر کو دوسروں تک منتقل کرسکتا ہے۔ اس لازمی اور متعدی عمل میں اس کی نوعیت ایک جادوگر کی سی ہوتی ہے! اسے سحر انگیز طریقے سے اثر لینا بھی آتا ہے اور متاثر کرنا بھی آتا ہے۔ اس احساس اور رقت کی وجہ سے وہ ایک بچے کی طرح نازک مزاج ہوجاتا اور ایک عورت کی طرح پاک اور حساس طبیعت بنالیتا ہے، وہ تدبر، بیداری، منافقت، اور شعور کی دنیا میں بہت ٹھوکریں کھاتا اور اکثر دفعے ناکام ہوتا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من / عشق است امام من عقل است غلام من
جاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود / مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامے من
اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند / مرگ است دوامے تو عشق است دوامے من
پیدا بہ خیرم او پنہاں بہ خیرم او / ایں است مقامے او دریاب مقامے من

اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ سارے انسانوں سے ممتاز کرنے والی صفتیں شاعر میں دو ہوتی ہیں، ایک ایقان کی آزادی اور استحکام، اور دوسرے اثر کا جذب و انتقال۔ جب تک یہ دونوں باتیں کسی شخص میں موجود نہ ہوں، وہ میرے نزدیک حسن کار یا شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

کائنات کے قوانین

چونکہ شاعر کے ایقان اور اثر کا عالم اتنا نازک ہوتا ہے، اس لئے کائنات کے وہ قوانین وہ ممتاز قوتیں جن کا کام ایقان اور اثر کو اکسانا ہوتا ہے، اس کے مزاج کو مسخر کرلیتی ہیں۔ ان قوانین اور طاقتوں میں قابل ذکر روحانیت، جذبۂ محبت، حُسن، وجدان، مستانگی، جوش، رومان وغیرہ ہیں جن کا شاعر ہمیشہ شکار ہوتا ہے۔ اسے ذی روح، غیر ذی روح، مادی، غیر مادی، موجود، غیر موجود، ہر چیز سے بے انتہا اُنس ہوجاتا ہے۔ وہ ایک خیال کو بھی اتنا ہی عزیز رکھتا ہے، جتنا ایک انسان کو۔ کبھی اسے گھاس کی ایک پتی کا مرجھانا، زلزلے کی تباکاریوں سے زیادہ رقت انگیز معلوم ہوتا ہے، کبھی اسے ساری کائنات کی تباہی، اپنی تعمیر کی پہلی منزل نظر آتی ہے۔ جب شاعر کی نگاہ، دل، اور خیال باقاعدہ طور پر، قضا و قدر کی ان کارفرمائیوں کی زد میں آجاتے ہیں تو شاعر کے مشرب کا جھولا اپنی پینگ بڑھاتا ہے۔ جب وہ اس طرف آتا ہے تو اُسے ازل، اور اُس طرف جاتا ہے تو ابد کی ہوا لگتی ہے۔ جھولے کی اسی پینگ پر شاعر کی عظمت اور بلندی کا انحصار ہوتا ہے۔

گذشتہ زمانے میں اُردو شاعری کی افتاد ہی ایسی پڑی کہ شاعروں کے لئے ان کا مشرب پہلے ہی سے محدود اور متعین ہوگیا، اور انہیں غزل گوئی اور معاملہ بندی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ لیکن اُردو شاعری کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہ سے لیکر اقبال تک ہر بڑے شاعر نے اس "دیوار زندان" کو توڑنے کی کوشش کی۔ جتنی اُن کی کوشش کامیاب ہوئی، اتنی ہی ان کی بڑائی نظر آئی۔ ان دنوں یہ دیوار بہت کچھ ڈھادی گئی ہے، اور شاعر کا مشرب کائنات اور زندگی کی طرح وسیع ہوتا جارہا ہے۔

ہماری شاعری کا مقام

اب سوال یہ ہے، کیا مشرب کی وسعت نے ہماری موجودہ شاعری کو کسی مقام پر پہنچایا ہے؟ جواب یہ ہے کہ پہنچایا ہے۔ نظم کے شیشوں میں ہماری اندرونی دنیا کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ اگرچہ پورے طور پر نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہمارے دل کے اندر ہمیشہ ایک بہت بڑا "مینا بازار" لگا ہوا ہوتا ہے۔ اور خیالات کی دکانیں سلیقے سے سجی ہوئی رہتی ہیں۔ ان دکانوں میں ایسا سامان ملتا ہے جو دوسروں کی پسند کا ہو، اور جس کے بنانے میں دوسروں کی نقل اتاری گئی ہو۔ جب شاعر گاہک بن کر دل سے دوسری مصنوعی اشیاء مانگتا ہے تو وہ فوراً اسے مل جاتی ہیں۔ لیکن اس "مینا بازار" کے پیچھے اس شاعر کے نام کا ایک اور کارخانہ موجود رہتا ہے جہاں صرف وہی چیزیں بنتی ہیں جو اس کی "سات سالہ اسکیم" کی شایان شان ہوتی ہیں، اور اس کے قلب و دماغ کی پیداوار ہوتی ہیں۔ مگر یہ کارخانہ اکثر سامنے والی دکانوں کی گھما گھمی کے پیچھے خاموش پڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھار مشن کے چلنے کی نوبت آتی ہے۔ ایسی صورت میں شاعر کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ "گھریلو صنعت" کو فروغ دے، اپنے کارخانے کو چالو رکھے، اور وہی چیزیں مانگے اور دے جو وہاں کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرز عمل کو مشرب اور ایقان کی انفرادیت کہتے ہیں۔ اس کا حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہیں۔ زندگی کی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ حیات اور کشمکش زیست کے بہت سے مسائل سے ہم اتفاق یا اختلاف رکھتے ہیں۔ اپنے تجربوں سے ہم بہت سی اٹل باتیں دریافت کرلیتے اور قطعی فیصلوں پر پہنچتے ہیں، اگر ہم ان پر ایقان کامل رکھ کے، خود شناسی کے ساتھ انہیں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی عادت ڈال لیں تو چند دنوں میں ہم اپنے دل اور ایقان کی سچی تصویریں اُتارنے کے قابل ہوسکیں گے۔ مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ اکثر و بیشتر اپنے ذاتی خیالات، رجحانات اور احساس سے درگذر کرکے مانگے تانگے

تاثرات اور اغیار کے خیالات پیش کرنیکی کوشش کرتے ہیں، یا دوسروں کی خاطر اپنے رنگ کی قربانی کرتے ہیں تاکہ انھیں مقبولیت عام حاصل ہو اور مخالفت کم کی جائے۔ اس صورت حال پر غور کرتے ہوئے بعض وقت مشاعرے کے اسٹیٹیوشن سے اختلاف کرنے کو جی چاہتا ہے، کیونکہ یہاں عموماً "مشاعرے کے رنگ" کی شاعری پسند کی جاتی ہے اور اس طرح شاعر کا ذوق متاثر ہوتا ہے۔ جو شاعری مقبولیت عام یا خوف مخالفت کی بنیاد پر قایم کی جاتی ہے وہ کبھی حقیقی نہیں ہوتی۔ جین کاکٹین نے خوب کہا ہے "There is no suoh thing as poetry and Literature for the masses." اس کے مقابل، ٹالسٹائے نے اپنے مشہور "نظریہ حسن کاری" میں، اس امر پر ایک انقلابی حیثیت سے زور دیا ہے کہ ادب اور شاعری کو عام فہم ہونا چاہئے اور انسانیت کے کم سواد اور کثیر حصے کو فائدہ بخشنا چاہئے۔ یہاں قبولِ عام اور عام فہم ہونے میں فرق ہے۔ شاعر اپنے اصلی مقام، اور خیالات کی حقیقی بلندی پر رہ کے، محض اپنے کمال شرح و بیان اور سادگی اظہار سے ان خیالات کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے برعکس مقبول عام شاعری میں شاعر اپنے احساسات کی دنیا میں عوام کے تاثرات کا تابع ہو کر اپنی بلندی کھو بیٹھتا ہے۔ چارلس کیمب نے اسی لئے کہا —

"Dawn the age, I write for antiquity" !

دل کی بپتن دل کی بپتن، دنیا کی مغتنمات میں شمار ہوتی ہے۔ ہم عام طور پر کہتے ہیں، جو دل پر گذرتی ہے وہ اللہ ہی جانتا ہے، لیکن جس چیز کو اللہ ہی جانتا ہے اسے اگر شعر کے لباس میں دنیا کو عطا کریں تو غور کیجئے ہم دنیا کو کیا چیز عطا کرتے ہیں؟ آسکر وائلڈ نعرہ لگاتا ہے —

I made a compact with myself, that in my person, literature should stand by itself, of itself and for itself.

اگر ڈسرائیلی کی طرح جس نے یہ کہا تھا "جب میں کوئی کتاب پڑھنا چاہتا ہوں، تو ایک کتاب لکھتا ہوں۔ ربیکا دسٹ کے اس اصول کے تحت —

"Literature and espcially Poetry must be an analysis of experience and synthesis of the findings into a unity

اگر شاعر اپنی انفرادیت کو سنبھالے ہوئے، اور اس جذبے کے ساتھ کہ دنیا کو اس کے خیالات کی ضرورت ہے،

وہ ایک ہم آہنگی اور وحدت خیال کے انداز میں اپنی دنیا کے مختلف تجربات پیش کرنے کی کوشش کرے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ دل کی بپتن میں کیا آگ اور جلن ہوتی ہے، اور اس میں کیا آتشین پیغام نظر آتا ہے ؟

ادب ایک "حادثہ" ایک "اتفاق" ہوتا ہے جب شاعر کے دل کی کشتی، طویل اندیشوں اور خاموش فکر کے طوفان سے گذرتی ہے، تو یکایک اسے ایک روشنی نظر آتی ہے، جس کا جلوہ شعر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس طرح ادب اور شاعری کے شاہکار اور انمول خیالات محض ایک "حادثہ" یا "اتفاق" بنکر سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے۔

"Literature that is of lasting Value is an a accident."

میں ادب اور شعر میں خواہ وہ ایک کتاب کی صورت میں ہو یا ایک سطر کی صورت میں، ہمیشہ اسی حادثے کی تلاش میں رہتا ہوں۔ اس کو تجلی، الہام، القا، کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، جو شاعر اپنی نغمہ سرائیوں میں یہ رنگ کھائے کہ اس میں اندر سے ایک روشنی، ایک درد، ایک سوز، ایک اظہار کی بے چینی نظر آ رہی ہے تو میں بہت بڑی حد تک اپنے آپ کو مطمئن سمجھوں گا۔

تخیل کی حیثیت اس منزل پر یہ دیکھنا ہے کہ غریب تخیل کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں تخیل محض شاعری کی روحِ رواں نہیں، بلکہ شاعری کے اس "اتفاقی جز" کو جو "حادثہ" بنکر پیش ہوتا ہے روشن ضرور کرتا ہے۔ پست احساسات اور گھٹیا درجہ کے جذبات تخیل کے ہاتھوں بلند ہو جاتے ہیں۔

شاعری کی الہیت شاعری کی تیسری اہم صفت میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں بعض الٰہی صفات کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جس طرح خالق کائنات کے ہر عمل میں بعض صفتیں ممتاز نظر آتی ہیں۔ اسی طرح شاعری کے اعمال میں ان ہی صفات کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا ("Art is the shndow of shadows") اور ارسطو نے کہا ("All Art is the 'Imitation' of Nature") تو ان کے دماغوں میں بھی شاعری کی الٰہیت موجود تھی۔ گوئٹے نے فاوسٹ میں ایک جگہ شاعری اور الٰہیت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ ایک وقت فاوسٹ کی محبوبہ مارگریٹ اس سے سوال کرتی ہے کہ وہ نماز وغیرہ نہیں پڑھتا۔ کلیسا نہیں جاتا۔ کیا خدا پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ فاوسٹ جواب دیتا ہے۔

کذب کے گوش سے باتوں کو نہ سننا میری
ہوش کی بزم میں رسوا ہے تمنا میری

ماورائے لبِ اقرار زبانی ہے خدا
ماسوائے دمِ اعجاز بیانی ہے خدا

نام لے اس کا زمانے میں ہو طاقت کس کی
اتنی بے باک ہے دنیا میں عبادؔ کس کی

فکر و احساس، غم و شوق کی دنیا دیکھو
ہر نفس صاعقۂ حسن کا جلوہ دیکھو

کونسی شئے ہے جہاں جلوۂ عرفاں نہیں
کون کہتا ہے "خدا پر مرا ایمان نہیں"

سر پہ کیا نور نہیں عرش کی دیواروں کا
خاک پہ فرش زمرد نہیں گلزاروں کا

ہمنوائی مرے نغموں کی نہیں تاروں میں
دلربائی نہیں کیا چرخ کے سیاروں میں

کیا مری آنکھ میں جلوے ترے آباد نہیں
کیا مجھے حسن کے خالق کی ادا یاد نہیں

کیا نہیں صاعقۂ عشق سراپا میں ترے
کیا نہیں نور ازل حسن کے دریا میں ترے

برق ایمان تری زلف گرہ گیر نہیں
تجھ میں کیا خالق کونین کی تصویر نہیں

پہلے اس قوتِ جاوید کو اپنا کر لے
دل میں اس جلوۂ عرفاں کو پیدا کر لے

اور جب جوش محبت تجھے گرما جائے
رکھ لے جو نام خدا کا تجھے یاد آجائے

(ترجمہ فاوسٹ منظوم۔ از باقی)

دیکھئے حسن و عشق کے مضمون میں کس خوبصورتی سے الھیت کا نغمہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ پر عظمت شاعری کبھی اس نغمے کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

اعلیٰ شاعری کی ان صفات میں تین یا چار خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ سب سے پہلی خصوصیت شاعری میں قوت تخلیق کی موجودگی ہے۔ اس کے بعد فکر و اندیشہ، تجلی، سمع و بصر وغیرہ کا درجہ ہے۔ لیفؔکاڈیو ہارن نے ہر مصنف کو یہ عمدہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مصنف بننے سے پہلے اپنے آپ سے یہ سوالات کرے۔

(۱) کیا مجھ میں قوت تخلیق ہے (۲) کیا میرے پاس وقت اور فرصت ہے (۳) کیا میں سچا انہماک اور تنہائی کی خاموش دولتیں رکھتا ہوں۔

تخلیق سے وہ ایسا عمل مراد لیتا ہے جو اپنے ذہنی قوت تجربے اور باطنی قوت سے پیدا ہو، اور جس پر شعوری اور غیر شعوری دونوں حیثیتوں سے دوسروں کی آرا کا بہت کم اثر پڑا ہو۔

تخلیق | میں نے جہاں تک غور کیا ہے، مجھے یہ محسوس ہوا کہ مشرب کی طرح شاعر کا طرۂ امتیاز اس کی صفت تخلیق ہونی چاہئے۔ اس کے ذریعے وہ احساس، درد، سوز، تپش، الہام، وجدان، شعور وغیرہ کے مال مصالح سے تخیل کے ہاتھوں کوئی نہ کوئی بات پیدا کرتا اور انہیں خوبصورت الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ شاعری کا فطری ذوق اس وقت تک اپنا رنگ نہیں دکھا سکتا جب تک اللہ میاں کی طرح شاعر بھی اپنی دنیا آپ نہ پیدا کرے۔ شاعر کے پاس تحقیق، تجسس، انکشاف، تعلیم کا درجہ بعد ہے اور تخلیق کا پہلے۔ وہ اپنے تخیل اور جذبے کی آمیزش سے بہت سی باتیں عالم وجود میں لاتا ہے، جن کے متعلق بعد میں تحقیق و تجسس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شیکسپیر نے اپنی خوبصورت ترین تعریف میں کہا ہے کہ شاعر "'avriy nothing" کو "A local habitation and a name" عطا کرتا ہے۔ میں نے اس صنعت کا ذکر صرف ذکر کی خاطر نہیں کیا، بلکہ اس لئے کیا کہ شاعر اپنے اشعار پر خواہ دنیا میں انھیں کتنا ہی سراہا گیا ہو، ٹھنڈے دل سے غور کرے اور دیکھے کہ اُن میں کس حد تک قوت تخلیق کار فرما ہے؟ میرے نزدیک اس قوت کا پارہ جتنا اونچا ہوگا اتنی ہی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہو سکیگا۔

سنجیدگی اور تنہائی | قوت تخلیق کو مدد دینے والی یا اُس میں اضافہ کرنے والی دو اور صفتیں ہوتی ہیں۔ ایک سنجیدگی اور شوق جسے "Sincerity in Literature" سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے "تنہائی" میں چاہتا ہوں چلتے چلتے ان پر بھی کچھ عرض کر دوں۔

ادب میں سنجیدگی اور انہماک کا تعین اگر صحیح طور پر کوئی سمجھ سکتا ہے تو وہ خود شاعر ہے۔ یہ شاعر ہی کا فریضہ ہے کہ وہ شعر کہتے وقت اپنے ضمیر کا جائزہ لے اور یہ دیکھ لے کہ اس میں کہیں کھوٹ تو نہیں ہے؟ کہیں "ادب کی خاطر ادب" شعر کی خاطر شعر، کے علاوہ، کوئی اور "غرض" تو کام نہیں کر رہی ہے؟ یاد رہے کہ شعر کے ذریعے دوسروں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینا بہت بڑا ادبی گناہ بلکہ کفر ہے۔ اس سے ادب ایک قسم کی منافقت کا محرک ہوتا ہے، اور حقیقت پر دروغ کے پردے پڑنے لگتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں شعر، ایمان، مذہب، اخلاق، تہذیب اور کردار سے ٹکراتا ہے۔ دنیا میں صحیح ادبی خدمت یہی ہے کہ شعر میں پوری ایمانداری برتی جائے۔

تنہائی تنہائی سے ہارن کی مراد راہب بننا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاعر کو اپنے ماحول میں ایک ولی۔ ایک صوفی ایک پادری کی طرح بے لوث، پاک، خاموش اور یکسوئی کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔ یہ انفرادیت کی ایک قسم ہے۔ ایسی ذہنی تنہائی جس کا صحت بخش اثر شاعر کے عمیق تفکر پر پڑے ضروری ہے۔ اسے اپنے دل و دماغ کو دنیا کے ہیجان سے آشنا تو رکھنا چاہئے، لیکن خاموشی کے ساتھ شعر کی مقدس خدمت انجام دینے میں اُسے کسی چیز کو مزاحم نہ ہونے دینا چاہئے۔ عین شورش، عین انہماک میں بھی ایک قسم کی تنہائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ شاعر پر کئی لمحات ایسے گذرتے ہیں جبکہ وہ بہ ظاہر خاموش کمرے میں کائنات کی شورشیں سن سکتا ہے، اور کبھی وہ وقت بھی آتا ہے جبکہ عین شور و غوغا میں اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

سن تو سہی یہ کیا ہے، اے غل مچانے والے
اک شور ہو رہا ہے ایوانِ خامشی میں

فرصت ادب میں فرصت اور وقت سے مراد صرف گھڑیال کے کانٹوں کا پھرنا نہیں بلکہ وہ احتیاط آمیز تاخیر، اور وہ اطمینان بخش مواقع ہیں جن کی آغوش میں ادب عالم وجود میں آتا ہے۔ شاعری زندگی کے سمجھنے اور سمجھانے سے تعلق رکھتی ہے، ازل اور ابد کے میدان میں وہ شعور کے ساتھ دوڑتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کے گھر سے زیادہ اس کے دل میں سکون اور اطمینان سے کام کرنے کا عزم، تاخیر اور احتیاط کے ارادے موجود ہوں۔ شعر عجلت نہیں چاہتا فرصت چاہتا ہے۔

تجلی تجلی ایک الٰہی صفت ہے۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک خود جلوہ بننا، دوسری جلوہ بنکر دوسروں کے سامنے چمکنا۔ غالب اس جذبے کی آگ میں جلتے ہوئے کہتا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

میں جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے شاعر کو یہ صفت بڑی فیاضی سے عطا فرمائی ہے۔ اس کا ہر خیال ہر احساس ایک "تجلی" ہے۔ اگر وہ شعر بن کر چمک جائے تو کئی موسیٰ اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ اندر ہی اندر رہے تو آسمان میں "Nelnla" کی طرح خیالات کے کئی نظامِ شمسی بننے اور وقت پر ظاہر ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ ہر شاعر اپنے اندر اپنے قلب کی زمین کریدتا ہے، اور اس میں سے تجلی اُبلتی ہے۔ اگر ہمارے نام نہاد شاعری میں آفتاب کے قرص کی طرح "توانائی کے غار" موجود نہیں ہیں، تو اسے اپنے آپ کو چاند کی مانند ایک عدم آباد

یا کسی بجھے ہوئے ستارے کی طرح سمجھنا چاہئے۔

سمع و بصر فکر و اندیشہ یہی حال سمع و بصر، فکر و اندیشہ کا ہے۔ ممکن ہے فلسفی، نفسیات پرست، سائنس داں وغیرہ میں شاعر سے زیادہ فکر و اندیشہ کی قوت موجود ہو، ممکن ہے اس کے حواس، الٰہی قوت کے ساتھ نازک ترین سماعت اور بصارت رکھتے ہوں، لیکن جب ان کا اظہار نظم کے علاوہ کسی اور رنگ میں ہوتا ہے تو شاعر کا دل بجھ جاتا ہے۔ کیونکہ بہ قول گوئٹے ہر نازک خیال کے لئے ویسے ہی نازک قالب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب سائنسدان خالی شیشے میں فتیلہ ڈال کر یہ ثابت کرتا ہے کہ آکسیجن گیس کی بدولت یہ فتیلہ روشن ہو جاتا ہے، تو شاعر کے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، آہ، وہ الٰہی قوت جو آکسیجن کو آکسیجن اور فتیلے کو شعلہ بناتی ہے، کیا صرف شعبدہ گری کے کام آتی ہے؟ اسی طرح جب فلسفی، اپنی عقل، اور تھوڑی سی اندرونی روشنی کی بدولت اسرار کائنات کے کسی مدہوش کرنے والے گوشے میں پہنچ جاتا، اور اپنے عرفان کو نثر کے قالب میں اس طرح سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ استدلال، معقولیت اور منطق کے کام آئے تو شاعر پر ایک مردنی چھا جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے، آہ، ایک فلسفی ہے کہ حسن، عشق، موت اور حیات کو سمجھتا ہے، کبھی حسن کو آزاد کہتا ہے۔ کبھی مقید، کبھی عشق کو ایک جنون سے تعبیر کرتا ہے، اور ایک میں ہوں کہ عشق ہی کے متعلق چلاتا ہوں۔

عشق ما اندر جہاں ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں شہر خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

جب کبھی فلسفی کو اپنے شرح و بیان میں ایسی شاعرانہ قوت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اسے اپنے رستے سے لگا لیتا ہے۔ ہیگل نے ایک جگہ کہا کہ "خدا کبھی مندر کے اندر موجود نہیں رہتا، بلکہ ہمیشہ باہر رہتا ہے" تو شاعر کو اس میں شعر کی ایک مسحور کن جھلک نظر آتی ہے!

دل شاعر کا فکر و اندیشہ، سمع و بصر، عقل اور حواس ظاہر سے زیادہ، دل کے ہاتھوں زندہ رہتے اور اپنا عمل کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جس شاعر میں دل کی فکر، دل کی سماعت، دل کا اندیشہ اور دل کی بصارت نہ ہو، اسے اپنے لئے کوئی اور نام تلاش کرنا مناسب ہوگا۔ اگر شاعر کو خوش قسمتی سے یہ دولت سرمدی نصیب ہوگئی تو وہ کہہ سکتا ہے ـــ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خاموش تعلیم الٰہی صفات کے سلسلے میں ایک امر یہ بھی ہے کہ شاعر، فطرت کی طرح، ایک خاموش "تعلیم" کا محرک ہوتا ہے۔ اعلیٰ شاعری میں بڑی خوبی اس کی "ایمائیت" ہے ـــ کسی اچھے شعر کا مطلب، کسی اچھی نظم کا پیام، صرف اتنا ہی نہیں ہوتا جو شاعر بیان کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ اور اس سے مختلف ہوتا ہے۔ کبھی شاعر کے خیال سے کسی اور خیال کی

رہنمائی ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی خاموش تعلیم ہے جیسے فطرت کی کھلی ہوئی نشانیوں مثلاً پھول، برق، سورج، شعاع، قوت کشش وغیرہ سے کسی مفکر کو حاصل ہوتی ہے۔ شعر میں بھی ایک ایسا جادو ہے کہ وہ ہر پڑھنے والے کو اس قوت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے جتنا اُس شخص کا ظرف اور ذوق ہوتا ہے۔ بعض لوگ کسی شاعر کے ساتھ بہت زیادہ وابستہ رہنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے اس کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے حُسن اعتقاد سے مبالغہ آمیز باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں۔ اہل تنقید اُن کی اس رائے کو کتنا ہی بُرا کہیں، میرے نزدیک ایسی رائے دینے پر ہر وہ معقول انسان مجبور ہے جو شعر کی طلسمی دنیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر بجنوری نے دیوان غالب کے متعلق کہا "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک مقدس وید، دوسرے دیوان غالب" اس آواز میں بیشک علمی تنقید کا توازن نہیں، لیکن شعر کا جادو ضرور بول رہا ہے۔

سمٹا ہوا مفہوم | خاموش تعلیم کی دوسری صورت، شاعر کے کلام کا وہ مجموعی اثر، اس کے تجربات اور نظریات کا وہ سمٹا ہوا مفہوم ہے جو اس کے اشعار کے پیچھے جھلکتا ہے۔ اسے بعض لوگ "پیام" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ الفاظ اور خیال کے پیچھے روشنی کا وہ حلقہ، جو مثلاً کسی دیوتا یا ولی کی تصویر میں سر کے اطراف ایک آفتابی کی صورت میں دکھایا جاتا ہے، کسی صاحب ذوق کو بہ آسانی نظر آتا ہے، اور جب نظر آتا ہے تو اس میں شاعر کا پیام لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ورڈسورتھ نے ایک پھول کے متعلق کہا کہ "وہ آنسوؤں کے لئے بہت گہرا نظر آتا ہے"۔ ممکن ہے حیاتیات کا ایک پروفیسر ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے ہاتھ میں نشتر لیکر اس شعر پر ہنس دے، لیکن شاعر کا ایمان یہی ہے کہ جس طرح کائنات کے ہر ذرے میں ایک "وحی" "ایک معجزہ" دیکھتا ہے، اسی طرح اپنے اشعار کو بھی اس وحی اور معجزے کا پیامبر بنائے۔ والٹ وھٹمن اپنی ایک مشہور نظم میں کہتا ہے کہ "معجزہ، صرف پیغمبروں سے ہی سرزد ہونے والے عمل کو نہیں کہتے، میرے نزدیک عالم کی ہر چیز ہر ذرہ ایک معجزہ ہے"!

شاعری "غربال حیات" ہے | شاعرانہ مشرب اور تخلیق کے بعد میں اس مقام پر آتا ہوں جہاں شاعری مجھے "غربال حیات" نظر آتی ہے۔ شاعری زندگی کو چھانتی اور فطرت کی عظیم قوتوں کے پردے ہٹا کر انہیں لطیف اور دلکش تر بناتی ہے۔ شاعری کے غربال میں دنیا جہاں کی ہر چیز چھنتی ہے اور نظام کائنات کی عملی طاقتیں کبھی الگ الگ ہو کر اور کبھی ایک ساتھ ہو کر سامنے آتی ہیں۔ بعض حقیقت پرست یہ کہتے ہیں کہ شاعری زندگی کے مسائل کی سچی تصویریں پیش کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں شاعری تو کیا، دنیا میں حقیقت پرستی کا وجود شاید ہی ممکن ہو۔ افلاطون جامع الفاظ میں ہر چیز "عکس کا عکس، سچ کا سایہ" ہے۔

جس طرح آفتاب کی روشنی "سماوات" کے بیشمار پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچتی ہے، اسی طرح شاعر کے دل سے شعر کے الفاظ تک مسائل حیات چھاتے جاتے ہیں اور بہ ظاہر واقعہ کتنا ہی اصلی معلوم ہو وہ بغیر شاعر کی رنگ آمیزی کے شعر کا روپ اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص ملمع کی ہوئی اور ہزاروں پردوں سے آئی ہوئی بات کو حقیقت سمجھے تو قصور کس کا؟

ہماری شاعری | آجکل ہماری اُردو شاعری طوفان زدہ درختوں کی طرح جھکولے کھا رہی ہے۔ بعض ممتاز سخن گو میدان میں آتے اور رنگ کا ایک طوفان پیدا کرتے ہیں۔ جب یہ ہوا چلتی ہے تو چھوٹے چھوٹے درخت اور اطراف کی جھاڑیاں سب ہوا کی زد میں آجاتی اور جھومنے لگتی ہیں۔ جب زور کی بارش ہوتی ہے تو کاروان کے کاروان اس میں بہ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری شاعری اپنی زندگی، اپنے تجربات کی ترجمان نہیں بلکہ غیروں کے منہ کا نوالہ بنگئی ہے۔ میں شاعری میں اس امر کو ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے شاعر اپنے گردوپیش زیادہ توجہ سے دیکھنے کی عادت ڈالیں اور تا حد امکان اپنے ماحول کی ترجمانی کریں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اُردو شاعری کو حسن وعشق ہی کے جال میں پھنسا ہوا نہ رکھا جائے، بلکہ اسے غربال بنایا جائے جس میں حسن وعشق کے علاوہ زندگی، دنیا، آسمان، اور زمین کی ہر چیز، احساس، اثر، خیال، وجدان کی ریت میں فلٹر ہو، اور قطرہ قطرہ چمن کے شفاف اور صحت بخش پانی کی طرح ٹپکنے لگے۔

بعض لوگ زندگی کی کثافتوں میں بہت زیادہ گھس جاتے ہیں۔ بعض رومانی اسکول کے شاعروں مثل شیلے کی طرح ضرورت سے زیادہ لطافتوں ہی میں پرافشانی کرتے رہیں۔ یہ افراتفری میرے نزدیک اقتضائے حال کے مطابق نہیں۔ میں ہیگل کے اس نظریے کا قائل ہوں کہ شاعری کے مجسمے کا پاؤں زمین پر اور سر آسمان میں رہنا چاہئے۔

حقیقت پرستی کا رنگ | حقیقت پرستوں کا یہ ادعا ہے کہ واقعات کا پیش کرنا بہت بڑا کمال بھی ہے اور ضروری بھی۔ میں اس میں صرف اتنی ترمیم چاہتا ہوں کہ "واقع کا پیش کرنا" جب آرٹ کے ہاتھوں عمل میں آرہا ہے تو ضروری ہے کہ حقیقت کو نمود کے چوکھٹے میں دیکھا اور دکھایا جائے۔ نری حقیقت شعر کی دنیا میں بے معنی چیز ہوگی۔

شعر ایک تصویر ہے | میں یہاں شعر کے متعلق اپنا ایک تصور پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک شعر

ایک تصویر ہے جس کے پیش کرنے میں شاعر عمل کی تین منزلوں سے گذرتا ہے۔ کوئی بھی شعر لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے تین حصے ہو سکیں گے۔ پہلا حصہ "انتخاب اور تعین" کا ہوگا جس میں شاعر اپنی دنیائے فکر و خیال سے ایک بات چنتا اور ان کی حدیں مقرر کرتا ہے۔ یہ گویا تصویر کا چوکھٹا ہے۔ اس کے بعد وہ اس خیال کو پیش کرنے کا رنگین پس منظر اور ماحول بناتا ہے۔ یہ گویا تصویر کی ایک تفصیل ہے۔ پھر آخری چھینٹے ہیں جس میں اصل خیال کو پورے طور پر اُبھار دیا جاتا ہے۔ ہر شعر میں کسی نہ کسی طرح یہ تین حصے موجود رہیں گے۔ فرق یہ ہوگا کہ کہیں یہ واضح ہوں گے اور کہیں مبہم اور موہوم نظر آئیں گے۔ میرے نزدیک اعلیٰ شعر کی صفت یہی ہے کہ وہ وسیع سے وسیع چوکھٹے اور رنگین ماحول میں ایک بلند اور دلفریب خیال پیش کرے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تصویر کے یہ تینوں رخ، فوٹوگراف کی طرح ٹھوس اور واضح نہ ہوں بلکہ ایک رنگین روغنی تصویر کی طرح اور ایک خواب کی دنیا کی مانند موہوم اور وجدانی نقاب ڈالے ہوئے ہوں۔ اس طرح شعر کو گویا ایک گھونگھٹ نکالی ہوئی دوشیزہ ہونی چاہیے جس میں تصور، رنگینی اور حقیقت تینوں چیزیں موجود رہتی ہیں ایک شعر ہے۔

دم بدم اُٹھنے لگے مے کی طرف رندوں کے ہاتھ
ساقی رنگین نے شاید یہ اشارا کر دیا

یہ شعر ایک تصویر ہے۔ پہلا حصہ یعنی چوکھٹا یہ ہے کہ شاعر مشرب عشق کی عقیدت اور مدہوشی کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا حصہ ماحول ہے اور وہ اس طرح فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک چمن ہے، چاندنی رات ہے۔ رندوں کا مجمع ہے جو عالم مدہوشی میں ہے، ساقی رنگین بیچ میں کھڑا ہوا چاند کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سارے رند اسے جام سمجھ کے ہاتھ بڑھا کر لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخری حصہ یعنی اصل خیال یہ ہے کہ ایک طرف رندوں کی تسلیم و بیخودی کا ایک عالم موجود ہے۔ دوسری طرف ساقی کی فیض و عطا میں شوخی اور بلندی کا تصور کام کر رہا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی سارا منظر ایک دلچسپ اور رنگین خواب ہے۔

فطرت کی پوجا آیئے اب شاعری کی اس خصوصیت کی طرف جائیں جسے میں فطرت کی پوجا کے نام سے یاد کرنا چاہتا ہوں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا کی اعلیٰ ترین شاعری وہ رہی ہے جس میں یہ تین امور موجود ہوں (۱) کائنات کی وسعت (۲) عقیدت (۳) تقدس اور پاکیزگی۔ لیکن یہ وسعت، عقیدت، اور پاکیزگی، جسطرح میں نے ابتدا میں کہا ایک مکمل مشرب کی صورت میں رہتی ہے اور اجزائے ایمان کی طرح منتشر کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

صبح خوشرنگ کی ہر دھوپ نہاتا ہوں میں
یاد محبوب میں سراپا جھکاتا ہوں میں

فطرت کے وسیع لفظ میں ریت کنکر سے لیکر چاند، سورج، ملائکہ، عرش، کرسی، بلکہ اللہ میاں سب شامل ہیں۔ شاعر کا ایمان یہ ہونا چاہئے کہ فطرت کی ہر چیز کا ایک خاموش پجاری ہو، اور ساری دنیا، کون و مکان کو ازلی محبت کے ہم آہنگ بنائے۔ جس طرح فطرت کے محسوس مناظر اور مشاہدات ہیں، اسی طرح بعض محسوسات اور اعتقادات بھی ہیں۔ مثلاً حُسن، عشق، نیکی کے قوانین کے اٹل اثرات، ازل اور ابد کی وسعت خدائی قوتوں کے تسلط عظیم پر ایقان، نظام کائنات کی ایک باقاعدگی اور سوز پر والہانہ اضطراب، آغاز اور انجام زندگی سے عقیدت، ذوق تجسس، فنا اور بقا میں گم شدگی وغیرہ۔ یہ وہ بلند، قوی اور اٹل احساسات ہیں جن کی قوت کو دنیا کا کوئی اثر زائل نہیں کر سکتا۔ ہر شاعر ان اثرات کو محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں پر قبول کرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ فطرت کی پوجا کرنے کا ایک اور ٹیڑھا راستہ بھی ہے جسے ہم Scepticism. سے تعبیر کرتے ہیں اور جو وہم اور شک، شوخی اور الحاد بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ طریقہ بظاہر فطرت کی محبت کے مغائر معلوم ہوتا ہے، لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز سے محبت کرتا ہے، اتنی ہی دوری کے ساتھ اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے۔ غم تلاش مسرت کا دوسرا نام ہے۔ جگر کہتا ہے۔

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسین گناہ کئے جا رہا ہوں میں

غالب کہتا ہے۔

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایمان زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن

آجکل کی شاعری میں اس "ٹیڑھی چال" کی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔

عقیدت شاعری میں عقیدت سے میری مراد اندھا یقین یا خود ساختہ اعتماد نہیں بلکہ روح اور نظر کی وہ وجدانی کیفیت ہے جو عظمتوں کا احترام کرنا جانتی اور اُن سے محبت کرتی ہے۔ عقیدت دراصل روح کی ایک شادمانی، ایک تعلق ہے جو کائنات کی خوبیوں کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اسی تعلق سے خوشی اور غم دونوں کا کام لینا شاعری کا ایک پر کیف عمل ہونا چاہئے۔ کسی شئے کا احساس تعریف یا مذمت کی صورت میں ظاہر کر دینا اتنا دلکش نہیں جتنا اس احساس میں دلی تاثر اور احترام کو شامل کرنا ہے۔ فطرت ایک کھیل نہیں، مگر شاعر کے نزدیک

اگر وہ کھیل بن بھی جائے تو اس میں فطرت کی عظمت کا ہر طرح احترام کرنا ضروری ہے۔

عقیدت خواہ جذبۂ محبت سے ہو یا جذبۂ انتقام و بغاوت سے، شاعری میں قوتِ یقین، رنگ اعتماد اور اکتسابِ فیض کی بلند صفات پیدا کرتی ہے۔ عقیدت سے شاعر دلنشین بنتا اور محبت کی نیکیاں پھیلانے کا واسطہ ہوتا ہے اس سے سچائی کی خوشبو آتی ہے اور دروغ سے تنفر پیدا ہوتا ہے۔

تقدس اسی کے جلو میں تقدس کو رہنا چاہئے۔ شاعری ایک قسم کے اچھوتے پن کی محرک ہوتی ہے۔ وہ ایک روحانی غسل ہے۔ اس کے ذریعے گندہ جذبات دور ہوتے اور اُن کی جگہ فطرت کی روشنیاں پھیل جاتی ہیں۔ تقدس کے مفہوم کو مذہبی رنگ دے کر اسے صوفیانہ شاعری یا اخلاقیات میں محدود نہیں کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک پوری شوخی، بے باکی بلکہ الحاد کے ذریعے بھی پاک خیالی کے ایسے چھینٹے دئے جاسکتے ہیں جو دل کی گوہر افشانی کا نتیجہ ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ تہذیب اور صاف نگاہی کا رنگ فطرت خیال سے دور نہ ہونے پائے اور مقصد یہ ہے کہ ٹیڑھے راستے سے منزل یقین کی زیادہ مستند اور محکم تلاش کی جائے۔

آزاد خیالی اور تحریکات خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی، موجودہ تہذیب نے انسانی خیال میں ایک آزادی اور شوخی کی روح پھونک دی ہے، مذہب، قانون، معاشرت، تمدن، اور اخلاق جیسی چیزوں پر ایک نئے طریقے سے غور و فکر کیا جارہا ہے۔ لیکن جہاں عہد جدید کا مفکر ان کو اپنی مرضی اور خیال کا تابع بنانے کی کوشش کرتا ہے وہاں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ آرٹ کے وسیع میدان میں اس جذبے کا اثر بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اس کے زیر اثر عہد حاضر کی شاعری اپنی شوخی اور آزادی سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھانے لگی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جہاں تک شاعری کی عمیق اور دیرپا چارہ سازیوں کا تعلق ہے ہمارے آزاد خیال شاعروں کے تفکرات کو شاید زیادہ استقامت نصیب نہ ہوسکے کیونکہ زندگی کے بعض مسائل مثلاً خدا، مذہب، محبت وغیرہ بہت زیادہ سنجیدہ، اٹل، اور انسانی فکر و خیال کی حدوں سے باہر بھی ہوتے ہیں ان کے ساتھ انسان کچھ دنوں تک ٹھٹول کرسکتا ہے، لیکن ان کے استحکام اور تسلط کو اپنی آزاد خیالی کی رو میں بہا نہیں سکتا۔ یہی حال میرے نزدیک ایسی شاعری کا ہے جس کی بنا چند سیاسی اور تمدنی تحریکات پر ہو اور جو موجودہ زمانے میں بتدریج آگے بڑھتی جارہی ہے

معجزۂ شرح و بیان آخری منزل پر میں شاعری کی اس ایک صفت کا ذکر بھی کردینا مناسب سمجھتا ہوں جو

"معجزۂ شرح و بیان" سے موسوم کی جاسکتی ہے۔ یہ صفت تخیل، احساس، تصور وغیرہ ان سب سے الگ اپنی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے شاعر اپنے خیال کو وہ نمود وہ اظہار عطا کرتا ہے جس میں طلسم اور جادو کا اثر ہوتا ہے جس کے سنتے ہی طبیعتیں منقاد ہوجاتی ہیں اور ذوق بے اختیار جھومنے لگتا ہے۔ یہ صفت بڑی متنازعہ فیہ ہے اس کے متعلق تین اہم سوالات کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) کیا خیال اہم ہے یا معجزۂ شرح و بیان؟

(۲) کیا ہر شعر پیرایہ اظہار کا مکمل نمونہ ہوتا ہے؟

(۳) کیا اس کی حدود متعین ہوسکتی ہیں؟

پہلا سوال کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ خیال کتنا ہی اہم ہو، جبتک اس کا اظہار درست نہ ہو۔ خیال کی نہ کوئی اہمیت باقی رہتی ہے اور نہ اس کا اثر جس طرح ایک نقاد نے کہا۔

"Form and mattersare vain words everything is style"

لیکن ایسے خیالات انتہا پسندی پر مبنی ہوتے ہیں۔ میں اس سوال کا جواب اصول سے زیادہ اس عمل کی رو سے دینا چاہتا ہوں جو ہر شاعر کو پیش آتا ہے۔ شعر گوئی کی ابتدائی منزلوں میں بیشک طرز اظہار میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے اسلوب بیان ہاتھ آتا ہے، ویسے ویسے شاعر کا اثر پھیلتا جاتا ہے، لیکن ایک زمانے کی مشق کے بعد حقیقتاً شاعر کو اظہار خیال میں اتنی دقت پیش نہیں آتی جتنی کہ خود خیال تلاش کرنے میں پیش آتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا آتا ہے جبکہ شاعر کے پاس قادر الکلامی کا ساز و سامان پورا تیار رہتا ہے، لیکن بیکار کارخانہ دار کی طرح شاعر مواد کی تلاش میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ کپڑا بننے کی مشین تیار رہتی ہے، لیکن روئی نہیں ملتی۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر ایسے بے ساختہ اور بلند خیال کا آرزو مند رہتا ہے جو اپنی رفعت اور خوبی کے اعتبار سے اتنا ہی رفیع اور خوب پیرایۂ اظہار اختیار کرنے پر مجبور ہوجائے۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ اعلیٰ خیال اعلیٰ بندش کا محرک ہوتا ہے اور اپنے اظہار کا آپ سانچہ بنالیتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اعلیٰ بندش اعلیٰ خیال کی محرک ہوئی ہو۔ ہاں، اگر ایسا ہو کہ قادر الکلامی کی کسی منزل پر پہنچے بغیر شاعر کو شروع ہی سے عجز زبان محسوس ہو، اور گو اس کے علم اور تجربے کی بنا پر اس کے دل میں اچھے خیالات اُٹھتے ہوں مگر وہ اُن کے بیان کرنے پر قادر نہ ہو،

تو ایسے شاعر کو پوری طرح کامیاب ہونے سے ناامید ہو جانا چاہیے۔

دوسرے سوال کی حد تک میرا خیال ہے کہ شاعری اپنی جبلت اور فطرت کے اعتبار سے ایک "معجزہ شرح وبیان" ہوتی ہے۔ جس طرح فطرت بچے کو بولنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے اسی طرح شاعر اور حسن کار اپنے کمالات کے اظہار میں معجزے دکھانا سیکھتا ہے۔ بعض وقت وہ سادہ الفاظ جو شاعر کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پورے طور پر ادا نہیں ہوتے، اپنے اندر پیغمبرانہ ارشادات اور تسلیم کا اثر رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی شاعر ٹوٹی ہوئی آوازوں میں فطرت کے بہت سے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑ دیتا ہے اور بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو اب تک نہیں کہی گئیں۔

مگر جس طرح تیسرا سوال کیا گیا، اظہار کی حدیں متعین نہیں ہو سکتیں۔ جس طرح ہربرٹ ریڈ کا خیال ہے "آرٹ فطرت کے اطراف ایک   ڈالتا اور ایک باریک خط کھینچتا ہے" یہ تو ممکن ہے کہ آرٹ ــ خصوصاً شاعری کی حد تک شاعر کے اظہار کمال میں ایک مرکزیت، ایک تعین ہو، لیکن جس طرح زندگی متعین ہونے کے باوجود غیر محدود ہے، اسی طرح آرٹ بھی متعین ہونے کے باوجود اپنے کوئی نمایاں ساحل نہیں رکھتا۔

شعر کا نزول شاعر کے لئے بڑا نازک ہوتا ہے، ایسے وقت مناسب ہے کہ شعر کو ذوق، تخیل، اور جوش کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس سانچہ میں چاہیں جذبے کو ڈھال لیں۔ یہی فطری شاعری ہے۔ البتہ چند احتیاطیں ضروری ہیں جو ہر آرٹ کی ابتدائی شرطیں ہوا کرتی ہیں۔

آج سے پچاس سال پیشتر تک ہماری اردو شاعری میں "شرح وبیان" کے مدارس خیل بہت باا ثر تھے۔ اب انکی گرفت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے اور لوگ خیالات کی اہمیت پر غور کرنے لگے ہیں۔ مگر جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا، ہماری شاعری خیالات سے زیادہ زبان کی وادی میں گھومتی ہے، اور بہت سے شاعر اعتیاطاً زبان کے چکر میں پڑ کے اور جنیں خیالات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کاش شاعر کی قوت "شرح وبیان" اور اسکی فطرت پر اعتماد رکھتے ہوئے جسے میں نے معجزے سے تعبیر کیا ہے، لوگ شاعری کے مسلک کی طرف توجہ فرمائیں، جب شاعری ایک مشرب، ایک تخلیق، ایک اتفاق، اور ایک پوجا بن جائیگی تو وہ دن دور نہیں کہ شرح وبیان کا معجزہ ہماری زبان اور ہمارے ادب کو اس مقام پر کھڑا کر سکے گا جہاں بقول میاتھیو آرنلڈ ہماری قوم کو آسانی کے ساتھ "یقین اور اعتماد کی جائے پناہ مل سکے گی۔"

محمد عبدالقیوم خان باقی

بیسویں صدی

شوخ، چنچل، بے ادب، گستاخ، تیز
بے نیاز، آزاد اک روح گریز
بھاگتی ہے محفلِ اوہام سے
کھیلتی ہے اپنے صبح وشام سے
اک رعونت، اک خوشی، اک بانکپن
بزم رنداں، سرکشی کی انجمن
زلزلہ، طوفان، بھونچال اور آگ
رینگتا ہو جیسے اک زہریلا ناگ
خوف سے لرزاں نگاہوں سے ایاغ
پھونک سے بجھتے ہوئے دل کے چراغ
موت کو رنگین شعلوں میں چھپائے
برق کو شیشے کے سینے میں دبائے
شادماں روحِ عناصر دیکھ کر
مست، زہر آلود ساغر دیکھ کر
شعبدہ گر خونِ موجودات کی
پینے والی تلخیٔ آفات کی
ایک روشن آگ، اک کالا دھواں
ایک شورِ ہولناکِ آسماں
ایک ٹیڑھی چال، اک ٹیڑھی نگاہ
جھوٹ اور سچ کا سنہری اشتباہ
مصلحت اور غور سے ناآشنا
باادب محفل میں اونچا قہقہہ

خشک پتے، سوکھی ڈالی کی زباں
نغمۂ غم بلبلِ بے آشیاں

چیل اور کووں کا غم کھاتی ہوئی
رقصِ قمری سے گذر جاتی ہوئی

علم کی مشعل کھنڈر میں لے چلے
یا کبھی نورِ سحر میں لے چلے

چاند کو ٹھوکر سے شرماتی ہوئی
پستیوں کو اوج پر لاتی ہوئی

ایک بھوت آوارہ گورستان میں
ایک روحِ شوق کوہستان میں

اک گنہ، اک بے نیازی، ایک بھول
آیتہ فی النار کی شان نزول

ایک کھرپی، ایک کمبل، اک کدال
ذوق آزادی کی روحِ بے مثال

رعبِ دولت خون کھولاتا ہوا
نازِ ہستی آگ برساتا ہوا

آنکھ کے ڈوروں میں خونِ انتقام
ہیچ نظروں میں خداؤں کے غلام

سرزمینِ آسماں سے اک ٹھٹول
ایک حرفِ شوخ، اک گستاخ بول

لذت وہم و گماں کے سامنے
خالقِ کون و مکاں کے سامنے

برق ہے ہر خرمنِ خاموش پر
ناز فرماتی ہے عقل و ہوش پر

کیا بتاؤں اُس کا کیا پیغام ہے
کیا بتاؤں اس کا کیا انجام ہے

باقی

عِلمیات
یا
نظریۂ علم

تعریف

علمیات (اپسٹما لوجی مرکب ہے دو یونانی الفاظ سے 'اپسٹیم = علم' لوگاس = نظریہ یعنی نظریہ علم کا لفظ پہلی مرتبہ اسکاٹ لینڈ کے ایک فلسفی جی یف فری آر (۱۸۰۸ء تا ۱۸۶۴ء) اپنی تصنیف Institutes of Metaphysics میں استعمال کیا۔ کسی ظریف نے اس کی تعریف یوں کی ہے " یہ وہ علم ہے جو ہمیں یہ علم بخشتا ہے کہ کونسا علم علم ہے"۔ خود "علمیات" ہی کے لفظ سے یہ مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے کہ یہاں بحث علم کے متعلق ہوتی ہے۔ اسی مفہوم کو زیادہ دقت نظری اور وضاحت کے ساتھ ہم اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ "علمیات[1] فلسفہ کا وہ شعبہ ہے جس کا دائرہ علم کی ماہیت اور اس کی ساخت کی تحقیق و تدقیق ہے؛ اس تحقیق کی غایت یہ ہوتی ہے کہ علم کے امکانی شرائط اور اس کی قدر و قیمت و صحت کا تعین کیا جائے کیونکہ علم حقیقت کی ماہیت اور اس کے اضافات کا اظہار ہوتا ہے" (ڈاس کس) بالفاظ[2] دیگر علمیات علم کی اصل و ابتدا، ماہیئت اور اس کے حدود کے متعلق تحقیق کا نام ہے (رینگل پیاٹیسن)

علم کے لفظ پر تھوڑی دیر غور کرنے سے تمہیں دو امتیازات صاف طور پر نظر آئیں گے۔ ایک تو خود جاننے کا باطنی یا ذہنی عمل، دوسرے وہ خارجی دنیا جس کی طرف یہ عمل راجع ہے؛ جاننے ہی میں یہ امتیازات ایک ساتھ ایک قسم کی وحدت میں پیش ہوجاتے ہیں۔ جاننے کے اس عمل کا نتیجہ صداقت کا حصول ہوتا ہے۔ ان

[1] دیکھو انسیکلوپیڈیا برٹانیکا، تھیوری آف نالج [2] دیکھو ڈکشنری آف فلاسفی اینڈ سیکالوجی، اپسٹما لوجی

امتیازات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے تین مختلف دائرے ہیں (۱) اس ذہنی عمل کے ساخت کی تحقیق جس کو علم کہتے ہیں ــــ یہ نفسیات کا دائرہ ہے۔

(۲) خارجی دنیا کی اشیاء کی خصوصیات کی تحقیق ــــ یہ علوم نظریہ کا دائرہ ہے۔

(۳) صداقت کی ماہیت کی تحقیق، وہ صداقت جو ذہن اور واقعات سے جدا ہے گو ذہن اور واقعات کے "متعلق" ضرور ہے ــــ یہ نظریہ علم و منطق کا دائرہ ہے

یہاں ہماری بحث نہ نفسیات سے ہے نہ علوم فطریہ سے بلکہ علمیات سے۔ نفسیات واقعات ذہنی سے بحث کرتی ہے۔ اس کو ان خارجی اشیاء سے دلچسپی نہیں جو مفہوم ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف علمیات کا اس مسئلہ سے تعلق ہے کہ ذہن کا ایک فعل یعنی خارجی دنیا کا کس طرح علم بخش سکتا ہے اور وہ کیا شرائط ہیں جن کی پابندی کی وجہ سے یہ فعل دنیا کا صحت و صداقت کے ساتھ اظہار کر سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر علمیات، علم اور عالم سے اسی صورت میں بحث کرتی ہے جب کہ ان کا تعلق "معلوم" سے ہوتا ہے اور وہ یہ دریافت کرنا جانتی کہ کیا علم خارجی حقیقت (معلوم) کا صحیح بیان ہے اور کن شرائط کے تحت یہ علم صحیح علم کہلایا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علمیات خود خارجی حقیقت (یا معلوم) کی ماہیت دریافت نہیں کرتی جو "وجودیات" کا کام ہے جو فلسفہ کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ یہ علم کی اصل وابتدا، اس کے مآخذ، اس کی صداقت و صحت کے معیارات سے بحث کرتی ہے۔

یوں تو یونان قدیم کے فحول فلاسفہ ــــ جیسے سوفسطائیہ، فلاطون، ارسطو، رواقیہ و ابیقوریہ ــــ نے اُن مسائل پر ضرور اپنی توجہ مبذول کی تھی جو اب علمیاتی مسائل کہلاتے ہیں تاہم جس فلسفی نے اول مرتبہ ان مسائل پر تنقیدی طور پر تفصیل سے غور کیا اور ان کا حل فراہم کرنے کی کوشش کی، وہ سترہویں صدی مسیحی کا انگریز فلسفی جان لاک ہے (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) جس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "An Essay concerning human Understanding" کو بیس سال کے غور و فکر کے بعد ۱۶۹۰ء میں شائع کیا۔ لاک اس کتاب کے مقدمہ میں کہتا ہے کہ ایک روز کا اتفاق ہے کہ پانچ چھ دوست اس کے مکان پر جمع تھے اور فلسفیانہ مسائل پر بحث ہو رہی تھی۔ انہوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ بحث کی ابتدا تو حیرانی سے ہوئی تھی لیکن حاصل بجز ضیق و پریشانی کے سوا کچھ نہیں، کوئی تشفی بخش نتیجہ ہاتھ نہیں لگتا اور فلسفیوں کے "نکتہ ہائے دقیق" سے "علاج ضعف یقین" حاصل نہیں ہوتا۔ لاک کے ذہن میں آیا کہ

کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ہم نے راستہ ہی غلط اختیار کیا ہے؟ ان سوالات پر بحث کرنے کے پہلے کیا یہ ضروری نہیں کہ "ہم اپنی قابلیتوں کا امتحان کر لیں اور دیکھیں کہ ہماری فہم کن چیزوں کے سمجھنے کے قابل اور کن چیزوں کے سمجھنے کے قابل نہیں"۔

اس روز سے بیس سال تک لاک نے غور کیا کہ کیا ذہن انسانی فلسفہ کے دقیق مسائل کو حل کرنے کے قابل بھی ہے؟ کیا "عقل کی تقدیر میں حضور" ہے؟ یعنی کیا انسان کوئی ایسا ملکہ علمی رکھتا ہے جو تجربہ کے واقعات سے اس کو ماورا لیجاتا ہے اور "حقیقت" کے حضور میں پیش کر دیتا ہے، اگر کوئی ایسی حقیقت کا وجود بھی ہو؟ کیا یہ خیال صحیح ہے کہ

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے　　لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

کیا ہماری عقل جس کو زمانہ مشعل راہ سمجھا ہوا ہے حواس کے اکتشافات تک محدود نہیں اور کیا حواس سے ہمیں حقائق کا علم ہوتا ہے یا ہم محض مظاہر ہی کی حد تک محدود رہتے ہیں؟

کیا ہمیں اس بات کا یقین ہو سکتا ہے کہ کوئی خارجی مستقل بالذات دنیا کا وجود بھی پایا جاتا ہے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ حواس سے جن مظاہر کا ہمیں علم ہو رہا ہے وہ محض ہمارے ہی ذہن کی بنائی ہوئی شکلیں ہوں، ہمارے ہی ذہن کے تصورات؟

غرض لاک کی اس کتاب میں اسی قبیل کے مسائل نہایت جرأت کے ساتھ اٹھائے گئے ہیں، عالمانہ شان سے ان کا مطالعہ کیا گیا ہے، اور بالاستیعاب ان پر بحث کی گئی ہے اسی لئے ہم لاک کو علمیات کا بانی قرار دیتے ہیں گو زمانہ ماضی میں بھی ان مسائل پر کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی نے ضرور کہا تھا۔

علمیاتی مسائل:۔ علمیات میں تین اہم مسائل سے بحث کیجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ علم کا کوئی اہم مسئلہ اس کے دوسرے اہم مسائل سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا یہ ایک دوسرے پر مبنی اور ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، یعنی ایک پر بحث کرنے میں دوسروں پر بھی بحث کرنی پڑتی ہے۔ اور ایک مسئلہ کے متعلق ہمارا جو نقطۂ نظر ہوگا وہی بڑی حد تک دوسرے مسائل کے متعلق بھی ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم فلسفہ میں حقیقت کے متعلق ایک ایسا تصور حاصل کرنا چاہتے ہیں جو وحدت رکھتا ہو۔ اس لئے ہمارے مختلف نظریات میں ایک قسم کا توافق ضروری ہے۔ بہر حال بحث و تمحیص کی خاطر ہم علمیات کے

ان تین مسائل میں امتیاز قائم کرسکتے ہیں۔

(۱) علم کے مآخذ کیا ہیں؟ علم اکتسابی ہے یا حضوری؟ یہیں ہمیں علم کی ماہیت بھی سمجھ میں آتی ہے۔

(۲) علم کا حقیقت سے کیا تعلق ہے؟ عالمِ وجود میں علم کا کیا مرتبہ ہے؟ شئے معلوم مادّی ہے یا ذہنی یا دونوں، یعنی شئے معلوم شعور میں وجود رکھتی ہے یا خارج میں؟ جب ہمیں کسی شئے کا تجربہ ہوتا ہے تو کیا ہمیں اس شئے کا براہ راست علم ہوتا ہے یا اس حقیقی شئے کی محض ایک شبیہ یا نقل کا؟

(۳) علم کے معیارات کیا ہیں؟ صداقت و کذب کے امتیاز کی کسوٹی کیا ہے؟

ان ہی مسائل پر پلیس بحث ذیل میں کی جاتی ہے ۶ ہشدار کہ راہ خود بخود گم نگنی

مآخذ علم

علم انسانی کے مآخذ کیا ہیں؟ انسان علم کس طرح حاصل کرتا ہے؟ کیا یہ تجربہ سے حاصل ہوتا ہے، اس طرح یہ حصولی و اکتسابی ہے، یا اس کا مبدء و ماخذ تجربہ نہیں بلکہ عقل ہے، اس طرح یہ وہبی وحضوری ہے؟ یا حصولی بھی ہے اور حضوری بھی؟ کیا علم بغیر ہماری کوشش کے بدیہی طور پر قابل حصول ہے یا ہمیں اس کے لئے رفتہ رفتہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جو ماخذ علم کے مسئلہ کے تحت بحث میں آتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ محض علمی دلچسپی ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ جب تک کہ علم انسانی کے مآخذ و مبادی کا ہمیں صریح و صاف طور پر وقوف نہیں ہوجاتا اس وقت تک یہ سوال کہ کیا مذہب کی توثیق کسی فوق الفطرت اقتدار و حکم سے ہوتی ہے یا محض خود اس کی افادیت کی وجہ سے؟ یا یہ سوال کہ آیا اخلاقی معیارات مطلق ہونے چاہئیں یا اضافی؟ یا پھر یہ سوال کہ آیا اشرافیت بہتر سیاسی نظام ہے یا جمہوریت؟ — اور اسی قبیل کے دوسرے سوالات ہرگز حل نہیں ہوسکتے اور ان سوالات کے عملی ہونے میں کس کو شک ہوسکتا ہے؟ انسان کا عمل تابع ہوتا ہے اس کے یقین کا، اعمال عادت کی بنا ڈالتے ہیں، مجموعۂ عادات ہی کو سیرت کہا جاتا ہے اور انسان کی سیرت ہی اس کی تقدیر ہے! لہذا اگر ہمیں انسان کے اعمال، عادات و سیرت کو اچھی طرح سمجھنا ہو تو ہمیں اس کے تیقنات کی ماہیت کا اچھی طرح علم حاصل کرنا چاہئے۔ تیقنات کی ماہیئت کا سوال علم کے ماخذ کا ہی سوال ہے۔

ماخذِ علم کے مسئلہ کے متعلق تاریخ فلسفہ میں ہمیں تین مختلف نظرے ملتے ہیں:

(۱) تجربیت (امپری سزم)

(۲) عقلیت (رشنلزم)

(۳) سرّیت یا تصوف (مسٹرزم)

ان ہی تین نظریوں کا ہم یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔

(۱) عقلیت

ہم میں سے ہر ایک ذی علم ہے۔ بعض کا علم تھوڑا ہے بعض کا زیادہ "فوق کل ذی علم علیم"۔ علم کا ذخیرہ بے پایاں ہوسکتا ہے، عالمِ خارجی کا علم، اصولِ ریاضی کا علم، صواب و خطا کا علم، صداقت، خیر و حسن کا علم، غرض "انفس" و "آفاق" کا علم ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہے، صحیح ہو یا غلط، اس کی اس وقت بحث نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے علم کا یہ ذخیرہ کس طرح حاصل ہوا؟

فہم عام تو اس کا جواب یہی دیتی ہے کہ اشیاء کے متعلق ہمارا علم تجربۂ حواس سے حاصل ہوتا ہے (تجربیت) لیکن فلسفہ کا ہمیشہ یہ دعوی رہا ہے کہ وہ تجربہ کی پیداوار نہیں بلکہ فکر یا عقل کی، اور یہی عقلیت ہے۔

یونان قدیم کے تمام اکابرِ فلاسفہ اس خیال میں متفق ہیں۔ ہرقلیتوس حواس کو ناقابل اعتبار قرار دیتا ہے۔ "آنکھ اور کان انسان کے بُرے گواہ ہیں" اس کے نزدیک وہی لوگ حواس کی شہادت سے کچھ سیکھ سکتے ہیں جو اس کی توجیہ فکر تنقیدی کے ذریعہ کرسکتے ہیں۔ ایلیائیہ تو حواس کے ذریعہ حاصل شدہ علم کو محض "ظنی" چیز قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک صداقت کے علم کا مبدء عقل ہی قرار پاتی ہے۔ حواس ہمیں دھوکے میں مبتلا کرتے ہیں۔ حواس کی یہ دنیا جس میں کثرت و تعدد، تجدد و تنوع، تغیر و حرکت ناقابل انکار حقائق نظر آتے ہیں محض "التباس" ہے، دھوکا ہے، ظہور ہے، نمود بے بود ہے۔ حقیقت کا علم محض عقل ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، وہی "راہ حق" کی ہدایت کرسکتی ہے۔ اسی طرح دیمقراطیس اور افلاطون دونوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عقل، نہ کہ حواس، صداقت کی طرف رہبری کرتی ہے۔ حواس نہ ذرات ہی کو دیکھ سکتے ہیں نہ تصورات کو، عقل ہی کی آنکھ ان کا معائنہ کرسکتی ہے وہی مظاہر کے حجابات میں سے گزر کر حقیقت کے حضور میں پہنچ سکتی ہے۔ حواس کی "تقدیر میں حضور نہیں"۔

اسی طرح فلسفۂ جدید کے عظیم الشان نظامات بھی اپنی علمیات میں عقلیت پسند ہیں۔ مثال کے طور پر ڈیکارٹ، ھابس، اسپنوزا، اور لائبنز کو لو۔ ان کا نقطۂ آغاز ریاضیات ہے۔ وہ فلسفہ اور علوم فطریہ پر ریاضیات کے طریقے منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ ریاضیات کا تعلق تجربہ حواس سے نہیں، تعقلات و تصورات سے ہوتا ہے جو عقل کی پیداوار ہیں۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ عقلیت نظریہ علم کی اولین شکل ہے۔ زمانہ قدیم و جدید کے عظیم الشان نظامات فکر نے اس کو اپنے دعوی کی تائید میں پیش کیا۔ تجربیت بعد کی پیداوار ہے، یہ مابعد الطبیعیاتی نظامات اور ان کی علمیات کی تنقید کے طور پر پیدا ہوئی ہے۔

عقلیت کے مفہوم کی کامل توضیح کے لئے ہم فلاطون۔ ڈیکارٹ، اسپنوزا اور کانٹ کی عقلیت کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے۔ صرف اسی قدر تفصیل ہوگی جتنی کہ فہم مضمون کے لئے ضروری ہو۔

افلاطون کی عقلیت

پادلسن[1] فلاطون کی عقلیت کو "مابعد الطبیعیاتی عقلیت" کہتا ہے، ہیگل کا نظام فکر بھی اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

افلاطون کا ایقان تھا کہ حواس کا یہ خارجی عالم حقیقی نہیں حقیقت جس کی ہر فلسفی کو تلاش ہوتی ہے تصورات کا ایک خارجی نظام ہے جو ذہن انسانی سے مستقل و بغیر محتاج طور پر پایا جاتا ہے۔ انسان کو اس کا علم کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ حواس کو نظر انداز کرنے سے۔ کیونکہ تصورات کا علم حواس کو ہرگز نہیں ہوسکتا، ان کا علم ذہن ہی کو ہوسکتا ہے جو ابتدا ہی سے ان کا علم رکھتا ہے، وہبی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ فلاطون صرف فلسفی ہی نہیں بلکہ شاعر بھی تھا، اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات کو شاعرانہ لباس میں پیش کیا ہے بعض دفعہ صنمیاتی طریقہ پر اور ہمیشہ صوفیانہ انداز میں تصورات کے علم کو "حافظہ" سے تعبیر کرتا ہے جو حواس کا عطا کردہ نہیں بلکہ گزشتہ زندگی سے موجودہ زندگی میں ساتھ لائی ہوئی چیز ہے۔ قصہ یہ ہے کہ انسان کی روح اس خاکدان عالم میں جلوہ افروز ہونے کے پہلے عالم مثال میں

[1] دیکھو فریڈرش پادلسن کی کتاب مقدمہ فلسفہ صفحہ ۳۸

تصورات کا نظارہ کر رہی تھی۔ وہ ان کے حضور میں تھی، مشاہدہ عینی میں مصروف تھی۔ جب اس کو عالم حواس کے سیر کی خواہش پیدا ہوئی تو اس کو ایک مادی جسم کے قفس میں محبوس کر دیا گیا اور اجازتِ سفر دی گئی۔ مادی جسم میں مقید ہو کر روح کی قوت علمی میں تاریکی پیدا ہوگئی۔ مادہ کے لوازمات حسی خواہشات و جذبات ہیں، ان ہی کی وجہ سے تصورات کے ادراک میں ظلمت و اختلال پیدا ہوتا ہے ع حجاب چہرۂ جان میشود غبار تنم! فلاطون نے اس کیفیت کو ایک تشبیہ کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔ ریپلک (جمہوریت) میں وہ کہتا ہے کہ فرض کرو کچھ انسان ایک غار میں بیٹھے ہیں، اس حالت میں کہ ان کے پیر اور ان کی گردنیں زنجیر سے بندھی ہیں اور ان کی پشت روشنی کی طرف ہے، انہیں سوائے ان پرچھائیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا جو غار کے دہانہ کے سامنے سے گزرنے والی چیزیں ڈال رہی ہیں! یہی حالت انسان کی روح کی ہے جو جسم کے غار میں مقید ہے اور انہیں پرچھائیوں کو دیکھ سکتی ہے جو گزرنے والی چیزیں منافذ جسم (آنکھ، کان، وغیرہ) کے ذریعہ ڈال رہی ہیں[1]۔

اس طرح جسم میں رہ کر انسانی روح حواس کے ذریعہ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی! فلاطون کا نظریہ علم حواس کی اہمیت کا صاف انکار ہے۔ حواس سے کسی طرح حقیقی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر ہوتا کیسے ہے؟ عقل سے۔ بغیر حواس کے مواد فراہم کرنے کے عقل کو تصورات کیسے حاصل ہوئے؟ اس طرح کہ ہماری موجودہ زندگی کی ابتدا راسی دنیا میں نہیں ہوئی ہم ایک دوسرے عالم قدس کے باشندے ہیں، وہاں ہم نے حقائق کا بالمواجہ مشاہدہ کیا تھا پھر اس سراچہ ترکیب میں "تختہ بندِ تن" ہوئے۔ اُس زندگی کی یاد اب بھی کچھ باقی ہے۔ علم ان ہی گذشتہ کی دیکھی ہوئی چیزوں کی یاد ہے، حافظہ ہے (Thory of Reminiscence or Anamnesis) یہ یاد کس طرح تازہ ہوتی ہے؟ عالم حواس کی چیزیں تصورات (حقائق) کے اشباح و نقول ہیں، مماثلت بعیدہ سے ہی روح میں اصل کی یاد تازہ ہوسکتی ہے، تصورات کی محبت (Eros) جاگ سکتی ہے اور اس طرح روح کو حقیقت حقہ کا علم حاصل ہوتا ہے۔

یہاں فلسفہ کتنا ہے اور شاعری کتنی، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن فلاطون کے 'مکالمات' سے ہم کو وہبی تصورات" کی صریح تعلیم ملتی ہے یعنی یہ تعلیم کہ جب ذہن دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اپنی ذات ہی میں علم کے

[1] دیکھو ریپلک (ایوری مین سیریز) صـ ۲۰۷ وغیرہ

حصول کے بعض ذرائع لے آتا ہے۔ "وہبی" کا لفظ افلاطون استعمال نہیں کرتا لیکن اس کی تعلیم ضرور دیتا ہے (وہبی تصورات کے نظریہ کے متعلق ہم ڈیکارٹ، لائبنز، لاک میں بہت زیادہ پڑھ ہو گے) اس کی مزید توضیح کے لئے ایک مثال پر غور کرو۔ ہم کسی شخص کو انصاف پسند یا ظالم اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک کہ ہم کو انصاف کا ایک تصور یا تعقل اول ہی سے حاصل نہیں ہوتا یعنی جب تک کہ ہمیں انصاف کا علم نہیں ہوتا؟ جب ہمیں انصاف کا علم ہوتا ہے تو اسی وقت ہم حکم لگا سکتے ہیں کہ ایک شخص انصاف پسند کیوں ہے اور دوسرا ظالم کیوں۔ اب تصورات (مثلاً انصاف یا عدل وغیرہ) کا علم تجربہ سے حاصل نہیں ہوتا، یہ جزئیات یا (عدل کی جزئی مثالوں) سے ماخوذ و مستفاد نہیں۔ تصورات کا علم وہبی طور پر مخفی و پوشیدہ طور پر روح انسانی میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے جس کو تجربہ کی جزئیات بیدار کرتی ہیں، ظاہر و مبرہن کرتی ہیں، جگاتی اور شعور میں لے آتی ہیں۔ جب تصور جاگ اُٹھتا ہے تو دوسرے تصورات بھی اس سے متخرج کئے جاسکتے ہیں۔ پھر ان کے تضمنات یا معانی پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح ہمیں نیا اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ انسان تمام اشیاء کا معیار ہے، تمام صداقت کا معیار ہے، کیونکہ اس کی روح میں بعض کلیات یا تصورات و تعقلات ابتداہی سے مخفی و مستور ہیں جو اس کے تمام علم کا نقطہ آغاز قرار پاتے ہیں۔ اسی خیال کو شاعرانہ انداز میں اوپر اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ اس زندگی سے قبل روح نے تصورات کا بالمواجہ مشاہدہ کیا ہے، اور اسی لئے اس کو ان کا علم حاصل ہے، یہ حواس سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہاں جگایا جاسکتا ہے۔ اس طرح سارا علم "وہبی" قرار پاتا ہے، تجربہ حواس اس کا ماخذ و مبداء نہیں۔ کما قلنا آلان۔

ریاضیاتی عقلیت

عقلیت کی دوسری شکل سترھویں صدی مسیحی کی عقلیت ہے جس کو پاؤلسن "ریاضیاتی عقلیت" کہتا ہے۔ اس کے نمائندوں میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ڈیکارٹ، اسپنوزا اور لائبنز ہیں۔ ان عظیم المرتبت فلسفیوں کی زندگی اس دور میں گذری ہے جب کہ ریاضیات و میکانیات کی ترقی کا ستارہ اوج پر تھا۔ ان علوم کا استخراجی طریقہ ان مفکرین کو ایک کامل طریقہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ ان کی "عقلیت" کا یہی دعویٰ تھا کہ تمام علوم (سائنس) اور خصوصاً علوم فطریہ کو ریاضیات کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اقلیدس پر غور کرو۔ یہ ایک عقلی و برہانی علم ہے جس کا استخراج چند اصول مسلمہ سے ہوتا ہے۔ یہاں ہم چند اصول متعارفہ و تعریفات سے شروع کرتے ہیں اور تمام قضایا کا

ان ہی سے استخراج کرتے ہیں۔ علم اسی وقت حکیمانہ یا حقیقی علم کہلاتا ہے جب اس کا انتاج چند اساسی اصول سے ہوتا ہے۔ تمام علوم کو یہی ریاضیاتی طریقہ استعمال کرنا چاہئے۔

ڈیکارٹ اور ہابس کا اسی بنیادی مفروضہ پر اتفاق ہے؛ اسپنوزا نے اس کو اپنی اخلاقیات پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ لائبنز نے چند تقییدات کی تحت اس کو قبول کیا۔

"ڈیکارٹ کی عقلیت"

ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء) نے کوئی تفصیلی نظریہ علم پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تاہم جو فلسفیانہ پوزیشن اس نے اختیار کیا تھا اس نے بعد میں آنے والے مفکرین کو کافی متاثر کیا۔ افلاطون کی طرح اس لئے بھی حواس علم کی ضد ہیں، انہیں محض دہوکہ اور التباس سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہئے۔ وہ وہبی 'تصورات' کے وجود کو مانتا ہے۔ لیکن اس کے وہ معنی نہیں لیتا جو افلاطون نے لئے تھے۔ وہ افلاطون کی طرح اس چیز کا قائل نہیں کہ اس زندگی کے پہلے روح نے تصورات کا مشاہدہ کیا تھا اور ان ہی کی یاد پر حقیقی علم مشتمل ہوتا ہے۔ ڈیکارٹ نے تمام ذہنی حالات کو تین قسم کے تصورات میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) وہبی تصورات

(۲) وہ تصورات جو خارج سے ماخوذ و مستفاد ہیں (محسوسات)

(۳) وہ تصورات جو ذہن کے آفریدہ ہیں مثلاً شاعرانہ تخیلات

علاوہ محسوسات و شاعرانہ تخیلات کے ڈیکارٹ وہبی تصورات کو مانتا ہے جو نہ خارج سے ماخوذ و مستفاد ہیں اور نہ ذہن کے آفریدہ ہیں بلکہ خود روح کی فطرت و جبلت میں ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں اور انہیں تجربہ کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دیکھو ریاضیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً تعریفات اور اصول متعارفہ سے اقلیدس کی ابتدا ہوتی ہے ان کی صداقت مشاہدہ اور ادراک پر مبنی نہیں ہوتی۔ یہ تعریفات ایسے تصورات پر مشتمل ہوتی ہیں جنہیں فہم انسانی غیر مشروط طریقہ پر مان لیتی ہے، تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ مثلاً جب ذہن دائرہ یا مماس کی تعریف کرتا ہے تو وہ ادراک حسی کے زیر ہدایت نہیں کرتا، کیونکہ خارجی دنیا میں کامل دائرہ کا وجود ہی نہیں پایا جاتا جس کا ادراک ہوسکے۔ لہذا اصول متعارفہ وہ قضایا ہیں جن کی تصدیق تجربہ سے نہیں کی جاتی بلکہ عقل جوں ہی ان کو سمجھ لیتی ہے ان کے بدیہی ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

اب حقیقی علم ہمیشہ یہی صورت اختیار کرتا ہے۔ طبیعیات کے متعلق یہ بات خصوصیت کے ساتھ صحیح ہے جو بالآخر ریاضیات کی ایک شاخ ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ ڈیکارٹ کا فلسفہ دراصل ایک ایسا نظامِ فکر ہے جو خالص ریاضیاتی طبیعیات کے امکان کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ جسم کی ماہیئت امتداد قرار دیتا ہے۔ "جسم ایک ممتد شئی ہے" یہ ایک ریاضیاتی تعریف ہے جو زاویہ یا دائرہ کی تعریف کے مانند ہے۔ یہی بات ذہن کی تعریف کے متعلق صحیح ہے کہ "ذہن ذی فکر شئے ہے" ان تعریفات کے بعد ڈیکارٹ اُصول متعارفہ کا اضافہ کرتا ہے مثلاً اصول بقائے توانائی کہ حرکت کی مقدار ناقابل تغیر ہے، یا اصول بقائے جوہر کہ مادہ کی مقدار میں نہ زیادتی ہوسکتی ہے نہ کمی۔ ایسی ہی تعریفات واصول متعارفہ کی بنیاد پر نیچرل سائنس (علوم فطری) میکانیات کے ایک عقلی نظام کے طور پر تعمیر پاتی ہے۔ اور حواس کی یہاں وہی قیمت ہے جو اقلیدس میں اس کی ہوتی ہے۔ وہ تصورات و قضایا کی تشکیل کے لئے ابتدائی تہیج کا کام دیتا ہے لیکن عقلی برہان ہی سے حقیقی و کامل علم کی تشکیل ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قضایا کے ایسے نظام میں جس کا ارتقا باطنی طور پر ہوا ہے، اور حقیقت خارجیہ میں کس طرح تطابق پیدا ہوسکتا ہے؟ ڈیکارٹ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ تعریفات ریاضیاتی تعقلات کے مانند ہیں جو بذاتِ خود صائب ہوتے ہیں اور تجربہ کی تصدیق کے محتاج نہیں۔ اپنے اسی خیال کو اس نے ایک قضیہ کلیہ کی شکل میں اس طرح ادا کیا ہے۔ "جس شئے کا میں غایت وضاحت و صفائی کے ساتھ تصور کرتا ہوں وہ صحیح ہوتی ہے۔" ہر تصور جو واضح و غیر مشتبہ ہو صائب ہے اور اس کا قابل تصور ہونا ہی اس کے صائب ہونے کی ضمانت ہے اس قضیہ سے اس کے ریاضیاتی ماخذ کا کھلا ثبوت ملتا ہے[۵]۔

اسی ریاضیاتی طریقہ کا استعمال اسپنوزا (۱۶۳۲ء تا ۱۶۷۷ء) نے اپنے فلسفیانہ نظام میں نہایت توافق کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی مخلّد الذکر تصنیف "اخلاقیات" کہلاتی ہے جسمیں ریاضیاتی طریقہ کا نہایت سختی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ تمام علوم، مابعد الطبیعیات، طبیعیات، علمیات، نفسیات، اخلاقیات جسمیں بیان کیا ہے کے اساسی تصورات داخل ہیں — ان تمام پر اقلیدس کے طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ ہر کتاب کا آغاز تعریفات واصول متعارفہ سے ہوتا ہے، پھر قضایا، ثبوت، تعریفات، حواشی آتے ہیں۔ اسپنوزا کا سارا فلسفہ ضروری قضایا کا ایک نظام ہے جو ضروری تعقلات و اصول متعارفہ سے متخرج ہوا ہے۔ یہاں خطا و ریب کی گنجائش نہیں۔

[۵] دیکھو فریڈرش پالسن کی کتاب مقدمۂ فلسفہ (انگریزی) صفحہ ۳۸۲ و ۳۸۳۔ اس کتاب کا ترجمہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ہو رہا ہے۔

چنانچہ اسپنوزا کہتا ہے۔

"اب بھی اگر کوئی ایسا شک باقی رہ گیا ہو جو ہماری ابتدائی صداقت اور ان تمام استخراجات پر شک کرتا ہو جو ہم نے اس صداقت کو معیار قرار دے کر حاصل کئے ہیں تو یا تو اس کی حجت خلوص و ایمانداری پر مبنی نہ ہوگی یا پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ بعض ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو یا تو مادر زاد اندھے ہوتے ہیں یا خطاء فہمی کی وجہ نابینا ہو گئے ہیں ...... ایسے لوگوں سے ہمیں علوم کا تذکرہ ہی نہیں کرنا چاہئے.... جب وہ انکار کرتے یا تسلیم کرتے یا تردید کرتے ہیں تو انہیں معلوم تک نہیں ہوتا کہ وہ انکار کر رہے ہیں یا تسلیم کر رہے ہیں یا تردید کر رہے ہیں، انہیں خود چلنے والی کلیں سمجھنا چاہئے جو عقل و فہم سے بالکل معرا ہیں" (اخلاقیات)

اس سوال کا جواب کہ اس عقلی نظام میں اور خارجی حقیقت میں تطابق کس طرح پایا جاتا ہے اسپنوزا کی مابعد الطبیعیات دیتی ہے۔ اس کی ابتدا جوہر کی تعریف سے ہوتی ہے جس سے مراد وہ شئی ہے "جو اپنی ذات کے قیام اور تصور میں کسی دوسرے شئی کی محتاج نہیں" وہی اول و آخر ہے، اپنی آپ علت ہے، لامحدود ہے، مطلقاً آزاد ہے، انتہائی حقیقت ہے۔ اس کی صرف دو صفات کا ذہن انسانی کو علم ہوتا ہے گو یہ صفات دراصل نامتناہی ہیں: فکر و امتداد، ان میں متوازیت پائی جاتی ہے، یعنی وہی ایک حقیقت انتہائی یا جوہر اپنا اظہار شئون واحوال کے ایک نظام کے ذریعہ جسم مادی کی دنیا اور فکر کی دنیا میں کر رہا ہے۔ اسی لئے جو ترتیب و نظام تصوری دنیا میں پایا جاتا ہے مادہ و جسم کی دنیا میں بھی موجود ہے (متوازیت) ثانی الذکر دنیا میں جو چیز علت و معلول کہلاتی ہے اوّل الذکر دنیا میں مقدم و تالی، اصل میں دونوں ایک ہیں۔

باقی

غزل

یہ غزل جناب سیمابؔ اکبرآبادی نے جشن یوم جامعہ کے مشاعرہ میں
سنائی تھی جس کے چند منتخب اشعار شائع کئے جا رہے ہیں۔

(ادارہ)

کچھ ہاتھ اُٹھا کے مانگ نہ کچھ آنکھ اُٹھا کے دیکھ
حالِ تباہِ عشق نہ یوں مسکرا کے دیکھ
یہ سرخوشیِ فکر، یہ سرشاریِ خیال
آ، میں دکھاؤں عرش کو چھوتے ہیں کس طرح؟
مشروطِ بہرِ سجدہ نہیں آستانِ غیر
نکلے گا وہ کبھی تو حجابِ مجاز سے

پھر اختیارِ خاطرِ بے مدعا کے دیکھ
تیور بدل نہ جائیں مزاجِ وفا کے دیکھ
کس عالمِ خودی میں ہیں بندے خدا کے دیکھ
ہیں تیرے دل پہ ہاتھ میری التجا کے دیکھ
اپنے ہی در پہ اپنی جبیں آزما کے دیکھ
دہوکا کوئی ادا ہے تو دہوکا بھی کھا کے دیکھ

سُنتے ہیں علم و فن کی وہاں قدر ہے ابھی
سیمابؔ ایک بار دکن تو بھی جا کے دیکھ

سیمابؔ اکبرآبادی

گولکنڈہ کا تمدن

اس چھوٹے سے مضمون میں گولکنڈہ کے وسیع تمدن پر قلم اُٹھانا آسان نہیں ہے گولکنڈہ کی بڑی تاریخ ہے جو دو سو سال کے وسیع زمانہ پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں عروج و زوال کے کئی مد و جزر ہوئے۔ اندرونی اور بیرونی اقوام کا امتزاج ہوا۔ ظاہر ہے کہ تمدن انہیں چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ قطب شاہوں نے اس سرزمین میں جو تمدن پیدا کیا تھا وہ دو سو سالہ کد و کاوش کا نتیجہ تھا۔ اور اس کے بہت سے عناصر تھے اس میں تلنگی زبان کی خدمت اور مقامی روایات کی نگہداشت اور مذہبی رواداری اور رعایا پروری نیز نظم و نسق اور شہر و عمارات کی تعمیر اور انکی آبادی شامل ہے۔ اس میں ہر عنصر کافی بحث اور وضاحت کا طالب ہے۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہر عنصر پر پوری بحث کی جائے صرف ایک سرسری خاکہ پر اکتفا کی جائیگی۔

اگرچہ اس سلطنت کے بانی ایران سے آئے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ایران اور توران کے تمدنی اثرات ضرور آئے ہوں گے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو اس سرزمین کے ساتھ پیوست کر دیا جہاں ان کی حکومت کا علم نصب ہوا تھا یعنی تلنگھانہ کی ایسی وسیع سرزمین کے یہ مالک ہوئے جس کی قومیت اور معاشرت سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے تلنگھانہ کو اپنا گھر بنا لیا اور تلنگی رعایا کو اپنی رعایا سمجھنے لگے۔ اس طرح دو معاشرتوں کا امتزاج ہونے لگا۔ اگرچہ یہ امتزاج قدرتی طور پر خود بخود ہوتا ہے لیکن سلاطین گولکنڈہ نے اس امتزاج کو بہت آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اس میں نہایت درجہ کی دلچسپی لی پہلے دو عہد میں تو یہ امتزاج بہت کم معلوم ہوتا ہے یہ صحیح ہے کہ بانی سلطنت سلطان قلی ہی کی تلنگانہ میں کافی مقبولیت ہو چکی تھی اور اس کو لوگ "بڑے ملک" کے ہر دلعزیز نام سے یاد کرنے لگے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی

شریک سلطنت ہو رہے تھے۔ لیکن ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے جو اس سلطنت کا تیسرا عہد ہے گولکنڈہ کا معاشرتی امتزاج خوب محسوس ہونے لگا۔ ابراہیم گولکنڈہ سے جلاوطن ہو گیا تھا اور اس کی یہ جلاوطنی سات سال تک وجیانگر میں بسر ہوئی تھی۔ اس مدت میں اس کو مغربی تلنگھانہ اور کرناٹک کے تمدنوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اور یہ اثرات اس میں ایسے جذب ہوئے تھے کہ محو نہیں ہو سکتے تھے۔ جب وہ جمشید کے بعد گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا تو اس نے گولکنڈہ کے معاشرہ کو دونوں تمدنوں کے امتزاج کے ساتھ از سر نو ڈھالنے کی کوشش کی خود اس نے تلنگی زبان سیکھی اور اس زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں ہے کہ اس کی سرپرستی میں تلنگی زبان کے کئی شاعر پھولے پھلے اور خوب شاعری کی۔ اور یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس نے تلنگانہ کی عورتوں سے شادیاں بھی کی تھیں۔ ابراہیم کی اولاد تیس کے قریب بتائی جاتی ہے منجملہ ان کے بعض تلنگی عورتوں کے بطن سے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ جو ابراہیم کے بعد تخت نشین ہوا تلنگی معاشرت میں ڈوبا ہوا تھا یہ نہ صرف تلنگی جانتا تھا بلکہ تلنگی زبان کا شاعر بھی تھا۔ اگرچہ اس کا تلنگی دیوان اب دستیاب نہیں ہوتا لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا اس کے اردو اور فارسی کلام سے تلنگی اثرات خوب واضح ہوتے ہیں۔ نہ صرف تلنگی الفاظ ملتے ہیں بلکہ تلنگانہ کے رسم و رواج اور معاشرتی روایات کی ہر جگہ جھلکیاں پائی جاتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اس سرزمین کی قومیت اور معاشرت سے کس قدر شغف تھا۔

یہ امتزاج گولکنڈہ کے آخری زمانہ تک چلتا رہا۔ سلاطین گولکنڈہ نے اہل تلنگانہ کے قومی اور معاشرتی ترقی کے لئے نہایت خوشگوار مواقع بہم پہنچائے تھے۔ مذہبی رواداری سے کام لیا تھا۔ ہندوؤں کے منادر کی نہ صرف نگہداشت ہوتی تھی بلکہ اس کے مصارف کیلئے زمینیں اور جاگیریں وقف کی گئی تھیں۔ اور اب بھی یہ پرانی یادگاریں موجود ہیں اور بعض منادر اپنی ان یادگاروں کے ساتھ سلاطین گولکنڈہ کی عظمت یاد دلاتے ہیں۔ یہ دراصل قطب شاہوں کی قومی تشکیل ہیں اس میں دو متضاد عنصروں کو ملا کر ایک اچھا خوشگوار مرکب تیار کیا تھا۔

قطب شاہوں کے تمدن کا دوسرا شاندار رخ ان کے بلند کردار ہیں اوائل سے ہی جبکہ اس سلطنت کی بنیاد پڑی ہے ان سلاطین نے اپنے بلند اخلاق و عادات کا ثبوت دیا اور ہر مرتبہ اس کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان بلند اخلاق کا اثر اہل ملک پر بھی پڑتا رہا اور شاہی خاندان کے علاوہ خود ملک میں سے کئی شخصیتیں ایسی پیدا ہوئیں

جن کو زمانہ ہمیشہ یاد کرے گا۔ سلطان قلی قطب شاہ اس وقت سے گولکنڈہ کا حکمراں تھا جبکہ محمود شاہ بہمنی نے اس کو تلنگانہ کی صوبہ داری عطا کی تھی۔ جب بہمنیوں کی مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تو خود محمود شاہ کے عہد حکومت میں مختلف صوبہ دار باغی ہو گئے۔ بیجاپور اور احمد نگر کے صوبہ دار خود مختار والی بن گئے مگر سلطان قلی نے محمود شاہ کی زندگی تک خود مختاری کا اعلان نہیں کیا جس کو وہ اپنے مربی کے خلاف بیوفائی سمجھتا تھا اور صوبہ داروں نے تو اس کو ترغیب دی کہ ان کی طرح سلطان قلی بھی خود مختاری کا اعلان کرے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اگر اس نے کبھی اعلان کیا ہے تو سنہ ۹۲۴ھ میں کیا جبکہ محمود شاہ کا انتقال ہوا تھا۔ سلطان قلی کی بنائی ہوئی مسجد صفا جو ۹۲۴ھ میں تیار ہوئی ہے اس کا بین ثبوت ہے۔ اس میں جو کتبہ لکھا گیا تھا وہ اب تک موجود ہے اور اس میں پہلے سلطان محمود شاہ بہمنی کا نام ہے تو اس کے بعد سلطان قلی کا نام پایا جاتا ہے اور یہ اس بات کا اظہار تھا کہ گولکنڈہ اور اس کا والی محمود شاہ بہمنی کا ماتحت صوبہ دار ہے اور کتبہ میں محمود شاہ کو خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کے الفاظ میں دعا دی گئی۔ اس کے علاوہ سلطان قلی کی وفاداری کا بڑا واقعہ اس کی شاہی خدمت ہی ہے آخری زمانہ میں محمود شاہ بریدیوں کے ہاتھ میں جکڑ گیا تھا اور ناحق شناس برید نے اس کو محل میں بند کر کے ضروریات سے بھی محتاج کر دیا تھا۔ سلطان قلی تنہا اس آڑے وقت میں کام آتا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ راز میں پانچ ہزار ہون محمود شاہ کی ضروریات کے لئے برابر بھیجتا تھا تاکہ وہ اپنے مربی کی کچھ خدمت کر سکے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تمام صوبہ داروں میں سلطان قلی تنہا آدمی تھا جس نے نمک کا پورا پاس و لحاظ رکھا تھا۔

یہ بلند اخلاق مختلف شکلوں میں پورے دو سو سالہ دور میں پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس سلطنت کے آخری زمانے میں بھی بلند اخلاق و عادات کے مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے آتے تھے اگرچہ آخری زمانہ قطب شاہوں کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں ان کی پچھلی شان و شوکت باقی نہ ہو۔ قوت مدافعت بھی کمزور ہو لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس گرتی ہوئی حالت میں بھی قطب شاہوں نے اپنے بلند کردار کا پورا ثبوت دیا۔ ابو الحسن قطب شاہ کی الوالعزمی سب کو معلوم ہے کہ قلعہ ختم ہونے کے بعد کس طرح اس نے ہمت و اطمینان قلب کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا جس طرح یہ دنیا کا بڑا محاصرہ تھا اسی طرح اس کی اخلاقی مدافعت غیر معمولی تھی اور صرف اخلاقی مظاہرہ سے جو محاصرہ کے دوران میں اور اس کے بعد ظاہر ہوئے اس محاصرہ کی عظمت بہت بڑھ جاتی ہے جب رات کی تاریکی میں مغل حملہ آور قلعہ کے اندر داخل ہو گئے اور اہل قلعہ میں چو طرف پریشانی پھیل گئی تو ابو الحسن ذرا برابر متفکر اور پریشان

نہیں ہوا بلکہ اپنے محل کی تمام عورتوں کو دلاسا دیا اور جب روح اللہ خان اور اعتبار خان اس کو گرفتار کرنے کے لئے آئے تو ان سے نہایت خاطر جمعی سے گفتگو کی۔ اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس دوران میں کھانے کا وقت آیا تو پورے اطمینان کے ساتھ کھانے میں شرکت کی گئی۔ اور اپنی تمام ضروریات سے فارغ ہو کر شہنشاہ کے پاس گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس قدر خاطر جمع کیوں ہیں۔ اس نے کہا کہ پریشان ہونے کی کیا بات ہے یہ قدرت کا فیصلہ ہے۔ اس کے سامنے ہر شخص کو سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔ ان اخلاق کا اثر اس سلطنت کے عمائد پر بھی تھا۔ اگرچہ محاصرہ کے دوران میں اکثر فوجی افسر باغی ہو گئے اور مغلوں سے مل گئے لیکن بعض ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے آخر دم تک انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا گولکنڈہ کے محاصرہ اور قطب شاہی تاریخ کے ساتھ عبدالرزاق لاری کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ اُس کو مغل فوج کی طرف سے بارہا لالچیں دی گئیں لیکن وہ کبھی دام میں نہیں آیا اور جب حملہ آور قلعہ میں گھس آرے تو اس نے دیوانہ وار ان کا مقابلہ کیا اور جان جوکھم میں ڈال کر جس قدر ہو سکا مدافعت کی۔ ظاہر ہے کہ ایک آدمی مغل فوج کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنا جذبہ وفاداری پورا کر کے دکھایا یہاں تک زخموں میں چور ہو کر بیہوش ہو گیا۔ جب تک اس کے ہوش و حواس برجا تھے "تا جان دارم نثار راہِ ابوالحسن فدایم کرد" کی آواز دور دور تک سُنائی دیتی تھی صحتیاب ہونے کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب نے اس کو مغل ملازمت میں داخل کرنا چاہا لیکن گولکنڈہ کے اس وفادار ملازم نے ہمیشہ انکار کیا۔

قطب شاہوں کے تمدن کا دوسرا پہلو ان کے بنائے ہوئے شہر و عمارات ہیں۔ اس خصوص میں قطب شاہوں کا بہت بڑا سرمایہ ہے جو اور جگہ بہت مشکل سے پایا جاتا ہے۔ قطب شاہی شہر و عمارات سے ان کی الوالعزمی۔ بلند خیالی اور پاکیزہ ذوق کا ہر جگہ پتہ چلتا ہے۔ سنہ ۱۰۰۰ھ تک قلعہ گولکنڈہ اور اس کا حصار ان کی شہری اور تمدنی ضروریات پوری کرتا تھا لیکن محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جب یہ سلطنت پھیلی تو ایک علیحدہ وسیع شہر کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ قطب شاہی خاندان کے جلیل القدر حکمران محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۰ھ میں شہر بھاگ نگر یا حیدرآباد کی بنیاد رکھی جس کی عمرانی فضا سے ہم اب تک فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ جس سلیقہ سے اس شہر کی تاسیس ہوئی تھی وہ قرون وسطیٰ میں حیرت انگیز چیز تھی۔ یعنی زمانہ حال کے نمونہ کے مطابق جس طرح پیرس اور برلن کے شہر ہیں بیچ میں ایک بڑی عمارت قائم کی گئی اور اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ شہر حیدرآباد قدرتی پیداوار نہیں ہے بلکہ

اس کی خوشنما تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ارادہ اور خاص سلیقہ مضمر تھا۔ قرون وسطیٰ میں ایسا کوئی شہر نہیں بنا تھا۔ نیز اس میں اہل شہر کی تمام عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں۔ مساجد اور حمام جو محمد قلی کے اعلیٰ تمدن کی یادگار ہیں تیار کی گئیں۔ بیماروں کے لئے دار الشفاء کے نام سے ایک بہت بڑا ہسپتال بنایا گیا جس کی بوسیدہ در و دیوار ابتک موجود ہیں۔ آبرسانی کے لئے نہریں بنائی گئیں تاکہ اہل شہر کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔

شہر کے ساتھ اندر اور باہر جو عمارتیں بنائی گئی تھیں ان پر ایک جداگانہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ عدل گستری کے لئے ایک عظیم الشان عمارت داد محل کے نام سے بنائی گئی تھی جس کی تعمیری حسن کاری اور شان و شوکت کو دیکھ کر لوگ مبہوت ہو جاتے تھے اس کے پاس سات منزلہ ایک اور محل بنایا گیا تھا جس کا نام خداداد محل تھا اس کی عظمت اور محلوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ندی کے کنارے بھی خوش وضع محل بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ کئی باغ جن کے نام "باغ دلکشا" اور "باغ محمد شاہی" ہیں اور ان کے آثار ابتک پائے جاتے ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اور عمارتیں بنیں۔ اگرچہ اس کے عہد کی یادگار۔ مکہ مسجد کی سی قوی ہیکل عمارت ہے لیکن اس کے علاوہ سرور نگر اور اس کے آثار بھی موجود تھے۔ نیز اس کے عہد میں اور عمارتیں اور محلات بنے تھے جن کی مورخ بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اور باہر کے سیاحوں نے ان کی خوب داد دی۔ ان عمارتوں کی وجہ سے شہر حیدرآباد کی رونق بہت بڑھ گئی تھی اور وہ اپنے ابتدائی زمانہ میں بھی دنیا کے بارونق شہروں میں تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ہندوستان کے شہنشاہی شہر اس کے سامنے بے رونق ہو گئے۔ حضرت مومن استرابادی نے جو محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے وزیر اعظم تھے اس شہر کی تعریف میں کہا تھا۔

حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوے — چوں صفاہان تو شد از شاہجہاں عباس شاہ

لیکن حیدرآباد کی تعریف گھر والوں سے زیادہ بیرونی مورخوں کی زبان سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کی تعریف باہر کے لوگوں نے اور خاص طور پر مغل مورخوں نے زیادہ کی ہے۔ حیدرآباد کا شہر مورخ فرشتہ کے عہد میں بنا تھا اور وہ آگرہ اور لاہور جیسے شہنشاہی شہروں سے بھی واقف تھا اس واقفیت کے باوجود فرشتہ یہ کہتا تھا کہ ایسا شہر "در تمامی ہندوستان یافت نمی شود" مغل مورخوں نے اس سے زیادہ تعریف کی ہے محمد ساقی جو اورنگ زیب کا خاص مورخ تھا اس شہر کو "راحت جسم و آرام جان" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ کسی شہر کی اس سے زیادہ تعریف نہیں ہو سکتی اور یہ ان لوگوں کی تعریف تھی جو اس کو فتح کرنے کے لئے آئے تھے

عبدالمجید صدیقی ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ریڈر شعبہ تاریخ

موجودہ جنگ اور صنعتی جھگڑے[1]

قیمتوں کی گرانی اعلان جنگ کے ساتھ ہی اکثر اجناس اور مصنوعات کی قیمتوں میں بہ سرعت اضافہ شروع ہوا اور بحیثیت مجموعی مختلف مقامات میں ٹھوک قیمتوں کے اشاری اعداد بڑھنے لگے۔ اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں کلکتہ کی ٹھوک قیمتوں کا اشاری عدد ۱۰۰ تھا، ستمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۱۴ ہوگیا۔ اکٹوبر اور نومبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں علی الترتیب ۱۱۸، ۱۳۱ اور ۱۳۷ رہا۔ گویا اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مقابل ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں کوئی ۳۷ درجوں کی زیادتی ہوئی۔

اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں بمبئی کی ٹھوک قیمتوں کا اشاری عدد ۱۰۳ تھا۔ ستمبر، اکٹوبر، نومبر اور ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں بڑھتے ہوئے علی الترتیب ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۳۳ اور ۱۳۵ ہوگیا۔ اس طرح اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مقابل ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۳۲ درجوں کا اضافہ ہوا۔

کراچی کی ٹھوک قیمتوں کا اشاری عدد، اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۰۴ تھا، ستمبر میں ۱۰۹ ہوا، اکٹوبر میں ۱۱۱، نومبر میں ۱۱۳ اور ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۲۱ ہوگیا۔ یعنی اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مقابل ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۷ درجوں کی زیادتی رہی۔

بحیثیت مجموعی کل ہند ٹھوک قیمتوں کے اشاری اعداد[3] میں بھی زیادتی رہی۔ اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں کل ہند ٹھوک قیمتوں کی سطح ۱۳۵ تھی۔ ستمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۴۲ ہوگئی۔ اکٹوبر میں ۱۵۲، نومبر میں ۱۶۲ اور ڈسمبر میں ۱۸۱ رہی اس طرح اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مقابل ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۴۶ درجوں کا اضافہ ہوا[3]۔

[1] اس مضمون کی تیاری میں انڈین ٹریڈ جرنل (ہفتہ وار) اور بزنس کنڈیشنس ان انڈیا کے مختلف پرچوں سے مدد لی گئی ہے۔

[2] کلکتہ، بمبئی اور کراچی کی ٹھوک قیمتوں کے اشاری اعداد جولائی ۱۹۱۴ء کی بنیادی سطح = ۱۰۰ پر مبنی ہیں اور کل ہند ٹھوک قیمتوں کے اشاری اعداد کی مطابقت ۱۸۷۳ء کی بنیادی سطح = ۱۰۰ سے ہے۔

[3] ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء کے بعد سے قیمتیں گرنا شروع ہوئی ہیں۔

مصارف رہائش کی زیادتی قیمتوں کی گرانی کی وجہ سے مصارف رہائش[1] میں بھی اضافہ ہوگیا۔ جنگ سے قبل یعنی اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں بمبئی کے مزدور طبقہ کے مصارف رہائش کا اشاری عدد ۱۰۵ تھا۔ ستمبر میں ۱۰۶، اکٹوبر میں ۱۰۸ نومبر میں ۱۰۹ اور ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۱۳ ہوگیا۔

اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں احمد آباد کے مزدور طبقہ کے مصارف رہائش کا اشاری عدد ۷۳ تھا۔ ستمبر، اکٹوبر اور نومبر میں علی الترتیب ۷۶، ۷۵ اور ۸۱ سے گذرتے ہوئے ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۸۴ ہوگیا۔

شولاپور کا اشاری عدد بھی اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء ۷۳ تھا۔ ستمبر میں اسی طرح برقرار رہا۔ اکٹوبر میں بڑھکر ۷۵ ہوگیا۔ نومبر میں ۷۹ اور ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۸۳ ہوگیا۔

ناگپور کے اشاری عدد میں، اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مقابل ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں کوئی دس درجوں کا اضافہ ہوا۔ اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں یہ عدد ۶۴ تھا ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۷۴ ہوگیا۔ ستمبر، اکٹوبر اور نومبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں اس کی سطح بالترتیب ۶۴، ۶۳ اور ۶۷ رہی۔

جبلپور کا اشاری عدد اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۵۸ تھا۔ بعد کے مہینوں یعنی ستمبر، اکٹوبر اور نومبر میں علی الترتیب ۶۲، ۶۱ اور ۶۲ سے ہوتے ہوئے ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۶۹ ہوگیا۔ بعض دیگر مقامات کے اعداد حسب ذیل ہیں:۔

مزدوروں کے مصارف رہائش کے اشاری اعداد

مقام	اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء	ستمبر ۴۰-۱۹۳۹ء	اکٹوبر ۴۰-۱۹۳۹ء	نومبر ۴۰-۱۹۳۹ء	ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء
پٹنہ[2]	۱۰۹	۱۰۹	۱۱۲	۱۱۶	۱۲۴
مظفرپور	۱۰۵	۱۰۶	۱۱۰	۱۰۹	۱۰۹
مونگھیر	۱۱۴	۱۱۶	۱۱۷	۱۱۸	۱۱۲
جمشید پور	۱۰۸	۱۱۱	۱۱۵	۱۱۶	۱۱۷

[1] یہاں پر صرف مزدور طبقہ کے مصارف رہائش کے اعداد پیش کئے گئے ہیں ۔ [2] واضح رہے کہ بمبئی کے اشاری اعداد جون ۱۹۳۹ء، احمد آباد کے جولائی ۱۹۲۷ء شولاپور کے جنوری ۱۹۲۸ء، جبلپور اور ناگپور کے جنوری ۱۹۲۷ء کی بنیادی سطح = ۱۰۰ پر مبنی ہیں۔ پٹنہ، مظفرپور، مونگھیر، جمشید پور، جھاریا، کٹک اور رانچی کے اعداد ۱۹۱۴ء کے پچھلے پانچ سالوں کے اوسط مصارف کی سطح = ۱۰۰ پر مبنی ہیں۔ مدراس کے اعداد جون ۱۹۳۶ء اور لاہور کے ۳۵-۱۹۳۱ء کی سطح = ۱۰۰ پر مبنی ہیں۔

مقام	اگسٹ ۴۰-۱۹۳۹ء	ستمبر ۴۰-۱۹۳۹ء	اکٹوبر ۴۰-۱۹۳۹ء	نومبر ۴۰-۱۹۳۹ء	ڈسمبر ۴۰-۱۹۳۹ء
جہاریا	۱۲۱	۱۲۹	۱۲۷	۱۲۳	۱۲۰
کٹک	۱۰۳	۱۱۲	۱۱۲	۱۱۷	۱۱۷
رانچی	۱۰۷	۱۱۱	۱۱۱	۹۹	۹۷
مدراس	۹۸	۱۰۳	۱۰۴	۱۰۵	۱۰۸
لاہور	۱۲۰	۱۲۳	۱۲۵	۱۴۷	۱۴۷

جھگڑوں کی بنیاد مذکورہ اعداد سے واضح ہے کہ قیمتوں کی زیادتی کے ساتھ مختلف مقامات میں مصارف رہائش بھی بڑھنے لگے۔ ان حالات کے تحت مزدوروں کی جانب سے اضافہ اجرت کے مطالبات کا پیش ہونا لازمی تھا۔ ہر طرف سے زائد اجرتوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آجر اپنے عذرات پیش کرنے لگے کشمکش شروع ہوئی اور جھگڑے عام ہو گئے۔ آجروں اور مزدوروں کے خیالات کا تضاد اور کسی معقول سمجھوتے پر نہ پہنچنا ہی درحقیقت جھگڑوں اور ہڑتالوں کی بنیاد ہے۔

جھگڑوں کی وسعت ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء پر ختم ہونے والے پہلے ربع سال میں جملہ جھگڑوں کی تعداد ۱۰۵ رہی۔ ۸۸ ہزار سے زائد مزدور شریک تھے اور آٹھ لاکھ سے زائد دن خراب ہوئے۔

۳۰ جون ۱۹۳۹ء پر ختم ہونے والے دوسرے ربع سال میں دو ہڑتالیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک آسام آئیل کمپنی (آسام) اور دوسرے وکٹوریہ ملز (کانپور) کے مزدوروں کی۔ پہلی ہڑتال میں ۱۰ ہزار مزدوروں نے حصہ لیا اور ۷ لاکھ سے زائد دن ضائع گئے۔ دوسری میں ۴ ہزار سے زائد مزدور شریک رہے اور ایک لاکھ سے زائد دن خراب ہوئے۔ اس ربع کے جملہ جھگڑوں کی تعداد ۱۰۹ رہی۔ ۹۴ ہزار سے زائد مزدور شریک تھے اور ۱۵ لاکھ سے زائد دن ضایع ہوئے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء پر ختم ہونے والے تیسرے ربع سال میں جملہ جھگڑوں کی تعداد ۱۱۲ تھی۔ ۹۸ ہزار سے زائد مزدور شریک تھے اور ۱۷ لاکھ سے زائد دن خراب ہوے۔ اس ربع کی اہم ہڑتالوں میں (۱) آسام آئیل کمپنی، آسام (۲) موہنی مل بنگال (۳) ہندو وکٹوریہ ملز، صوبہ جات متحدہ اور

(۴) فیروزآباد (صوبہ جات متحدہ) کے ۲۳ چوڑی کے کارخانوں کی ہڑتالوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ پہلی میں ۱۰ ہزار سے زائد مزدور حصہ لئے اور ۵ لاکھ سے زائد دن خراب ہوئے دوسری میں ۲ ہزار سے زائد مزدوروں نے حصہ لیا اور ۱۴ لاکھ سے زائد دن ضایع گئے۔ تیسری میں تین ہزار سے زاید مزدور شریک تھے اور ۱۸ لاکھ سے زائد دن تلف ہوئے۔ چوتھی میں ۸ ہزار مزدور شریک تھے اور ۲۶ لاکھ سے زائد دن خراب ہوئے۔

۳۱ ڈسمبر ۱۹۳۹ء پر ختم ہونے والے چوتھے ربع سال میں جملہ جھگڑوں کی تعداد ۱۱۰ تھی۔ ۱۶ لاکھ سے زائد مزدور شریک تھے اور ۸ لاکھ سے زائد دن تلف ہوئے۔ اس ربع کی ہڑتالوں میں صرف کانپور ملز کی عام ہڑتال قابل ذکر ہے۔ اس میں ۲۹ ہزار سے زائد مزدور شریک تھے اور دو لاکھ سے زائد دن خراب ہوئے۔

اگر ہم گذشتہ سالوں کی ہڑتالوں سے سال ۴۰-۱۹۳۹ء کی ہڑتالوں کا مقابلہ کریں تو زیر بحث سال میں ہڑتالوں کی تعداد زیادہ نظر آئیگی۔ ۱۹۳۲ء میں جملہ ۱۲۹ ہڑتالیں ہوئی تھیں ۱۹۳۳ء میں ۱۵۹، ۱۹۳۴ء میں ۱۴۷، ۱۹۳۵ء میں ۱۵۳ اور ۱۹۳۶ء میں ۱۸۳ ہوئیں۔ کاروباری سرگرمی کے ساتھ ساتھ ہڑتالوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ سالہائے ماسبق کے مقابل ۱۹۳۹ء میں جملہ جھگڑوں کی تعداد ۴۳۶ رہی۔ ۱۹۳۹ء سے قبل والے سات سالوں میں جھگڑوں کا اوسط ۲۳۷ رہا ہے۔ اس اوسط سے سال زیر بحث کے جھگڑوں کی تعداد تقریباً ۸۴ فی صد زیادہ ہے۔ یہ زیادتی کاروباری سرگرمی اور آجروں و مزدوروں کی انتہائی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

سال ۱۹۴۰ء کے پہلے ربع میں جھگڑوں کی تعداد اور زیادہ ہو گئی۔ جملہ ۱۲۸ جھگڑے ہوئے جب کہ ۱۹۳۹ء کے اسی ربع میں جملہ جھگڑوں کی تعداد صرف ۱۰۵ تھی۔ تقابل سے اضافہ کا رجحان نمایاں نظر آئیگا۔ اس ربع کی ہڑتالوں میں تین قابل ذکر ہیں (۱) ڈیکس واری کاٹن مل، ڈھاکہ (۲) کلکتہ کارپوریشن (۳) بمبئی کاٹن ٹکسٹائل ملز۔ پہلی ہڑتال میں ۴ ہزار سے زائد مزدور حصہ لئے اور ایک لاکھ سے زائد دن خراب ہوئے دوسری میں ۲۰ ہزار سے زاید مزدور شریک رہے اور ایک لاکھ سے زائد دن تلف ہوئے۔

تیسری میں ایک لاکھ ۵۶ ہزار سے زائد مزدور مشغول رہے اور ۳۱ لاکھ سے زائد دن ضائع ہوئے۔ جھگڑوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

جھگڑوں کی تقسیم ان جھگڑوں کی تقسیم دو طرح پر کی جاسکتی ہے (الف) بلحاظ کارخانہ جات (ب) بلحاظ مطالبات۔ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا ختم مارچ سنہ ۱۹۴۰ء جھگڑوں کی تفصیلی کیفیت بلحاظ کارخانہ جات حسب ذیل جدول میں پیش کی گئی ہے:-

کارخانے	سنہ ۱۹۳۹ء جنوری تا مارچ	اپریل تا جون	جولائی تا ستمبر	اکٹوبر تا ڈسمبر	سنہ ۱۹۴۰ء جنوری تا مارچ	جملہ
روئی اور اون کی گرنیاں	۴۲	۳۳	۳۸	۲۳	۴۷	۱۸۳
جوٹ کی گرنیاں	۶	۱۰	۱۱	۲۷	۵	۵۹
انجنیرنگ ورک شاپس	۱۳	۷	۶	۶	۱۰	۴۲
ریلوے بشمول ریلوے ورک شاپس	۱	-	۱	-	۱	۳
کان	۳	۱	-	۳	۳	۱۰
متفرق	۴۰	۵۸	۵۶	۵۱	۶۲	۲۶۷
جملہ	۱۰۵	۱۰۹	۱۱۲	۱۱۰	۱۲۸	۵۶۴

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء جملہ جھگڑوں کی تعداد ۵۶۴ رہی ہے۔ روئی اور اُون کی گرنیوں میں جھگڑوں کی تعداد مقابلتاً زیادہ رہی۔ دوسرا اور تیسرا نمبر جوٹ کی گرنیوں اور انجنرنگ ورک شاپس کا رہا ہے۔

جہاں تک کہ مطالبات کا تعلق ہے جھگڑوں کی زیادہ تعداد اضافہ اجرت کے لئے رہی ہے۔ بونس، رخصت اور اوقاتِ کار میں تخفیف وغیرہ کے لئے بھی مختلف جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔

تفصیلی اعداد حسب ذیل ہیں:-

جھگڑوں کے اسباب	سنہ ۱۹۳۹ء جنوری تا مارچ	اپریل تا جون	جولائی تا ستمبر	اکٹوبر تا ڈسمبر	سنہ ۱۹۴۰ء جنوری تا مارچ	جملہ
اضافہ اُجرت	۴۶	۵۹	۵۲	۸۳	۸۴	۳۲۴
بونس	۱	-	-	۱	۸	۱۰
ذاتی	۳۰	۱۵	۲۶	۱۳	۱۸	۱۰۲
رخصت یا گھنٹوں کی تخفیف	۴	۳	۳	۳	۱	۱۴
متفرق	۲۴	۳۲	۳۱	۱۰	۱۷	۱۱۴
جملہ	۱۰۵	۱۰۹	۱۱۲	۱۱۰	۱۲۸	۵۶۴

جھگڑوں کے اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت اضافہ اُجرت کو حاصل رہی ہے۔ جملہ ۵۶۴ جھگڑوں میں ۳۲۴ یعنی ۵۷ فی صد اضافہ اجرت سے متعلق ہیں۔ بالخصوص اکٹوبر سنہ ۱۹۳۹ء تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء اضافہ اجرت کے لئے جھگڑوں کی تعداد مقابلتاً بہت زیادہ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ستمبر میں جنگ کا اعلان ہوا۔ قیمتیں بہ سرعت بڑھنا شروع ہوئیں۔ کاروباری سرگرمی بڑھ گئی۔ لہذا اضافہ اُجرت کے لئے مطالبات کا پیش ہونا لازمی امر تھا۔

جھگڑوں کے نتائج جھگڑوں کے نتائج کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کامیاب نتائج۔ جزوی کامیاب اور ناکام۔ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا ختم مارچ سنہ ۱۹۳۹ء جملہ جھگڑوں کی تعداد ۱۰۵ تھی۔ گیارہ جھگڑے جاری تھے اور ۹۴ ختم ہو چکے تھے۔ ۹۴ جھگڑوں میں ۱۴ کامیاب رہے یعنی مزدوروں کو اپنے مطالبات منوانے میں پوری کامیابی رہی۔ ۳۶ جزوی کامیاب اور ۴۴ ناکام۔

اپریل سنہ ۱۹۳۹ء تا ختم جون سنہ ۱۹۳۹ء جملہ جھگڑوں کی تعداد ۱۰۹ تھی۔ جس میں گیارہ جھگڑے جاری تھے۔

اور ۹۸ ختم ہو چکے تھے ۔ ۹۸ میں ۱۹ کامیاب، ۴۲ جزوی کامیاب اور ۳۷ ناکام رہے ۔

جولائی سنہ ۱۹۳۹ء تا ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء جملہ ۱۱۲ جھگڑے ہوئے ۔ ۸ جاری تھے ۔ اور ۱۰۴ ختم ہو چکے تھے ۔ ۱۰۴ میں ۱۷ کامیاب، ۴۳ جزوی کامیاب اور ۴۴ ناکام رہے ۔

اکٹوبر سنہ ۱۹۳۹ء تا ڈسمبر سنہ ۱۹۳۹ء جملہ جھگڑے ۱۱۰ رہے ۔ ۹۶ ختم ہو چکے تھے اور ۱۴ جاری تھے ۔ اس میں ۶۰ ناکام رہے کامیاب جھگڑوں کی تعداد ۱۳ تھی اور ۲۳ جزوی کامیاب تھے ۔

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء جملہ جھگڑے ۱۲۸ تھے ۔ گیارہ جاری تھے ۔ باقی ۱۱۷ میں ۲۳ کامیاب، ۳۹ جزوی کامیاب اور ۵۵ ناکام رہے ۔

بحیثیت مجموعی جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء جملہ ۴۱۳ جھگڑے ہوئے (۱۵۱ جاری جھگڑوں کا شمار نہیں کیا گیا ہے) ان میں سے ۷۳، کامیاب رہے ۔ ۱۶۰ جزوی کامیاب اور ۱۸۰ ناکام ۔

واضح رہے کہ گرم بازاری کے زمانہ میں نہ صرف جھگڑوں کی تعداد زیادہ رہتی ہے بلکہ کامیاب نتائج کی تعداد بھی انہی دنوں میں مقابلتاً زیادہ ہوتی ہے ۔ دوران جنگ مزدوروں کو بالعموم کامیابی رہی ہے خواہ وہ کلی حیثیت سے ہو یا جزوی لحاظ سے ۔

اختتام | ہڑتال، اس میں شک نہیں کہ مطالبات منوانے کا اہم ذریعہ ہے لیکن اس وقت تک ہڑتال نہ کی جانی چاہئے جب تک کہ مطالبات جائز اور معقول نہ ہوں ۔ اور درخواست کے باوجود آجر اس پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے سے انکار کردیں ناعاقبت اندیش لیڈروں کی قیادت میں بے موقع اور بے جا ہڑتال کرنا نہ صرف مزدوروں کے حق میں مضر ہوتا ہے بلکہ آجر بھی خسارہ میں رہتے ہیں ۔ جتنے دن ہڑتال جاری رہے مزدوروں کی قوت پیدا آوری معطل رہتی ہے ۔ انجمن کا مالیہ زیر بار ہوتا ہے ۔ آجر بیکار رہتے ہیں اور اُن کی آمدنی میں کمی ہوتی ہے ۔ پبلک کو تکلیف ہوتی ہے اور پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے قومی نقصان ہوتا ہے بالخصوص گرم بازاری کے زمانے میں ہڑتال بہت مضر ہوتی ہے ۔ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء ہڑتالوں کے سلسلے میں ۸۹ لاکھ سے زائد دن تلف ہو چکے ہیں ۔ تفصیلی اعداد ملاحظہ ہوں :-

مدت	ضائع شدہ ایام
جنوری سنہ ۱۹۳۹ء تا مارچ سنہ ۱۹۳۹ء	۸۰۳۲۵۱
اپریل " " جون "	۱۵۷۹۷۱۸
جولائی " " ستمبر "	۱۷۸۵۸۶۰
اکٹوبر " " ڈسمبر "	۸۲۳۹۶۶
جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء	۴۰۰۳۰۱۶
جملہ	۸۹۹۵۸۱۱

اس نقصان کے ذمہ دار اگر ایک طرف مزدور ہیں تو دوسری طرف آجر ۔ کیونکہ بعض وقت مزدوروں کی جانب سے غیر معقول مطالبات پیش ہوتے اور بعض مرتبہ معقول مطالبات پر جائز غور کرنے سے آجر انکار کر دیتے ہیں ۔ کشمکش جاری رہتی ہے اور ہر فریق نقصان میں رہتا ہے ۔ موجودہ صنعتی سرگرمی کے پیش نظر ہڑتال اور دربندی میں مزدوروں اور آجروں کو انتہائی دور اندیشی سے کام لینا چاہئے ۔ خیالات کے تصادم کو جہاں تک ہو سکے باہمی سمجھوتے کے ساتھ ختم کرنا چاہئے ۔ افہام و تفہیم کے معاملات طویل نہ ہوں ۔ حکمۃ طور پر عجلت سے کام لیا جائے ۔ بہ حالات حاضرہ ہندوستان میں صنعتی وسعت کے اچھے مواقع ہیں ۔ موقعہ سے ہر وقت استفادہ اہم ترین اصول ہے ۔

محمد ناصر علی ام ۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبۂ معاشیات

امجد کی رُباعیاں

"یہ مضمون عظیم الدین صاحب محبت کے امتحان
ایم ۔اے کے مقالے کا ایک جزو ہے ۔" "ادارہ"

رباعی شاعری کی مشہور ترین صنف ہے اس میں بے حد زور پنہاں ہوتا ہے ۔ پہلے مصرع میں خیال روشناس کرایا جاتا ہے دوسرے اور تیسرے مصرع میں اس خیال کی نشو و نما ہوتی ہے آخری مصرع پر شاعر کے خیال کا ارتقا ہو جاتا ہے ۔

ایران کے قطع نظر ہندوستان میں سرمد کا مد مقابل کوئی ہو سکتا ہے تو وہ امجد کی لازوال ہستی ہے ۔جب تک اردو زبان رہے گی امجد کا نام زندۂ جاوید رہے گا اور ان کی رباعیاں قوم کے لئے باعث فخر ہوں گی ۔ امجد کا رتبہ شعر و سخن میں تو مسلم ہے ہی مگر انہوں نے الہامی رباعیاں لکھ کر میدانِ ادب میں اپنے نام کا جھنڈا گاڑ دیا ہے ۔تصوف میں ڈوبی ہوئی رباعیاں ان کے ذوقِ عرفان کا پتہ دیتی ہیں ۔ امجد کی رباعیوں میں کہیں دینی رموز پنہاں ہیں تو کہیں دنیوی معاملات ۔ کہیں وحدانیت کی تبلیغ کی گئی ہے تو کہیں دنیا کی بے ثباتی بے نقاب کی گئی ہے ۔ کہیں سرمایہ داری کی عیارانہ فریب کاریوں کو عریاں کر دکھایا ہے تو کہیں مفلسی و غریبی کو سراہا ہے ۔ غرض گم کردۂ منزل کے لئے رباعیاتِ امجد خضرِ راہ بن کر رہبری کا سامان مہیا کرتی ہیں اور انھیں کی ہدایت اور رہنمائی کی روشنی میں ٹوٹے ہوئے دلوں کی مایوس کاوشیں سکون کا آغوش ڈھونڈتی ہیں ۔ امجد کی وجدانی اور عرفانی رباعیاں جنہیں حقائق و معارف کے اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں روح پر نفسیاتی صیقل کا کام کر جاتی ہیں ۔ امجد کی رباعیاں دلوں پر جادو کا سا اثر کرتی ہیں اور سننے والوں کے دماغ میں دیر تک گونجتی رہتی ہیں ان کی رباعیاں سننے کے بعد Shelley کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ :۔

Music when soft voices die
Viberates in the memory ;

اب ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی چند رباعیاں پیش کریں ۔ سب سے پہلے امجد کی اس مشہور رباعی کو درج کرتے ہیں جو تقریباً ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکی ہیں :۔
الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ کی تفسیر اس خوبی سے کی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی ۔ حسبنا اللہ نعم الوکیل کی تفسیر سے منہ موڑ کر مغرور بندوں کے در پر جبہ سائی کرنے والوں سے امجد مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

ہر چیز مُسبّب سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

وحدت الوجود اور ہمہ اوست تصوف کے نہایت اہم مسائل ہیں امجد نے کتنے دل نشین پیرایہ میں ان کو بیان کر دیا ہے ۔

واجب سے ظہور شکل امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ ہر شئے ہمہ اوست
گرداب، حباب، موج سب پانی ہے

لا موجود الا اللہ کی تفسیر دیکھئے کس مستانہ انداز سے بیان فرمائی ہے مضمون کے علاوہ زورِ بیان بھی ملاحظہ ہو ۔

ہیں مستِ مئے شہود، تو بھی میں بھی
ہیں مدعیٔ نمود، تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دُو وجود، تو بھی میں بھی

امجد ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہے تھے امیروں کے طمطراق اور غریبوں کی بیچارگی سے متاثر ہو کر انھوں نے دو رباعیاں قطعہ بند اس طرح لکھی ہیں کہ پہلی رباعی امیر کا خطاب ہے غریبوں سے اور دوسری رباعی غریب کا جواب ہے ۔

دنیا میں، یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں
مردودِ درِ حبیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں، غریب جیتے کیوں ہیں

جواب ۔ پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں
سر چڑھ کے، زمین میں اُترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے سامان
معلوم نہیں، امیر مرتے کیوں ہیں

عظیم الدین محبت متعلم ام ۔ اے (آخری)

غریب

مفلس و محتاج و بیکس، بینوا، بے روزگار
حسرت و ارمان کا مدفن آرزوؤں کا مزار

یاس و حرماں کا مرقع درد و غم کی داستان
مختصر الفاظ میں "بربادیوں کا شاہکار"

زندگی بھر کی کمائی اور ساری کائنات
ایک ملبوسِ کہن ہے اور وہ بھی تار تار

پھوس کی اک جھونپڑی میں زندگی کاٹے غریب
اطلس و دیبا کے صوفوں پر ہوں نازاں مالدار

قرض کی کثرت سے جینا بھی جسے دشوار ہے
خون پینے پر تلے بیٹھے ہیں اس کا سود خوار

بول بالا سود خواروں کا ہے اب آفاق میں
سود خواروں سے بھی بدتر ہیں مگر سرمایہ دار

سرزمینِ ہند میں اب انقلاب آنیکو ہے
دولت و ثروت کے بندو زر پرستو ہوشیار

عظیم الدین محبت متعلم ام۔ اے (آخری)

ایک رات

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ لیکن وہ صاحب کلب سے لوٹے نہ تھے۔ اندھیری رات۔ میں اکیلی اتنے بڑے سنسان گھر میں جاگ رہی تھی۔ میرے دونوں بچے بھی سو چکے تھے۔ میں لکڑہارے اور ریچھ کی کہانی آدھی بھی نہ کہنے پائی تھی۔ کہ وہ دونوں نیند کی چادر تانے بے خبری کے عالم میں بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ میں نے باہر کا دروازہ بند کر دیا۔ اور صحن میں ٹہلنے لگی۔ "برج کھیل رہے ہوں گے"۔ میں سوچنے لگی۔ "آگ لگے اس برج کو۔ کیا منحوس کھیل ہوتا ہے۔ گھر اور کلب کے درمیان کیسی لمبی خلیج حائل کر دیتا ہے۔ بھلا گیارہ بجے تک کھیلتے رہنے میں کیا خاص لطف آتا ہوگا"۔ پھر میں یہ کہکر دل کو سمجھائی کہ بھئی مردوں کی طبیعت ہے۔ جو چاہے کھیلیں۔ یہی غنیمت ہے کہ وہ صرف برج سے دل بہلا رہے ہیں ورنہ یہ مرد تو عجیب عجیب کھیلوں میں وقت گذارتے ہیں۔ یہی غنیمت ہے۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور سونے کے خیال سے لیٹی ہی تھی کہ ایکدم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اگر وہ آئیں۔ میں سوتی رہوں۔ دروازہ کھٹکھٹائیں اور کوئی نہ کھولے۔ تب..." مجھے جاگنا چاہئے ـــ بارہ بجے تک میں جاگتی رہی۔ اس وقت جب سب سو رہے ہوں۔ سرد اندھیری رات ہو۔ جاگنا کیسا کٹھن ہو جاتا ہے۔ نیند آنکھوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہے۔ اور جماہیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ سوچنے لگی"۔ اور آدھا گھنٹہ انتظار کرونگی اس کے بعد بھی اگر وہ نہ آئیں تو سوجاؤں گی۔ ضرور سو جاونگی۔ دس ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایسا معلوم ہوا جیسے ایک گھنٹہ انتظار کرتے گذرا۔ آدھا گھنٹہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بس پندرہ منٹ جاگنا چاہئے۔ میں صرف پانچ منٹ اور انتظار کروں گی۔ صرف پانچ منٹ!۔ کوئی حد بھی ہے انتظار کی"۔ اس فیصلہ کے بعد میں نے اپنا بستر

درست کرنا شروع کیا۔ اور لیٹ گئی۔ رضائی بھی اوڑھ لی۔ کیونکہ صرف دو منٹ جاگنا تھا۔ تین منٹ گزر چکے تھے ۔ دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ میں بستر سے تقریباً اچھل پڑی۔ "آخر آ گئے" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور دبے پاؤں چلتے ہوئے۔ دروازہ تک گئی۔ اور آہستہ سے زنجیر کھول دی اور اسی طرح بغیر آواز کئے اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے نوکر کا نام لیکر پکارا۔ پھر بچے کو پکارا میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ "اور زور سے پکارو" میں نے آہستہ سے کہا۔ اس کے بعد دروازہ کو ڈھکیلنے اور کھلنے کی آواز آئی۔ میں آنکھیں بند کئے اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر سو گئی۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوئے۔ کپڑے اُتار کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں ایک آنکھ کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ خدا کی پناہ انہوں نے دیکھ لیا۔ میں نے مجبور ہو کر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ "تو یہ وقت ہے آپ کے آنے کا" میں نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ "کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تو آئے ہوئے دو گھنٹے ہوتے ہیں"۔ "اُف۔ کس قدر صریح جھوٹ"۔ میں اُٹھ بیٹھی۔ "میں پوچھتی ہوں آخر ہو کیا رہا تھا"؟ انہوں نے بڑے خوشامدانہ انداز میں جواب دیا۔ "آج برج بڑے زوروں پر چل رہا تھا۔ سب جمے رہے۔ میں بھی مجبور تھا۔ اب سے کلب جانا ہی چھوڑ دوں گا"۔ میں نے ان کی طرف ایسی نظر ڈال سے دیکھا جس سے وہ سمجھ گئے کہ ان کا قصور معاف کر دیا گیا۔ "کتنی اندھیری رات ہے" انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ لیکن مجھے نیند آ رہی تھی "ہو گی۔ لیکن اب آپ سو جائیے"۔ "اندھیرے سے تمہیں ڈر نہیں ہوتا؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ مجھے باتوں میں لگا کر وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ بارہ بجے تک جاگتے رہیں تو نیند بھلا یوں ہی آ جاتی ہے؟۔ میں چپ ہو رہی۔ "مجھے تو اندھیرے سے بڑا ڈر لگتا ہے" مجھ سے نہ رہا گیا۔ "اسی لئے بارہ بارہ بجے تک کلب میں رہتے ہو"۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ "سنو ایک اندھیری رات کا قصہ سناتا ہوں"۔ "جی معاف کیجئے مجھے علی الصبح اُٹھنا ہے"۔ اور میں نے سو جانے کے مصمم ارادہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس کے بعد اپنا قصہ شروع کیا۔ "آج سے تین چار برس پہلے کی بات ہے۔ میں رات کو نو کے بعد گھر سے باہر نہ نکلتا۔ اور بالخصوص اندھیری راتوں میں تو گھر کے اندر بھی ڈر ہوتا۔ شیطان۔ بھوت پریت کا میں سرے سے قائل ہی نہیں ہوں اس لئے آپ اس طرف

تو خیال ہی نہ دوڑائیے۔ میں صرف اندھیرے سے ڈرتا تھا۔ اور اب بھی ڈرتا ہوں۔ شام کے دھندلکے پر اندھیرا چھانے لگتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الف لیلیٰ کے کسی جن نے مجھے اپنے سحر کے زور سے بھسم کر ڈالا اور میرا جسم اس اندھیرے میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہونے لگا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک رات بارش کی وجہ سے بجلی کی رو خراب ہو گئی۔ اور اندھیرا چوروں کی طرح میرے کمرے میں گھس پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مجھ پر اس طرح چھا گیا جیسے اوڑھنے کی چادر۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں دیا سلائی کے لئے سرہانے ہاتھ بڑھانے ہی کو تھا کہ مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے ایک مہیب کالا جسم جو سارے کمرے میں سمایا ہوا تھا۔ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی سی دہک رہی تھیں۔ میں شاید چیخ پڑتا کہ اندر سے قندیل آ گئی۔ میری جان میں جان آئی۔ میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کونہ میں ہماری پالو بلی بیٹھی خرخر کر رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں کوئی جن اس بلی کے روپ میں تو نہیں۔ میں یہ سوچ کر سر سے پیر تک تھرا اُٹھا۔ اور اسی لمحہ یہ خیال میرے دل میں گزرا کہ بڑی بوڑھیوں کے عقیدہ میں جنات اکثر بلی کے روپ میں نازل ہوتے ہیں۔ میں قندیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ بھی بھڑک کر گل ہو جائے تو۔ میں بھسم ہو جاؤں گا اور میرا جسم دھوئیں کی طرح اندھیرے میں تحلیل ہونے لگے گا۔ قندیل کی روشنی لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ بلی آہستہ سے اُٹھی اور کمرہ کے باہر چلی گئی جیسا میں کہہ چکا ہوں میں ان بلیات کا قائل ہی نہیں ہوں مجھے روشنی دیدو میں ان کا ہر طرح مقابلہ کرنے تیار ہوں۔ میں صرف اندھیرے سے ڈرتا ہوں۔ میں تھوڑی دیر جاگتا رہا۔ اور قندیل کی بتی کو اچھی طرح بڑھا کر سو گیا۔

میرا گھر ندی کے کنارے واقع تھا وہاں میرے گھر کے سوا دو چار اور بھی گھر تھے۔ شام کے وقت میں تفریح کے لئے باہر نکل جاتا۔ ندی آہستہ آہستہ بہتی رہتی۔ کنارے کنارے جو درخت اُگے ہوئے تھے۔ انمیں سے اکثر پھول کے تھے۔ بھونرے اور اسی قبیل کے دوسرے کیڑے ان پر منڈلاتے رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ان پھولوں کو توڑ کر اپنے ساتھ لیجانا چاہتے ہیں۔ جوں جوں شام قریب ہوتی جاتی۔ وہ اُڑ اُڑ کر اپنے مسکن کی طرف جاتے اور ادھر اُدھر چکر کاٹ کے پھر سے ان پھولوں پر منڈلانے لگتے۔ پانی کی سطح پر ٹڈیوں کے غول کے غول جھکے پڑتے۔ اور اسے اپنے پروں سے چھوتے ہوئے چھوٹی چھوٹی موجوں کے جال میں ڈبو دیتے۔

ان ہانڈیوں سے نظر ہٹالیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے صرف ندی کے پانی پر ہلکی سی پھوار برس رہی ہے اور ہر لحظہ پھیلنے والی کٹوریوں کا ریلا ہے کہ بہا چلا جارہا ہے ۔ مینڈکوں کے شور میں آبشار کی آواز بھی مدھم پڑجاتی ۔ اور مغرب کی طرف نظر کریں تو کسی دوسری سمت دیکھنے کو جی نہ چاہتا ۔ زنگار نگ کے بادل مختلف شکلیں لئے ہوئے ندی کے پانی میں جھانکتے رہتے ۔ شفق کے اس دلفریب اور نظر نواز منظر کو میری طرح (کیونکہ مجھے بھی لوٹنے کی جلدی ہوتی) ڈوبتا ہوا سورج بھی حسرت سے دیکھتا ہوا غروب ہوتا ۔

رات کے وقت ندی کا منظر کیا ہوتا ہے ؟ میں نے نہیں دیکھا ۔ البتہ چاندنی راتوں میں اپنے برآمدہ میں کھڑا پانی کی مچلتی ہوئی موجوں کو چاندنی سے چہل کرتے ہوئے دیکھتا ۔ اور بڑے بڑے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑتی ۔ یا اگر چاندنی زیادہ چٹکی ہوتی تو میں ان چٹانوں کو بھی دیکھ لیتا جو کنارے پر پگھلے ہوئے لوہے کی طرح چمکتی رہتیں ۔ کبھی کبھی ان پر دو چار بگلے بھی بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ۔ جس رات کا میں ذکر کرنے والا ہوں وہ گھپ اندھیری تھی ۔ چاند کے نہ ہونے سے تاروں کی چمک کافی سے زیادہ تابناک تھی، لیکن زمین تک پہنچتے پہنچتے وہ سیاہی میں گھل مل جاتی تھی ۔ زمین کبھی بیوہ کی طرح اندھیرے کی سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی ۔ اور آسمان کسی نو عروس کی کامدار اوڑھنی کی طرح جگمگ کر رہا تھا ۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے ۔ لیکن مجھے نیند کی ہلکی سی جھپک بھی محسوس نہ ہوئی ۔ ایسی وحشت سوار تھی کہ ہر دم مجھے روشنی کے گل ہوجانے کا دھڑکا لگا تھا ۔ اور نہ جانے کیوں میں بے چین تھا ۔ کسی پہلو چین نہ پڑتا ۔ لیٹتا تو اٹھ بیٹھنے میں سکون معلوم ہوتا اٹھ بیٹھتا تو ٹہلنے میں سکون کی امید ہوتی ۔ اور ٹہلتا رہتا تو ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کمرہ کی اس محدود وسعت میں میرے لئے سکون کی گنجائش نہیں ۔ اور میرا سر کمرہ کی دیواروں سے ٹکرا رہا ہے ۔ اور کوئی قوت مجھے کمرہ سے باہر ڈھکیل رہی ہے ۔ اندھیرے کی بے پناہ ہیبتناک وسعتوں میں ۔ میں کشاں کشاں اپنے گھر کے باہر نکلا ۔ اور ٹہلنے لگا میں نے سگریٹ سلگالیا اور جب کبھی میں اس کا کش کھینچتا ۔ وہ تیز روشنی کے ساتھ جلتا ۔ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ۔ یہی ایک روشنی تھی جو میرے ہمت کے چراغ کو اُکساتی تھی ۔ ندی اس اندھیرے میں ریل کے دھوئیں کی طرح سیاہی مائل نظر آرہی تھی ۔ اور آبشار ریل کی گڑگڑاہٹ سے ملی جلی آواز پیدا کر رہا تھا ۔ پل کے چراغ روشن تھے لیکن انکی روشنی صرف دریا کے پانی میں منعکس ہو رہی تھی ۔ اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا ۔ اتنے میں

مجھے کچھ ایسا سنائی دیا جیسے دور کسی کے چلنے کی آواز آرہی ہے ۔ اور چھن سے ہاتھ کی چوڑی جھنکی ۔ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا "عورت ۔ اتنی رات گئے ۔ اندھیرے میں ۔" میں اسی طرف دیکھنے لگا میرے گھر سے تیسرے مکان کے آگے ایک عورت کھڑی تھی ۔ اندھیرے کے باوجود میں اسے دیکھ چکا ۔ دبلی پتلی اور میانہ قد ۔ نجانے کیوں ؟ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چاہے اندھیرا ہو ۔ ندی کا کنارہ ہو ۔ عورت ہو ۔ مجھے اس کا پیچھا کرنا چاہئے ۔ اس عورت نے ندی کا رخ کیا ۔ میں نے ایک سفید دستی کو جو شائد اس کے ہاتھ میں تھی ہلتے ہوئے اور ندی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا ۔ میرا جسم برف کی طرح سرد پڑ گیا ۔ خداوندا یہ عورت ندی کی طرف کیوں جارہی ہے ؟ ۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا ۔ کاش اس وقت کوئی غیبی قوت مجھے واقعہ کی اصلیت سے خبردار کردیتی ۔ کیوں وہ لڑکی ندی کی طرف جارہی ہے ۔ کونسی افتاد اسے اس طرف ڈھکیل رہی ہے ؟ ۔ میرے اطراف اس قسم کا شور سنائی دیا جیسے آندھی سنسنا رہی ہو ۔ میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا ۔ چاروں طرف سناٹا تھا ۔ ایکدم سے مجھے ایسا سنائی دیا جیسے کوئی مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے ۔ میں لرز اُٹھا "یہ عورت کسی خطرناک اقدام کی مرتکب ہوگی ۔ خودکشی کرلے گی" ۔ میں عجیب کشمکش کے عالم میں کھڑا تھا ۔ اس وقت عورت میرے سامنے ایک ہاتھ میں کمزوری اور دوسرے میں شہ زوری لئے کھڑی تھی ۔ اس اندھیری رات میں تن تنہا ندی کی طرف جانا دل گردہ ہی کا کام تھا ۔ اور جان دینے کے لئے جانا کیسی شہ زوری کا کام ہے ۔ اور محبت کرنا کتنی بڑی کمزوری ہے ۔ اس خیال کے آتے ہی میں سمجھ گیا کہ گتھی سلجھ گئی ۔ محبت اس سانحہ کی ذمہ دار ہوگی ۔ وہی اس لڑکی کو ندی کی طرف ڈھکیل رہی ہے ۔ اور میرے ذہن میں ہزاروں ہی مثالیں ایسی لڑکیوں کی گھومنے لگی جنھوں نے صرف محبت کی خاطر اپنی زندگی کی کشتی کو دریاؤں کی بے رحم موجوں میں ڈبو دیا ۔ اور اپنی پاک ارواح کو پھولوں کی طرح بہا دیا ۔ اُف ۔ کمزور جسم اور کمزور دل والی عورت کیوں یہ بیٹھے بٹھائے محبت کا روگ لگا بیٹھتی ہے ۔ محبت ۔ خطرناک ۔ جان لیوا ۔ کوئی محبت ہی کو دریا میں کیوں نہیں ڈبو آتا ۔ مایوسی انتظار بدنامی ۔ بیچینی ۔ اور نتیجہ کے طور پر خودکشی ۔ اس کے ترکش میں کیسے کیسے زہریلے تیر ہیں ۔ میرے قدم بھی ندی کی طرف اُٹھ گئے ۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ چاہے کچھ ہو ۔ آج میں ایک لڑکی کی جان بچاؤں گا ۔ سماج یا کسی سنگدل محبوب کی بھینٹ چڑھنے سے پہلے میں اسے تھام لوں گا ۔ دستی اب دھندلی ہوتی جارہی تھی اور بہت

تیزی سے حرکت کر رہی تھی شاید وہ دوڑ رہی تھی۔ میں بھی دوڑنے لگا۔ ایسا سنائی دیا جیسے میرے پیچھے ساری دنیا کی عورتیں چیخ چیخ کر مجھے اس عورت کو بچانے کے لئے کہہ رہی ہیں۔ اور وہ خود بھی چیخ رہی ہے۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ ایکدم سے میں رک گیا۔ مجھے سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ آواز کس سمت سے آئی ہوگی، وہی آواز چٹانوں کی طرف سے آئی۔ اور میرے کانوں کو چھوتی ہوئی بہت آگے نکل گئی۔ یہ آواز کسی بے چین روح کی تو نہ تھی جو اپنے محبوب کے لئے اب بھی بھٹک رہی تھی۔ یا اس مایوس لڑکی کو ندی تو نہیں پکار رہی تھی۔؟ ندی کی سحر کن پکار۔ لڑکی کے بھاگنے کی آواز آنے لگی۔ 'اوہ' ناامیدی کے عالم میں میرے منہ سے نکلا "آواز کا جادو اس پر چل گیا۔" اور میں دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ میں ندی کے کنارے پر کھڑا چاروں طرف اُسے ڈھونڈ رہا تھا۔ ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ اس کی پرسکون سطح کو دیکھ کر غصہ سا آرہا تھا کہ میرے دل کی طرح یہ بھی طوفان خیز کیوں نہیں۔ سارے شہر کے ہنگاموں، شورشوں اور فتنہ انگیزیوں کو بغل میں دبائے بہے چلی جارہی ہے۔ کسی مچھلی کے اُچھلنے کی آواز آئی۔ اور میں سمجھا کہ وہی لڑکی زندگی کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے لیکن پھر سے سکون کی عملداری قایم ہوگئی۔ آہ میری نظریں جب اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہوئیں تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے خود میں نے اسے ندی میں ڈھکیل دیا۔ عورت جب کسی اقدام کا تہیہ کرلیتی ہے تو کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ یہ حقیقت مجھ پر واضح ہونے لگی اور میں اپنے ایک ہمجنس پر دانت پیس رہا تھا۔ جس نے اس لڑکی کو محبت کے سبز باغ دکھائے۔ اور بیوفائی کی۔ بھولی بھالی لڑکی اس کے فریب میں آگئی۔ نجانے اور کیا کیا واقعات رونما ہوئے۔ کہ اس نے اس زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی ٹھان لی۔ مرد بڑا خودغرض۔ بے وفا اور سنگدل ہوتا ہے۔ لیکن میں سنگدل نہیں ہوں میں محبت کی قدر کرتا ہوں اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ کاش مجھے بھی ایسی ہی کوئی 'محبت پرست' چاہنے والی مل جائے جو محبت کی خاطر جان بھی دیدے۔ تو میں اپنی زندگی۔ محبت۔ غرض سب کچھ اس کے لئے وقف کردونگا اور کلب کو جانا چھوڑ دونگا۔ میں ادھر اُدھر اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ جیسے اس رات اندھیرے میں میں دیاسلائی ٹٹول رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں نے جو نظارہ دیکھا وہ عمر بھر یاد رہے گا۔ چٹان کے قریب ہی ایک شعلہ سا روشن ہوا اور میں نے دیکھا کہ چٹان کا سہارا لئے ہوئے ایک حسین عورت کھڑی ہے۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکہ ہو رہا تھا۔ پھر خیال آتا کہ کوئی جل پری ہوگی۔

وہ شعلہ بجھ گیا۔ اور پہلے کی طرح چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ منٹ بھر کے وقفہ سے دوسرا شعلہ روشن ہوا اور اب دیکھتا ہوں تو وہ پیکرِ نورانی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ اُڑنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ وہ عورت قطعی نہیں۔ مجھے یقین تھا۔ کوئی پری ہے۔ یا اسی عورت کی روح ہے جو انسانی جسم کو دریا کی تہہ میں چھوڑ کر آسمانوں کو طے کرے گی۔ بیچاری لڑکی۔ میرے دل پر اسکی قربانی ایک برگزیدہ اور مقدس موت کا نقش بٹھا رہی تھی مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس سانحہ جانکاہ سے میری روح کا تار تار بکھر گیا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ اسی طرح جیسے وہ دغاباز عاشق روتا۔ مہر پیٹتا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ وہ شعلہ پھر تیسری بار روشن ہوا اور اب جو دیکھتا ہوں تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں غوطے کھا رہا ہوں۔ اور میرا سانس اکھڑ رہا ہے۔ اُف اس سلسلہ کی روشنی میں میں نے ایک نہایت ہی خوبصورت چہرہ کو دمکتا ہوا دیکھا۔ یہ ایک عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفید دستی تھی۔ اس کے بازو ہی ایک مرد کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

"تمھاری سیٹی کی آواز سنتے ہی میں دوڑتی ہوئی آئی —"

مرد کھانس کر چپ ہو رہا —

"میں تمھارے لئے ہر خطرہ کا مقابلہ کروں گی۔ میں تمھارے لئے جان دیدوں گی" لڑکی نے مرد کے شانوں کا سہارا لیتے ہوئے کہا —

"کسی نے دیکھا تو نہیں تمھیں —" وہ مرد تشویشناک لہجہ میں پوچھ رہا تھا۔

"صرف اندھیرے نے —" — لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

میرے جی میں تو آیا کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بیدار کردوں اور ان سب کو یہ منظر دکھاؤں۔ لیکن آواز میرے حلق میں پھنس رہی تھی۔ مجھے ایسا ہی غصہ تھا جیسے کسی نے میرے خدا کو میرے منہ پر برا بھلا کہا ہو۔ میں نے گڑگڑا کر دعا کی کہ ندی میں اس زور کا سیلاب آئے کہ یہ دونوں عاشق و معشوق غرقاب ہوجائیں۔ میں ایک مایوس اور دل شکستہ مرد کی طرح خود کو گھسیٹتا ہوا اپنے گھر تک لایا۔ کمرہ میں داخل ہوکر میں نے روشنی گل کردی۔ اور بخار کے مریض کی طرح کراہتا ہوا سوگیا۔ "— "بڑی شریر لڑکی تھی"۔ — میں نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی آپ جاگ رہی ہیں۔" — انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چلئے سوجائیے بخار کے مریض کی طرح کراہتے ہو — میں روشنی گل کئے دیتی ہوں"۔

رشید قریشی بی اے (عثمانیہ)

سیرت محمدی کا مطالعہ

"یہ مضمون مقابلہ تقریب جشن میلاد صلعم جو اقامت خانجات میں منایا گیا۔ غیر مسلم طلبا کے لئے مخصوص تھا میلاد کمیٹی نے اس مضمون کو مستحق انعام اوّل مطیعہ پروفیسر سبا راؤ قرار دیا" "ادارہ"

بزرگان دین کی سیرت کے مطالعہ کے بعد چونکہ ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنی زندگی کے اکثر اہم مسائل کا بالکل صحیح اور قابل عمل حل دریافت کر سکیں اس وجہ سے ہم پر واجب ہے کہ ان کے حالات سے خود کو واقف رکھیں تا کہ نازک اور امتحانی مواقع پر یہ علم ہماری رہنمائی کر سکے۔ رفتہ رفتہ جب انبیاء کے حالات کے غائر مطالعہ سے ہم میں خود ایک قسم کی بصیرت پیدا ہو جائے گی تو یہ ہماری زندگیوں میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دے گی۔ انہیں ایسے راستے پر ڈال دیگی جو بالکل بے خطر ہوتا ہے اور مقاصد حیات کے حصول کا واحد ذریعہ ہوا کرتا ہے، جو لوگ دنیا میں کامیاب اور قابل تقلید زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر آن تبدیل پذیر حالات سے نتائج اخذ کر سکیں، اُن سے سبق سیکھیں، اور اُن سے عبرت حاصل کریں ورنہ شہرت و کامرانی کا رنگین خواب سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، اب ہم کچھ تمہیدی بیان کے بعد حضرت محمد صلعم کی زندگی کے حالات اور سیرت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس مضمون کے آخری صفحات میں آنحضرت صلعم کی سیرت میں اپنے چند شکوک کے ازالہ کا سامان تلاش کریں گے اور دیکھیں گے کہ اُن کی زندگی کا غائر مطالعہ مسائل حاضرہ کی گتھیوں کو کس حد تک سلجھا دیتا ہے اور ممد و معاون ہے۔

دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہر ملک میں مختلف زمانوں میں معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط اور ترقی کے دور آچکے ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ جہالت، بت پرستی اور طرح طرح کے دیگر توہمات کسی قوم پر ایسا تسلط جما لیتے ہیں کہ آئندہ اُن کے لئے ترقی کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں صدیوں تک اُس کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا، کبھی وہ ترقی کے اُس منتہا کو حاصل کر لیتی ہے کہ جس پر اغیار تک رشک کرتے ہیں۔

مگر اس سارے عروج و زوال کے عقب میں جو حقائق و محرکات کارفرما ہوتے ہیں اُن میں کسی نہ کسی بڑے رہنما اور خادم ملّت کی کوششوں کا کافی حصہ ہوا کرتا ہے۔ جب حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں، جب حقیقت مجاز کے پردوں میں گم ہونے لگتی ہے، جب مذاہب کی تعلیمات بجائے عوام کو راہ راست پر لگانے کے اُن کی گمراہی کا باعث ہوتی ہے تب یہ قدرت کا اُصول ہے کہ کوئی ایسا پیغمبر یا نبی پیدا ہوتا ہے جو اُن میں بیداری کی روح پھونک دیتا ہے۔ اُن کو اپنے فرائض سے آگاہ کراتا ہے، لایعنی فضول عقائد کا ابطال کرتا ہے اور ایک صحیح و اعلیٰ قسم کی اخلاقی زندگی بسر کرنے کی تلقین سے معاشرہ کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کرتا ہے۔ بھگوت گیتا کے اس قول کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جب دھرم پر آفتیں آتی ہیں تو خود قدرت مذہبی قوانین و عقائد کی تجدید و حقائق کے اظہار کا انتظام کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں جب برہمنوں کے مظالم بڑھ رہے، اور ذات پات کی تفریق نے یہاں کی معاشرتی زندگی میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کر دیں۔ ہر شعبہ حیات میں غیر مساویانہ برتاؤ روا رکھا گیا تب مہاتما بدھ جیسے روشن دماغ رشی کا ظہور ہوا جس نے اپنے نرالے فلسفہ ترک کی تلقین سے دنیا داری کی طرف سے ایک تنفر پیدا کر دیا۔ بدھ کا خیال تھا کہ جذبات و خواہشات کی غلامی سے ہی نجات یا نروان ممکن ہے۔ مختصراً یہ کہ معاشرتی پستی و جہالت پیش خیمہ ہوتی ہے کسی نبی کے ظہور کا۔ قدرت کا یہ نظام اس عالمگیر قانون کے مطابق کام کر رہا ہے اور جہاں جہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو جائینگے وہاں مختلف مُفکر اپنے اپنے زمانوں میں احیاء حقائق کے اہم فرض کی تکمیل کریں گے

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے شاہکار سیرت النبیؐ میں اسلام سے قبل عرب کے تمدن کا جو مختصر خاکہ پیش کیا ہے اُس سے تو یہ ظاہر ہے کہ وہاں اُس زمانے میں ایک مکمل زبان تک نہ تھی۔ لوگوں کی غذا عموماً حشرات الارض گرگٹ، کنکھجورے وغیرہ تھی۔ چھلنی کے استعمال سے تک وہاں کے باشندے ناواقف تھے۔ لیکن ان ضمنی معلومات سے زیادہ اہم ہمارے لئے اُس زمانے کے عقائد کا مطالعہ ہے۔ ڈیکارٹ وغیرہ نے اپنے فلسفہ میں جس قسم کی میکانی توجیہہ پیش کی ہے اُسی کے مماثل کچھ اُس زمانے کے عربوں میں بھی عقائد موجود تھے۔ ایک فرقہ تو خدا کے وجود کا قائل تھا لیکن سزا و جزا کا منکر۔ بعض اس کے بھی ماننے والے تھے لیکن نبوت کو فضول خیال کرتے تھے۔ لیکن ایک عظیم اکثریت ایسے بت پرستوں کی تھی جو طرح طرح کی مورتوں کی پرستش

کرکے اُن سے اپنی حاجات کے رفع کی خواہش کرتے تھے، نصرانیت، یہودیت، مجوسیت، تین مذاہب اسلام سے قبل عرب میں موجود تھے ان میں سے ہر ایک کے عقائد کی تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ہر طبقہ و گروہ میں اُس زمانہ میں "اللہ" کا کوئی نہ کوئی تخیل کسی نہ کسی صورت سے موجود تھا۔ بہرحال وہ ایک عظیم المرتبت ہستی کے قائل ضرور تھے جو عالم مظاہر پر حکمران ہے۔ بتوں کے بارے میں بت پرست تو اُن کو ایک ذریعہ مان بیٹھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ یہی بت حق میں قدرت نے خاص خاص طاقتیں ودیعت کر رکھی ہیں قیامت کے دن اُن کی شفاعت کریں گے۔ انہی کے عقائد کے بارے میں قرآن میں درج ہے کہ

"یہ بتوں کو بطور ایک ذریعہ کے پوجتے ہیں"

زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُن کے قدیم اعتقادات میں تزلزل واقع ہوتا جا رہا تھا یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے کے بعض مفکروں ہی نے بت پرستی کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا اور رأس امۃ یا رب العالمین کے متعلق طرح طرح کے سوالات اُٹھائے جانے لگے تھے۔ قرآن میں درج ہے کہ

"اگر ان لوگوں سے (کافروں سے) پوچھو کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند و سورج کو کس نے تابعدار بنا دیا تو بول اٹھیں گے 'اللہ' پھر یہ کیوں بہک رہے ہیں۔

اس قسم کی عقلی بیداری جس کے آثار بہت پہلے سے رونما ہو چکے تھے گویا اسلام جیسی توحید کی تحریک کو مقبول عام بنانے کے لئے ایک موافق ماحول پیدا کر چکی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ ایک خدائے واحد کی عبادت، اُسی کی ثنا خوانی اور اُسی سے کسب فیض کی تعلیم دے چکے تھے لیکن بعد میں آنے والی نسلوں نے اُن کے بتائے ہوئے اصولوں کو بھول کر بے راہ روی اختیار کر لی جس کی وجہ سے بت پرستی کے خلاف حضرت محمدؐ صلعم سے پہلے امیہ بن ابی صلت ہی کو احتجاج کرنا پڑا۔

ایسے وقت میں جب کہ الحادی جانب رجحان بڑھتا جا رہا تھا، قبائل کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کی حالت ناگفتہ بہ تھی، مذموم رسوم و رواج کی پابندی نے اُن کی ہر قسم کی ترقی کو مسدود کر رکھا تھا، علم کے

فقدان کی وجہ سے اُن کی زندگیاں بالکل وحشیانہ ہو گئی تھیں ایک ایسے مجدد کی سخت ضرورت تھی جو اُن سب کو اپنے نرالے درس مساوات سے ایک متحدہ محاذ پر لے آئے تاکہ مقاصد قومی کے تحفظ کی کوئی کامیاب کوشش ممکن ہو سکے۔ آنحضرت صلعم کے ظہور نے قدرت کی اس اہم ضرورت کی تکمیل کر دی۔ اُن میں ہمیں ایک ایسا نبی ملا جو ہر لحاظ سے مکمل، ہر پہلو سے قابل تقلید، اور اپنے زمانے کے مفکروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ مذہبی مصلح کے ساتھ وہ سماجی مصلح بھی تھے اور انہوں نے دختر کشی، شراب خواری وغیرہ کی سی مذموم رسوم کے انسداد کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں تاکہ قومی زندگی میں کچھ ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں۔

آنحضرت صلعم ۵۷۰ء میں عالم قدس سے عالم امکان میں آئے۔ چند ہفتے قبل باپ فوت ہو چکے تھے چھ سال کی عمر میں ان کی مادر بزرگوار نے انتقال کیا، پھر یہ چند دن تک اپنے دادا عبد المطلب کی نگرانی میں رہے بعد ازاں جب دادا نے بھی انتقال کیا تو شفیق چچا ابو طالب نے ان کی تعلیم و تربیت کا فرض اپنے ذمہ لیا۔ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے شام کا سفر کیا جس کے دوران میں ایک عیسائی راہب نے اُن کے پیغمبر ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔ پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ جن کے مال تجارت کو یہ اکثر دیگر ممالک میں فروخت کرنے کے لئے لے جایا کرتے تھے ان کے نکاح میں آئیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کی عمر کے پندرہ سال معمولی دنیاداروں کی طرح سے مختلف فرائض خانہ داری کی تکمیل میں گذرے۔ چالیسویں سال سے ان پر وحی نازل ہونے لگی۔ اور اس کے بعد انہیں تبلیغ دین کا خیال پیدا ہوا۔ کچھ دن تک تو یہ سلسلہ خفیہ طریقہ سے چلا اور اُن کی تعلیم محض اپنے چند خاص معتقدین تک محدود رہی۔ بالآخر انہوں نے عوام میں بھی اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ قریش اس کو ایک بدعت سمجھتے تھے کہ کوئی ان کے بتوں کی شان میں اس طرح کے اہانت آمیز جملے کسے اور اُنہیں کمزور بتائے اسی وجہ سے انہوں نے آنحضرتؐ اور اُنکے ساتھیوں کی علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ اس میں رفتہ رفتہ شدت آتی گئی اور بالآخر آنحضرت کو یہ حکم دینا پڑا کہ چند مومن بلاد حبش میں جا کر سکونت اختیار کریں۔ جب اس طرح کے ترک وطن و تخلیہ کی خبر دشمنوں کو ہوئی تو انہوں نے بھی اپنے چند سفیر حبش کے دربار میں بھیجے کہ وہ شاہ حبش کو ان مسلمانوں کو پناہ میں نہ لینے کی ترغیب دیں۔ لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔

ادھر محض اپنے دین کی حمایت میں اہل اسلام کو معرکۂ بدر و اُحد سے سابقہ پڑا۔ پہلے میں تو وہ بالکلیہ

منصور رہے لیکن دوسرے معرکہ میں اُنھیں کوئی نمایاں فتح حاصل نہ ہو سکی جس کی وجہ سے پھر آس پاس کے قبائل آنحضرتؐ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ان دونوں معرکوں میں کئی نفوس شہید ہوئے۔ پھر اس کے بعد ایک عرصہ دراز تک کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں جب مکہ میں مظالم حد سے زیادہ بڑھ گئے تو آنحضرتؐ نے مدینہ کو ہجرت کا تہیہ کرلیا۔ مکہ سے زیادہ مدینہ میں اسلام کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور وہیں یہ پروان چڑھا۔ مدینہ کے لوگ اسلامی عقائد پر اتنا ایقان رکھتے تھے کہ جنگ اُحد کے بعد بھی اُن کے خیالات میں کوئی تغیر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد یہودیوں سے معرکہ رہا۔ ایسے حالات میں جبکہ آنحضرت صلعم کی سیرت پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے اُن کی زندگی کے حالات بیان کرنے میں کافی اختصار کی ضرورت ہے۔ ہوازن۔ طائف۔ خیبر وغیرہ کی کئی لڑائیاں محض دین اسلام کی حمایت میں لڑی گئیں اور مومنوں نے اپنی بہادری وشجاعت کے جوہر دکھائے کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جو فوج اُن کے مقابلے کو آئی وہ اُن سے کئی گنا زیادہ ہوتی لیکن یہ ایک عجیب بات تھی یا یوں کہا جاتا ہے کہ اُنھیں کچھ غیبی امداد حاصل رہی جس کی وجہ سے وہ ہر میدان سے شادان وکامران لوٹے۔ عمر کے آخری سالوں میں آنحضرتؐ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں کے نام اپنے دین کو قبول کرنے کے نوید بھیجے لیکن سوائے بعض کے کوئی بھی اُن پر عمل نہ کر سکا۔ خسرو نے تو آنحضرت کے احکام کو پرزے پرزے کر ڈالا اور بازان حاکم عرب کو لکھ بھیجا کہ محمدؐ کو گرفتار کرو جن کو کہ پیغمبری کا خبط ہے لیکن اُسوقت تک رسول اللہ کو اس قدر اثر اور ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی کہ خسرو کو اپنے احکام واپس لینے پڑے۔ ہرکلیس عیسائی حاکم روما کے نام بھی اس قسم کا خط بھیجا گیا تھا جسے اُس نے نہایت احترام سے قبول کیا اور سفیر مکہ کی کافی خاطر تواضع کی۔ اسی دوران میں مقوقس نے یونانیوں کے مظالم سے تنگ آکر اسلام قبول کیا۔ مقوقس قبطی قوم کا جو مصر میں آباد تھی حاکم تھا اسی طرح سے شہنشاہ حبش نجاشی بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اپنے لڑکے کو آنحضرت کی خدمت میں تربیت کے لئے بھیجدیا۔ جب ہر طرح سے اطمینان ہو گیا تو ایک مرحلہ باقی رہا کہ کعبہ میں جاکر وہاں کے بتوں کو توڑ ڈالا جاوے۔ اسی خاطر مکہ پہنچے اور سارے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا۔ توحید کا ڈنکہ بجایا اور قریش کے لئے ایک نئی راہ عمل تجویز کی۔ ابوسفیان جو ایک عرصہ دراز تک مخالفت کرتا رہا اب قائل العدم ہو گیا تھا۔ بالآخر ایک طویل جد وجہد و کشمکش کی زندگی کے بعد قدرت کے عالمگیر اصول کے

مطابق آنحضرت کو وصال نصیب ہوا۔ کچھ دنوں تک علیل رہے اور جب دیکھا کہ زندگی کا یہ ڈرامہ ڈراپ کے قریب قریب الختم ہے تب انھوں نے آخری بار مکہ میں سارے مسلمانوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ

"اپنی بیویوں کے ساتھ ہمیشہ بہت اچھا سلوک کرو۔ زناکاری۔ دغا سے بچو۔ ذات واحد کی پرستش کرو" وغیرہ۔

"سارے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مساویانہ برتاؤ ضروری ہے" وغیرہ

یہ اُس قائد ملت کی زندگی کا انجام تھا جس نے آج دنیا کی تاریخ میں ایک دیرپا نقش چھوڑا ہے اور صدیاں گذر جانے کے بعد بھی لکھوکھا کی تعداد میں لوگ اس دین کو باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ ہر جگہ اُس کی سالگرہ کے اعزاز میں مجالس منعقد کی جاتی ہیں، عیش وطرب کے جلسے کئے جاتے ہیں اور خوشیاں منائی جاتی ہیں۔

اب اُس ولی مادر زاد کی سیرت کا مختصر خاکہ پیش کرنا ضروری ہے جس نے ساری عمر مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرکے دنیا کو پیغام سنایا جس نے شدید مخالفت کے باوجود بت پرستی وسیارہ پرستی کو متروک قرار دیا اور اسے مٹا کے چھوڑا، جو بلند اخلاقی معیار، زہد وتقویٰ، صداقت پرستی، آنحضرت صلعم کی زندگی کی شان تھیں وہ عام لوگوں میں بہت کم ملتی ہیں اسی وجہ سے انہیں ایک مافوق الفطرت ہستی ماننے پر ہر فرد مجبور ہے۔ وہ اپنے زمانے کے واحد رہنما تھے۔ اُن کی سیرت کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن میں کونسے کونسے اوصاف حسنہ موجود تھے بلکہ آپ کو مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اُن تمام فضائل سے متصف تھے جو ایک اعلیٰ قسم کی اخلاقی زندگی کے لئے لابدی ہیں۔ تاہم اس عظیم المرتبت شخصیت کے بعض پہلو ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتے ہیں اور اُن کو بعد کی زندگی میں جو ہر دلعزیزی اور ہر قدم پر مقبولیت حاصل ہوئی اُس کا راز یہی ہے کہ وہ ہر ایک سے بالکل برادرانہ سلوک کرتے نہایت شفقت سے پیش آتے۔

اس راز سے وہ بخوبی واقف تھے کہ کسی نبی کی تعلیمات اُس وقت تک باثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اپنی تعلیم کا مکمل نمونہ نہ ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے خود کو ایک عالم باعمل بنائے رکھا۔ دوسروں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتے اور خود بھی سادہ پہنتے اور کھاتے تھے۔ حق وحلال کی کمائی پر زور دیا کرتے اکثر وہ خود کئی فاقے کرتے تھے لیکن مسلمانوں کی مجتمعہ رقم سے ایک حبہ نہ لیتے۔ امانت کا یہ حال تھا کہ بچپن ہی سے

لوگ اُن کو الامین، کہہ کر پکارتے تھے۔ اور بی بی خدیجہؓ نے انہیں جو اپنا معتبر تاجر مقرر کیا وہ محض اُنکی قیمت، صدا پرستی و امانت کا کرشمہ تھا۔ دروغ بیانی سے دلی نفرت تھی۔ عفو، رحمدلی، صبر و استغناء سے کہیں نہ چوکتے ہمیشہ انہیں ایک قسم کا سکون و طمانیت قلبی میسر تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ جنگوں کی وجہ سے وہ متفکر رہا کرتے لیکن پھر یکبار ہی رضا الٰہی پر تکیہ کر کے خاموش ہو جاتے اور حسب حال اپنے کام میں لگ جاتے۔ فکر کرنا غیر ضروری خیال کرتے تھے۔

خود علم سے نابلد تھے لیکن اس کے ساتھ ہی تعلیم کی اشاعت کے لئے انہوں نے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں۔ چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں پر فدیہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ہر قیدی دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاوے۔ دیگر مذاہب کے ساتھ بھی کسی قسم کے غیر مساویانہ برتاؤ کو ہمیشہ معیوب قرار دیتے رہے۔ چنانچہ مدینہ میں ہجرت کے بعد انہوں نے جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے اپنا پیام سنایا اس میں ہر قسم کی آسائشوں اور مومنوں جیسی عبادت وغیرہ میں سہولتیں بہم پہنچانے کا یقین دلایا گیا تھا۔ اُن سے یہ صاف کہہ دیا گیا تھا کہ اُن کے طریقہ پرستش میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاوے گی اور محض مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی قسم کے حقوق سے انہیں محروم نہ کیا جائے گا۔ غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ شمشیر زنی پر اتر آتے تو پرے کے پرے صاف کر دیتے، معرفت کے موتی بکھیرنے لگتے تو ہر ایک دنگ رہ جاتا۔ چنانچہ جنگ ہوازن کے دوران میں انہوں نے جس جرأت کے ساتھ دشمن کی بھاری فوج کا مقابلہ شروع کیا اور آخر تک ڈٹے رہے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ وہ دشمن کی فوج کی صفوں میں گھرے ہوئے تھے صرف دس بارہ رفقاء کے ساتھ ایک جمعیت کا مقابلہ ایک بہادر جرنیل ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ایسی مکمل شخصیت کو پھر کیوں نہ مقبولیت حاصل ہوتی جو ہر ایک کے جذبات کا احترام کرتی ہے سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کی روادار ہے اور خود اپنی تعلیم کا نمونہ ہے۔

ذات واحد کی پرستش اُن کی زندگی کی خاص شان تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ پیغمبری سے قبل اُن کو بتوں کی پوجا کے مواقع حاصل رہے لیکن انہوں نے ایسے ہر موقع پر اس سے اجتناب کیا۔ ایک دفعہ جب بتوں کا چڑھایا ہوا کھانا اُنہیں دیا گیا تھا تو وہ فاقے سے رہ گئے لیکن اسے ہاتھ تک نہ لگایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

بتوں سے اُن کو دلی نفرت تھی۔ زندگی میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ انسان اپنی سُرت یا توجہ مرکوز کر کے ذات باری کا پرستار بنا رہے۔ اسی سے کسب فیض کرے۔ اور اسی عزوجل کے آگے اپنی ضروریات پیش کرے، یہ کس قدر شرمناک ہے کہ انسان جیسی برگزیدہ ہستی جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ

"گرچہ پر و بال نہ تھے آدم کے
پہنچا اُس جا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا۔

کبھی نہایت خضوع و خشوع سے ایک ساکن بت کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ غرض کہ آنحضرتؐ اس مسلک سے بددل تھے اور مکہ میں داخلے کے بعد انہوں نے جو پہلا کام کیا وہ یہی تھا کہ سارے بت تڑوا دئے۔ یہ ہماری زندگی کا ایک اہم مسئلہ کا حل ہے کہ کس سے کسب فیض کیا جائے۔ کون قابل پرستش ہے، بار بار انہوں نے ہر خطبہ میں دہرایا ہے کہ ایک کو پوجو اُسی کو مانو۔ کبیر داس نے جو ہندوستان کے ایک مایۂ ناز سوشل رفارمر (مصلح) تھے اپنے ایک دوھے میں کہا ہے کہ

پات پات کو سینچتے پیڑ کو دیا سکھائے
مالی سینچے مول کو رُت آوے پھل کھائے

پتے پتے کو سینچنے سے درخت خود سوکھ جاتا ہے، اور جڑ کو پانی دینے سے اُس میں پھر تازگی آجاتی ہے۔ اسی طرح سے مختلف دیوتاؤں کی آرادھنا خواہ وہ کسی صورت میں ہو کبھی ہم کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ کریگی۔

اُس زمانہ میں بردہ فروشی جائز تھی۔ جو لوگ غلام بنائے جاتے اُن کے ساتھ نہایت ہی ناروا سلوک کیا جاتا تھا، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ اور اُنھیں ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک ایسا نبی جو اس معاشرہ کے نقائص کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کے واسطے ظاہر ہوا تھا جو ایک صلح کل مشرب کی تلقین سے دنیا میں امن اور سلامتی کی بنا ڈالنا چاہتا تھا جو مختلف گروہوں کو ایک مشترکہ محاذ پر لا کر اُنہیں ایک قومی جماعت میں مُتبدل کر دینا چاہتا تھا اس قسم کی بدعنوانی کو کیونکر گوارا کر لیتا۔ بار بار آنحضرتؐ فرماتے رہے کہ غلاموں کے ساتھ جو اسلام قبول کریں بالکل یگانگت کا سلوک کیا جائے کوئی تفریق روا نہ رکھی جاوے۔

دنیا میں ہر فرد کو زندہ رہنے، ترقی کرنے اور شہرت و مرتبت کے اعلیٰ منازل طے کرنے کا حق حاصل ہے، ہر ایک
کی انفرادیت کا احترام ضروری ہے، مکّہ کی رہائش کے دوران میں آخری خطبہ میں جو الفاظ آئے ہیں وہ اب بھی
ہر مومن کے لئے شمعِ ہدایت ہیں اور ہر ایک کے دل پر نقش ہیں۔ اُن کا ارشاد تھا

"اے مومنو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہر مسلمان دوسرے کا بھائی
ہے۔ تم سب برابر ہو۔ اور سب پر ایک ہی قسم کے فرائض کی تکمیل واجب ہے"

یہ چند جملے جو حب البشری، خدمتِ خلق، اور مصلحانہ جذبات کے سچے ترجمان ہیں آنحضرت صلعم کے
مقصدِ حیات کو بھی متعین کرتے ہیں۔

رسول اللہ کا خیال تھا کہ جب نوجوان نسلیں آئندہ قوم کے مستقبل کی تعمیر کی ضمانت ہیں تو انہیں پھر ہر قسم
کی آزادیٔ عمل اور آزادیٔ خیال میسر ہونی چاہئے۔ اسی وجہ سے انہوں نے عمر بھر اس اصول کو پیش نظر رکھا
کہ ذمہ داری کے اکثر اہم فرائض نوجوانوں کے سپرد کر دیتے۔ حضرت عمرؓ جوان کے مشیر خاص تھے اور ہر معاملہ
میں پیش پیش رہتے تھے، جن کی رائے کو آنحضرت اکثر صائب تصور کرتے تھے بالکل نوجوان تھے ایسے کئی نام
گنائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن عوفؓ وغیرہ۔ اس سے دور حاضرہ کی سیاست
کا ایک اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ طلبا رخواہ نوجوانوں کو کس حد تک سیاسی میدان میں عملی کام کرنے، اپنے پوشیدہ
جوہر دکھانے کا موقع حاصل رہے۔ اکثر قدامت پرست لوگ اب بھی ایسے ہیں جو نوجوانوں کی مداخلت کو متروک
سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ دورانِ تعلیم میں کسی قسم کی سیاسی جدوجہد میں حصّہ نہ لیا جائے۔ لیکن وہ اس
حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ بحیثیت ایک نونہال وطن کے اسی طبقہ کے دوش پر مستقبل وطن کے تشکیل کی ذمہ داری
عائد ہے جس کی تکمیل اُن کی زندگی کا اہم فریضہ ہے۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو پھر یہ ملک کی تباہ حالی
و پستی کا پیش خیمہ ہوگا۔

اُس زمانہ میں ہندوستان میں بابا کے تخیّل کو نہ سمجھ کر لوگ گمراہ ہو چلے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا سے کنارہ کشی
کو ہی ایک زبردست اخلاقی فضیلت مان کر لوگ طرح طرح کے ڈھونگ رچانے لگے۔ کہیں نفس کشی جائز سمجھی گئی کہیں

اور خواہشات کو ہر طرح سے کچلنے ہی کو سعادت کا رتبہ حاصل تھا لیکن آنحضرت صلعم نے ان سارے غلط و گمراہ کن
عقائد کے خلاف ایک احتجاج شروع کیا جو بہت کامیاب رہا۔ اسی وجہ سے انہوں نے خود کو ایک کامل دنیادار
کی مانند پیش کیا۔ کئی شادیاں کیں۔ سماج میں رہ کر، سماج کے معقول اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اُسکی خامیوں
کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ایک معاشری ماحول میں، ہر طرح کے مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی ربِ حقیقی
کو نہ بھولنا اُس کی یاد کو تازہ رکھنا یہ اسلام کے نبیؐ کی سب سے بڑی مجاہدانہ تعلیم ہے اس طرزِ عمل سے آج کل
جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ دنیا سے قطع تعلق ہر قسم کی علمی و ادبی اور تحقق ذات کے لئے ضروری ہے اُس کا
بخوبی ازالہ ہو جاتا ہے اور ایک صحیح راہ عمل ہمارے لئے متعین ہو جاتی ہے۔ جس طرح سے پھول پانی میں رہتا
ہوا بھی اپنی پنکھڑیوں کو تر نہیں کرتا اُسی طرح سے ہم سارے فرائض دینوی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ کسی میں کلّی طور
پر منہمک نہ ہو جائیں، بلکہ ہر قسم کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ ہمارے ذہن میں رب العالمین کی یاد ہمیشہ تازہ رہے
اور ہم

دل بایار و دست بکار

کے اصول کے پابند رہیں۔ مختصراً یہ کہ آنحضرتؐ نے کسی حالت میں رہبانیت یا مرتاضیت کو برتر نہیں بتایا بلکہ
بہر صورت کشمکش و جد و جہد کی زندگی کو ہی سعی اور برتر بتاتے رہے۔

آج کل ایک سوال جو بہت زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ معاشری زندگی میں عورتوں کو کس قسم کے
حقوق حاصل رہیں۔ کیا انہیں مردوں کے دوش بدوش ہر شعبۂ حیات میں مساویانہ حیثیت دیدی جاوے۔ اسی
قسم کے حالات سے بانیٔ اسلام کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا کیونکہ آنحضرتؐ کے ظہور سے قبل طبقۂ نسوان کی حالت
بہت خستہ تھی۔ عیسائیوں نے تو عورت کو ایک لعنت بتایا تھا جس کی وجہ سے کہ حضرت آدمؑ کو ذلیل ہونا پڑا۔ غرض کہ
ایسا اہانت آمیز سلوک اُن کے ساتھ کیا جاتا تھا کہ وہ بیان میں نہیں آسکتا۔ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی
تھیں۔ قدم قدم پر ذلیل کیا جاتا تھا اور ہر قسم کی تعلیم و تربیت سے بالکل محروم رکھا گیا تھا۔ لیکن نبیٔ اسلام نے
وقت کی ضرورت کو محسوس کیا اور تعلیم دی کہ

"جیسے تمھارے اپنی بیوی پر بعض حقوق لازم ہیں اُسی طرح سے اُس کے بھی چند حقوق

تم پر ہیں۔ ہر طرح سے تم پر اُن کے جذبات کا احترام واجب ہے"

غرض کہ اس طرح سے مساوات یگانگت و ہم آہنگی کا درس اُس زمانے کے جہلاء کو جب ملا تو چند ہی سال کی مدت میں وہ اس قابل ہو گئے کہ ایک قومی محاذ قائم کر کے کئی ممالک پر قبضہ حاصل کر سکیں۔ اس مسئلہ کو آنحضرتؐ نے جس خوبی سے حل کیا ہے وہ یقیناً قابل داد ہے اور اس کی تقلید کر کے ہم آج بھی ایک خوشگوار فضا پیدا کر سکتے ہیں جو ہماری ازدواجی زندگی کو قابل رشک بنا دے گی۔

ایک ایسے مرسل کی زندگی کیا ہمارے لئے حقیقتاً کوئی سبق نہیں رکھتی جس نے موحدانہ روش اختیار کر کے باوجود سارے قبائل کی مخالفت کے ذات باری کی فضیلت کو عوام پر مسلط کر دیا، جس نے باطل عقائد کی بیخ کنی کر کے اُس معاشرہ کے آگے جو جہالت و پستی کا شکار تھا ایک وسیع میدان عمل پیش کیا جس نے قدرت کے مفوضہ ایک اہم فرض رسالت کی انجام دہی سے ایک درخشان عہد کا آغاز کیا۔ اگر اب تک جتنے بھی مذہبی رہنما گزرے ہیں اُن کے حالات زندگی کا ہم غائر مطالعہ کریں تو ہمیں سب میں بعض مشترک اوصاف حسنہ ضرور ملیں گے۔ ان کی تقلید سے ہم اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال سکنے کے قابل ہوں گے جو بہر حال آئندہ کی فلاح کا پیش خیمہ ہو گی۔ آج جو سوالات و عمرانی مسائل حل طلب ہیں اُن کا تشفی بخش جواب خود آنحضرتؐ کی سیرت کے مطالعہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے اپنے زمانوں میں سیاسی و مذہبی مفکروں نے اس بات کی کوشش کی کہ سارے ممالک کو کسی رشتہ الفت و اتحاد میں منسلک کر دیں اور اس طرح سے ایک وسیع مملکت قائم کریں لیکن کسی کو ایسی شاندار کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ آنحضرتؐ کو ہوئی۔ کیونکہ ان کی حکومت مملکت دل پر تھی۔ انہوں نے قلب کی تسخیر کی تھی۔ قتل و غارت گری، شدید خونریزی سے جتنی شہنشاہتیں قائم ہوئیں سب ایک مدت معینہ کے بعد حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں لیکن آنحضرتؐ کی تعلیمات سے کے جو اثرات اُس زمانہ کی معاشرتی و تمدنی زندگی پر تھے وہ اُس دن سے کہیں زیادہ آج دیرپا نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے جس قسم کے خیالات کی اشاعت کی وہ بالکلیہ معقول اور خاص و عام کے لئے قابل قبول تھے۔ دوسرے یہ کہ اُن کی سیرت خود ہر حیثیت سے مکمل تھی جس نے انہیں اُس اعلیٰ مرتبہ تک پہنچا دیا کہ آج صدیاں گذر گئیں لیکن پھر بھی دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسلام کے پیرو اسی عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے نبیؐ کو یاد کرتے ہیں۔

رائے نارائن پرشاد سریواستو متعلم ایم۔ اے۔ (ابتدائی)

غزل

شائستہ نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
آہوں کو بے پناہ کئے جا رہا ہوں میں

اک خانماں خراب کی بربادیاں ہی کیا
ان کو تو رو براہ کئے جا رہا ہوں میں

جیسے کہ عمر بھر انھیں دیکھا نہیں کبھی
رہ رہ کے یوں نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

اظہار جذبِ شوق بھی کرنا ضرور تھا
دانستہ یہ گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اللہ رے میرے حسن تماشا کی آذری
عالم کو جلوہ گاہ کئے جا رہا ہوں میں

غمخانۂ نگاہ میں آتا نہیں کوئی
اک عمر فرش راہ کئے جا رہا ہوں میں

وہ دن گئے کہ تاب نہ تھی ضبط آہ کی
اب آرزوئے آہ کئے جا رہا ہوں میں

جیسے مری اجل کو اجل آ گئی قتیلؔ
یوں زیست سے نباہ کئے جا رہا ہوں میں

عبدالحفیظ قتیلؔ ایم۔ اے۔ (ابتدائی)

سکون

سکون ایک جذبہ اور ایک نفسیاتی چیز ہے جس کا تعلق صرف احساسات سے ہے۔ اس کیفیت کی تفسیر کو چند الفاظ میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شئے اور ہر ذی نفس اپنے ایک "خاص جمود" میں اس کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ دریا کو دیکھو بہتا چلا جاتا ہے کہیں رُکنے کا نام نہیں لیتا آخر اس کی روانی سمندر کے آغوش میں پہونچ کر دم لیتی ہے ——— یہی دریا کا "قرار" ہے۔

انسان کی زندگی کی ناؤ کا بھی یہی حال ہے۔ مسرت و غم، سکون و ہیجان۔ کے دھارے پر بہتی چلی جاتی ہے ——— بالآخر موت کے بے پناہ تھپیڑوں کی تاب نہ لاکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے ——— شائد یہی ہماری زندگی کا سکون ہے۔

لیکن اس "ابدی سکون" سے پہلے بھی دنیا میں دل کی حقیقی مسرت حاصل کیجا سکتی ہے ——— دانتے کہتا ہے۔ "مجھے ہر طرف غائت درجے کی مسّرت معلوم ہوتی تھی، موجودات کا چہرہ گلبیۂ خنداں دکھائی دیتا تھا۔ ناممکن البیان انبساط، امن اور محبت کی دائمی زندگی، لازوال دولت اور لاانتہا برکت ہر طرف نظر آتی تھی" ——— اس سے ظاہر ہے کہ "سکون کامل" کو مفقود نہیں خیال کیا جاسکتا۔ میرے خیال میں تو اس دولت کے حصول کے لئے کسی خارجی شئے کی ضرورت نہیں۔ خوشی خود ہمارے اندر ہمارے نفس نفس میں موجود ہے اور اس کو "ایثار" "خود فراموشی" اور "ترک ہوس" سے حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ قدرت ہمارے ان حاصل شدہ سکون کے لمحات کو بلا کی تیز رفتاری بخشدیتی ہے اور جوانی کے رنگین اور کیف آگیں ایام سمٹ کر ایک "لمحہ" بن جاتے ہیں۔ یہ "قرار حقیقی" جب شاعر کی دنیا میں پہونچتا ہے تو "عنقا" ہو جاتا ہے ——— وہ کیف، بیخودی سرور اور اپنے شعروں کی حسین مورتوں کی پرتش ہی کو اپنی زندگی سمجھتا ہے اور اسی میں "سکون دل" تلاش کرتا ہے ———

لیکن اسے کامیابی نہیں ہوتی ———

پھر وہ اپنے بے پناہ تخیل سے ایک ایسی بستی آباد کرتا ہے جہاں ——— صبا کے روح پرور جھونکے ہمیشہ چلتے رہتے ہیں اور "محبت" اور "حسن" کے راگ مدام الاپے جاتے ہیں۔ جہاں ——— وقت سسکیاں لیتا ہوا مردہ پڑا رہتا ہے جہاں ———

جہاں بہتے ہوئے دریا مسلسل گنگناتے ہیں
جہاں راتوں کی خاموشی میں انجم مسکراتے ہیں
جہاں دامن سرشکِ چشم تر سے نم نہیں ہوتا
جہاں ناکامیٔ تقدیر کا ماتم نہیں ہوتا
جہاں نغمے نکلنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں
نفس کے تار لرزاں صورت سیماب رہتے ہیں
جہاں موسیقیوں میں جذب ہو جاتی ہے خاموشی
جہاں نغموں کے ہنگاموں میں کھو جاتی ہے خاموشی

اور جہاں ——— نیند پھولوں کی خوشبو میں آسودہ رہتی ہے۔ لیکن افسوس یہاں بھی اُس کا بیچین دل سکون بدامن نہیں ہوتا اور وہ مایوس ہو کر یہ نغمہ الاپتا ہے:۔

اے دنیا! مجھ سے سب کچھ لے لے۔ سب کچھ
میری حسین جوانی ——— میرے پوشیدہ خیالات
میرے نامکمل گیت ——— مجھ سے سب کچھ لے لے
لیکن مجھے پریشان کرنے والی خوبصورت دنیا!
مجھے سکون کی ایک رات اس کے عوض دیدے
صرف ایک اندھیری رات
خاموش اور پُرسکون رات

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

حسین گزارش

جہاں تاروں کی ٹھنڈی روشنی نزہت بدامن ہو
جہاں جھونکا نسیمِ صبح کا عشرت بدامن ہو
جہاں ہر ذرہ ذرہ خاک کا فطرت بدامن ہو

چل اے میری بہارِ زندگانی چل وہیں چلدیں
چل اس دنیائے معصیت کو ٹھکرا کر کہیں چلدیں

جہاں پانی پہ کرنیں ماہِ نو کی رقص کرتی ہوں
جہاں تکمیل کی ضو میں تمنائیں نکھرتی ہوں
محبت کی جہاں بکھری ہوئی زلفیں سنورتی ہوں

چل اے میری بہارِ زندگانی چل وہیں چلدیں
چل اس دنیائے معصیت کو ٹھکرا کر کہیں چلدیں

جہاں چشموں کی خوابیدہ روانی کیف پھیلائے
جہاں ارماں بدامن نوجوانی لطف دکھلائے
جہاں ہستی کی بے مقصد کہانی رنگ برسائے

چل اے میری بہارِ زندگانی چل وہیں چلدیں
چل اس دنیائے معصیت کو ٹھکرا کر کہیں چلدیں

جہاں بہتے ہوئے جھرنے تکلم ریز رہتے ہوں
جہاں کھلتے ہوئے غنچے ترنم ریز رہتے ہوں
جہاں قدرت کے نظارے تبسم ریز رہتے ہوں

چل اے میری بہارِ زندگانی چل وہیں چلدیں
چل اس دنیائے معصیت کو ٹھکرا کر کہیں چلدیں

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

پھول کی سرگذشت

میں کیا ہوں ؟ کیوں پیدا ہوا ؟ یہ مجھے نہیں معلوم !

صبح عالم وجود میں آیا، شام مرجھا گیا —— یہی میری عمر ہے اور یہی میری زندگانی ——

اس ایک دن کی زندگی کا منشا کیا ہے؟ — یہ میں نہیں بتا سکتا ! ۔ لیکن اس ایک دن میں، میں نے بہت کچھ دیکھا ۔ وہ سب کچھ دیکھ لیا جو دوسرے، برسوں میں نہیں دیکھ سکتے ۔

جب کبھی میں دکھائی دیتا ہوں، مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ۔ کیف کا ایک سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ افسردہ دل شادمان ہو جاتے ہیں معصوم بچوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں ۔ عاشقوں کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں ۔ شاعر گنگنانے لگتے ہیں ۔ انسان بے اختیار میری طرف بڑھے چلے آتا ہے ۔ نرم اور شیریں الفاظ میں مجھ سے کچھ کہتا ہوا نہایت ملائمت سے مجھے چھوتا ہے ۔ اور بہت احتیاط سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، کلیجے سے لگاتا ہے، سونگھتا ہے، پیار کرتا ہے، مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے ۔

بچے مجھ سے کھیلتے ہیں، اپنے گھروندوں کو مجھ سے آراستہ کرتے ہیں ۔ شوقین طالب علم گلدستہ بنا کر مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں ۔ نوجوان اپنے بچھونوں کی مجھ سے آرایش کرتے ہیں ۔ مرد اپنے کوٹ پر مجھے لئے لئے پھرتے ہیں ۔ دولہا اپنے سر پر مجھے باندھ کر شب گشت کرتا ہے ۔ تحفوں کی شکل میں، میں ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہوں ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب میں صنف نازک کے ہاتھ میں جاتا ہوں تو میری قدر اور بڑھ جاتی ہے ۔ میری ناز برداری کی جاتی ہے ۔ میری شوخیاں سہی جاتی ہیں ۔ مجھے ہمیشہ سر میں لگائے رہتی ہیں ۔ دلہنیں گلے میں پہنتی ہیں سہیلیاں ایک دوسرے پر سے نچھاور کرتی ہیں ۔ میں کبھی اُن کے خوبصورت رخساروں سے سرگوشیاں کرتا ہوں تو کبھی اُن کا "لب آشنا" بنتا ہوں ۔ غرض حسین اگر مجھے چاہتے ہیں تو

بدصورت بھی مجھے پیار کرتے ہیں ۔ بہر حال ہمیشہ سے صنفِ نازک کو مجھ سے بہت اُنس رہا ہے اور رہے گا پچھلے زمانے میں ملکہ نور جہاں نے تو نہ صرف مجھے بلکہ میری روح کو بھی مسخر کر لینا ساری دنیا کو سکھایا تھا ——

یہ ہے میری عزت، عظمت و منزلت آج سے نہیں ہمیشہ سے یہی میری حالت چلی آ رہی ہے ۔ امیر و غریب عورت مرد، بچے بوڑھے، اہل شرق و اہل مغرب غرضکہ ساری دنیا میں میری چاہت ہے ۔

میں ہی ہوں جو کبھی بادشاہوں کے ہاتھ پر بیٹھ کر انکی سیاست سُنتا ہوں تو کبھی غداروں کی غداری بھی ۔ مسجدوں میں کبھی میلاد شریف سُنتا ہوں تو کبھی مندروں میں بھجن اور گرجاؤں میں "سرمن بھی"۔ کبھی امیروں کے محلات میں عیش و سرور کے نغمے سُنتا ہوں تو کبھی غریبوں کے گھروں میں حسرت و یاس کے نالے ۔ مجھے کوئی عشق و محبت کے افسانے سُناتا ہے تو کوئی فراق کی دکھ بھری داستان ۔ کوئی میرے سامنے اپنی محبت کی سوگند کھاتا ہے تو دوسرا مجھے ضامن ٹھیراتا ہے ۔

لیکن یہ سب سن کر میں خاموش کیوں ہوں ؟ یہ نہیں کہہ سکتا ! ۔

میں ہی ایک ہوں جس کا وجود محلوں اور جھونپڑیوں کی ہر چھوٹی بڑی تقریب کے لئے یکساں لازمی ہے ۔ کوئی گھر نہیں جہاں میری ضرورت محسوس نہ کی جاتی ہو ۔ کوئی چمن نہیں جو مجھ سے زینت نہ دیا جاتا ہو ۔ ہر جگہ ہر تقریب میں چاہے وہ خوشی کی ہو چاہے غم کی مجھ ہی کو رکھا جاتا ہے ۔ استقبال مجھ سے کیا جاتا ہے اور وداع بھی مجھ ہی سے کیا جاتا ہے ۔ جہاں میرے نام سے مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے وہیں غم و الم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ میں ہی ہوں جس سے سہرا بھی تیار ہوتا ہے اور چادر تربت بھی ۔ میں ہی ہوں جس سے لحد بھی سنواری جاتی ہے اور حجلۂ عروس بھی ۔

— یہ کیا راز ہے ؟ اس سے میں واقف نہیں ! ——

میں اسی میں شاد ہوں کہ میرا حسن خاص، میری مقبولیت عام ۔ حسین ترین عورت بھی میری خوبصورتی کے آگے دم نہیں مار سکتی ۔ لوگ اس کو مجھ ہی سے تشبیہ دیتے ہیں اور اکثروں کو تو میرے ہی نام سے بلاتے ہیں ۔

کئی تقاریب تو ایسی ہیں جن کی رسومات میرے بغیر ادا ہی نہیں ہو سکتے ۔ گلپوشی، پھول پہننا، پھول چڑھانا وغیرہ تو میرے ہی نام پر موسوم ہیں ۔

غرضکہ جب اس شہرت و مقبولیت کے افسانے مجھے نسیم صبح سناتی ہے اور گدگداتی ہے تو میں ہنس پڑتا ہوں

اور سورج کی سرخ و سفید کرنیں میری خوبصورت پنکھڑیوں میں نور کی ضیا پاشی کرتی ہیں تو میری خوبصورتی دوبالا ہو جاتی ہے اور میں غرور حسن کے نشہ میں مست ہو کر جھومنے لگتا ہوں اور اس قدر جھومتا ہوں کہ سرمست و مغرور ہو جاتا ہوں۔ لیکن جب شام کے تند و تیز ہوا کے گرم جھونکے مجھے اپنی بیخودی سے چونکا دیتے ہیں اور ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد اور کمزور کرنیں میرے غرور پر ہنستی ہیں تو میں شرمندہ ہو کر سرنگوں ہو جاتا ہوں۔

"ش۔م۔خ"

"کیٹس"

کیٹس نہ تو کافی طور پر انقلابی شاعر تھا اور نہ صحیح معنوں میں خیالی اور تصوری اس کی مثال ایک ایسے فطری مصور کی ہے جو اپنے ماحول کی ہر چیز کو ایک نئے نظریہ ایک نئے جذبہ سے دیکھتا ہے وہ بائرن کے طوفان خیز جذبۂ انقلابی سے ناواقف ہے اور اس کو شیلے کے جوش، ہمدردی بنی نوع انسانی اور ان کی سرگرم محبت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے نقطۂ خیال کے مطابق شاعری فلسفہ کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی اور نہ مذہبی تعلیمات کیلئے موزوں ہے، اور نہ معاشرتی اور سیاسی نظریوں کو منظر عام پر لا سکتی ہے بلکہ وہ ایک حسن ہی کی آفریدہ اور صرف حسن ہی کا پرتو۔ جان کیٹس ۳۱ر اکٹوبر ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوا اور اس کی اچانک وفات ۲۳ر فروری ۱۸۲۱ء میں واقع ہوئی لیکن اس کی تمام شاعری کا زمانہ صرف ۴ سال رہا۔ ۱۸۲۰ء کے بعد اس نے کوئی نظم نہیں لکھی کیٹس کی شاعری کے متعلق ہم کو بہت کچھ معلومات ان خطوط سے حاصل ہوتے ہیں جو اس نے اپنے دوستوں کو لکھے تھے، اگرچہ مرض دق اس کی ناگہانی موت کا سبب ہوا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے جذبات محبت اور احساسات کی بہت سختی سے مزاحمت کی گئی کیونکہ اس کی شاعری Fanny Brown کی وجہ سے وجود میں آئی وہ جو کچھ کہتا صرف اسی بے وفا محبوب کے لئے ہی کہتا تھا لیکن اس کا دل صرف توڑا ہی نہیں گیا بلکہ اس کو مہلک طور پر زخمی کیا گیا، اکثر شعرا خاص طور پر اس کے عہد کے یا تو موثر ماحول میں رہ کر شاعر بنے یا پھر ان کے آبا و اجداد شاعر تھے لیکن جان کیٹس ان دونوں چیزوں سے محروم تھا اس نے ایک غیر شاعرانہ فضا میں پرورش پائی جہاں ادب اور شاعری کا نشان تک نہ تھا لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں اس قدر جلد نشو و نما پائیں۔ اس پر بھی وہ کس یقین کے ساتھ کہتا ہے "میرا خیال ہے" وہ کہتا ہے "میری وفات کے بعد میرا نام بھی انگریزی مشہور شعرا کے ساتھ زندہ رہے گا" آرنالڈ نے اس کے ساتھ اضافہ کرتے ہوئے کہا

"یقینی وہ ہے ..... اور وہ شیکسپیر کے ساتھ ہے" دوسرے نقادوں نے بھی کیٹس کو شیکسپیر کے مقابل میں کھڑا کیا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ ناسازگار وقت کے باوجود سوائے ان دو شعراء کے کسی نے شاعری کو اتنی بلندی پر نہیں پہونچایا اسی ضمن میں مڈلٹن کہتا ہے "لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ شکسپیر کی شاعرانہ زندگی کا سرمایہ ۳۰ سال کا تھا اور کیٹس کا صرف ۴ سال کا اور یہ ۴ سال بھی بیماری ناامیدی اور نامرادی سے گھرے ہوئے تھے" "ممکن ہے اگر وہ زندہ رہتا کم از کم معمولی عمر تک تو لوگ شکسپیر کو بھول جاتے" ملٹن کے مشہور مقولہ کے بموجب شاعری کو سادگی، جوش، اور جذبات کا حامل ہونا چاہئے قطع نظر ان دو خاصیتوں کے جذباتی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے کیٹس کے یہاں اس کی بلندی کو کوئی نہیں پہونچ سکتا وہ ایک ایسا جادوگر ہے جو بکثرت سحر آگین جذبات اور مسحورکن جوش رکھتا ہے اس کا معیار حسن شیلی سے جدا ہے اگرچہ "حسن" کیٹس کے جذبات اور احساسات کو ابھارنے کے لئے شیلی سے زیادہ موثر تھا لیکن وہ حسن غیر فانی نہیں جیسا کہ وہ خود کہتا ہے "حسن وہ حسن جو فنا ہونے والا ہے"

جمالیات کے گہرے نقوش اس کے یہاں موجود ہیں جو طرح طرح کی رنگینیوں اور موسیقیوں میں نظر آتے ہیں اس کے پاس عظیم ترین احساس موجود ہے جس کے اثرات سے محفوظ ہونے کے لئے جرأت آزما محبت قوت برداشت موت کا یقینی شرافت پسند. روح فسونگری دلیری الف لیلوی عجائبات سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے اور کیٹس ان چیزوں سے صحیح طور پر آشنا ہے جہاں تک نیچرل شاعری کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیچر کو صرف نیچر کی خاطر محبت کی نظر سے دیکھتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ قدرت کے رازوں سے بھی آشنا دکھائی دیتا ہے اس کی نیچر پرستی کسی اخلاقی جذبہ کے تحت نہیں تھی اور نہ عقل کی رہبری کے لئے بلکہ صرف مسرت اور دائمی مسرت سے لطف اندوزی کے لئے شیلے اور کیٹس دو ایسے ہمعصر تھے جو دنیا کو حسن سے آشنا کرانے آئے تھے لیکن ان دونوں کی منزل مقصود جدا جدا ہے شیلی کا راستہ آسمان سے زمین کی طرف ہے اور کیٹس کی راہ زمین سے آسمان کی طرف۔

حسن شیلے کے نزدیک علوم ذہنی میں سے ایک ہے وہ ایک دماغی پیداوار کا نظریہ ہے ایک روح ہے جو کائنات میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے، ہر جگہ ہر شئے میں موجود ہے لیکن کیٹس حسن کو ایک دوسری جگہ دعوت نظر دیتا ہے وہ کہتا ہے حسن احساسات کی سرفرازی ہے ایسے احساسات جو خود سرفراز کئے گئے ہوں وہ حسن کا

دلگرفتہ ہی نہیں بلکہ عاشق تھا حسن کے سامنے اس کی وہ حالت ہوتی ہے جو ایک پرستار کی اس کے محبوب کے سامنے ہوتی ہے جسے وہ جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتا ہے کیٹس کے حسن کا نظریہ یہ ہے۔

"حسن سچائی ہے اور سچائی حسن (اے شخص) تجھے دنیا میں صرف یہی جاننا ہے اور صرف یہی جاننا بھی چاہئے۔"

دوسری جگہ وہ کہتا ہے "ایک حسین شئے دائمی مسرت کا باعث ہوتی ہے" اسی حسن پرستی کے عقیدے نے اس کو بہ حیثیت ایک شاعر بلند تر انسان سے معنون کرنے پر مجبور کر دیا "ایک شاعر" وہ کہتا ہے خود بالکل غیر شاعرانہ ہستی ہے کیونکہ وہ چیزوں میں یکسانیت اور مطابقت نہیں رکھتی بلکہ وہ مسلسل کسی دوسری ہستی کیلئے مفید ثابت ہوتی ہے اور مکمل حیات کے لئے شمع راہ کا کام کرتی ہے۔"

یہ ایک سچے مقصد کا نظریہ ہے اسی لئے ہم کیٹس کو بجا طور پر ایک شاعر ایک بڑا شاعر کہہ سکتے ہیں وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ شاعری کیا چیز ہے اسی لئے وہ کہتا ہے "اگر شاعری اتنی قدرتی اور فطری طور پر نہیں آسکتی جس طرح درختوں میں پتے آتے ہیں تو بہتر ہے وہ نہ آئے۔

یونانی دیوتاؤں اور قدیم تاریخی قصوں سے اُسے بہت دلچسپی تھی اسی لئے اس کی نظموں میں جا بجا دلچسپ تلمیحات نظر آتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ مستند تاریخی اور مذہبی تلمیحات وہ بکثرت استعمال کرتا ہے لیکن اپنے خاص انداز بیان اور حسن خیال سے انہیں اپنا لیتا ہے۔ بلند پرواز اور وجد آگین نظموں میں کیٹس جس قدر مسرت اور شادمانی محسوس کرتا ہے ایسی صلاحیت کسی اور شاعر میں نہیں یہی نہیں بلکہ کوئی غم دل میں بھی اس سے نہیں بڑھ سکتا، وہ جوش دل سے ہر غم کے استقبال کو تیار رہتا ہے' الفاظ اور محاورات کی آراستگی نے بھی اس کی شاعری کو ممتاز کیا ہے، ورڈسورتھ کوہساروں کی تنہائی میں دلکشی اور حسن کی ایک دنیا پوشیدہ دیکھتا ہے شیلے ہوا کے جھونکوں اور نسیم سحری کی بے باک موجوں میں دلکشی اور حسن کے لامحدود جلوے دیکھتا ہے اور کیٹس خوفناک اندھیرے میں درد بھری پرغم تاریکی میں حسن اور دلکشی کی لاتعداد تصویریں دیکھتا ہے' یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ شاعری کو الجھاؤ سنگلاخ اور ادق سرزمین سے نکالکر سادگی جوش اور جذبات سے آراستہ کرنے کی کوشش صرف بائرن اور کیٹس نے کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ دو باکمال شعراء اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی

ہوئے ہیں، ایک ایسی دلگداز موسیقی کیٹس کی تمام نظموں میں موجود ہے جو اس کی شاعری کو نہایت ممتاز جگہ پہنچا دیتی ہے اور جو اس کو تمام انقلابی شعراء میں ایک خاص امتیاز اور خصوصیت بخشتی ہے، شیلی کے نزدیک محبت صرف اس چیز کا نام ہے

پروانے کی تڑپ (جو) شمع انجم کے لئے ہے۔
اور تاریکی کی جستجو (جو) نور کے لئے ہے۔

یہی محبت ہے اور اسی کا نام محبت ہے، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ تمام جاندار اور بے جان اشیاء میں روح محبت دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیٹس کا نظریہ محبت اپنے خیالوں کا آئینہ دار ہے، افسانوی تابش رومانی سحر آفرینی ہی نہیں اور اس کی محبت صرف خیالی ہی نہیں بلکہ وہ ایک قابل یقین حقیقت ہے جب وہ اپنے دبے ہوئے جذبات اور وجدانات پر نظر ڈالتا ہے تو وہ آرزومند نظر آتا ہے کہ اپنے محبوب کے زانو پر سر رکھکر لیٹا ہوا ہے اور اس کی موسیقی پرواز گرمی نفس سے ہر لحظہ محظوظ ہوتا رہے۔ ڈسمبر ۱۸۱۸ء میں اس کے بھائی ٹام نے وفات پائی اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جبکہ کیٹس Hamp Stead کی تکمیل میں مشغول تھا تو وہ ایک ایسی آگ میں جلنے لگا جس سے وہ ہمیشہ پرہیز کیا کرتا تھا وہ آگ فینی براؤں کی محبت تھی جس نے آخر کار اُسے جلا کر راکھ کر ڈالا نہ صرف اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا گیا بلکہ اس کی قدر بھی نہیں کی گئی اور نہ اسکی محبت کو محسوس کیا گیا گو فینی براؤن کو کیٹس کی شریک زندگی بننے سے انکار نہ تھا مگر وہ ایک کمزور ارادے کی عورت تھی جو صرف عیش پسند دل رکھتی تھی اور وہ کیٹس کی طبیعت سے بالکل مختلف تھی، کیٹس کے نوشتہ ڈراموں میں ہیروں کے کردار کی طرح وہ خود بھی ناسازگارانہ طور پر محبت کے ظلم میں گھرا ہوا نظر آتا ہے اور اس وقت اسکی زندگی کے صرف دو مقاصد تھے، محبت اور شاعری ان تمام ناکامیوں کے باوجود وہ فینی براؤن کو دل سے بُھلا نہ سکا حقیقت میں وہ ایک قابل قدر ہستی تھی جو صبر آزما اور پرخلوص ہونے کے علاوہ عالی فکر اور حاضر جواب بھی تھا، جوش اور اضطراب اس کی شاعری کا جزو اعظم ہیں کیونکہ وہ اسی جوش اور اضطراب کی بدولت حسن کے اصولوں کو سمجھ سکا گو اپنی محبت کے بہانے میں وہ ناعاقبت اندیش ضرور تھا لیکن یہ بات مسلم ہے کہ اسکی پریشانیوں مصیبتوں اور دکھ بھری زندگی ہی کی وجہ سے اس کی اعلیٰ شاعری ظہور میں آئی، کیٹس کی شاعری اور اسکی زندگی

اس کے اصولوں اور نظریوں کو سمجھنے کے بعد ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی دنیا کے مشہور ترین لوگوں میں سے ایک ہے اور ادب و شاعری کی فضا میں ہمیشہ زندۂ جاوید رہے گا واقعہ بھی یہی ہے کہ ایسی درخشاں ہستیاں دنیا میں شاذونادر ہی پیدا ہوتی رہیں، اب ہم اس کی مشہور نظموں پر ایک نظر ڈالیں گے۔

Hyperion یہ نظم دس جلدوں میں ہے۔ اس کو کیٹس کا سرمایۂ حیات کہا جاسکتا ہے یہ طویل نظم ملٹن کی مشہور نظم Paradfse lost سے ماخوذ ہے۔ یہ بہت دلچسپ مشغلہ ہوگا اگر ہم ان دونوں نظموں کو ایک ہی نشست میں باری باری سے پڑھیں اور دیکھیں کہ دو بہترین شاعرانہ دماغ ایک ہی چیز کو کن مختلف طریقوں سے ادا کرتے ہیں۔

Great Spirit Now یہ سانیٹ کیٹس کی شاہکار نظم تسلیم کی گئی ہے اس کے مطالعہ سے شاعر کی سیر حاصل علمیت کا اندازہ ہوجاتا ہے، اس نے تین شعراء کو زندۂ جاوید قرار دیا ہے لیکن ان میں صرف اس وقت ورڈسوتھ ہی غیر فانی ہے اور دوسرے دو شعراء کی جگہ شیلی اور خود کیٹس نے لے لی۔

On looking Into... کیٹس بھی شکسپیر کی طرح کچھ لاطینی اور تھوڑی بہت یونانی زبان جانتا تھا۔ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یونانی شعراء خصوصاً ہومر کے کلام کا مطالعہ کرنے کا کتنا شوق تھا۔

In Sleep and Poesy جس میں کیٹس نے بیان کیا ہے کہ شاعری کا وسیع نقطۂ نظر ہی ایک بڑا ذریعہ ہے اس سچائی تک پہونچنے کا جس کو صرف اس وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جبکہ ایک عرصہ تک حسن اور خوبصورتی کے اصولوں کو سمجھا جائے۔

On the Sea اس سانیٹ کا محرک شکسپیر کے مشہور ڈرامے King Lear کا یہ مصرع ہوا "کیا تم سمندر کی آواز سن سکتے ہو" یہ پوری نظم اس خیال پر منطبق ہے۔

Endy mion یہ نظم کیٹس کی Heroice cup let کے لئے بہت مشہور ہے اس کے بعض حصے اپنے حقائق کی وجہ سے غیر فانی ہوگئے ہیں۔

The Terror of Death یہ سانیٹ اس وقت کہی گئی جب کیٹس اپنے بھائی کے بستر مرگ کے پاس موجود تھا اور اس کو پہلی دفعہ اپنی قسمت کی ناسازگاری اور نامرادی کا احساس ہوا۔

The Eve St. Agnes.

To fancy
To Psyche
یہ نظمیں اس وقت لکھی گئیں جب شاعر فینی براؤن کی محبت میں بہت مسرور تھا، اُمنگوں

اور آرزوؤں کی ایک ایسی فضا میں سانس لے رہا تھا جہاں شادمانی ہی شادمانی تھی Lamia یہ نظم اس وقت کہی گئی جب کیٹس کی مسرتوں اور امیدوں کی دنیا میں اندھیرا آچلا تھا اور وہ مجسم غم بن چکا تھا، اس کے بعد کیٹس کے چار مشہور قصیدوں کا ہم ذکر کریں گے اگرچہ یہ قصائد بہت جلدی اور لاپرواہی میں لکھے گئے ہیں لیکن حسن اور دلکشی اور پراثر جذبات کے کافی طور پر حامل ہیں۔ پہلے تین قصیدوں میں حُسن اور دلفریب طرز بیان کی ایک دائمی روح متحرک نظر آتی ہے اور اپنے طوفان خیز جذبات اور وجدانات روزمرہ زندگی سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں The ode to autumn یہ نظم Winchester میں لکھی گئی دوسری مشہور نظم Ode to a Nightingale اس کے بھائی کے وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد کہی گئی عندلیب کے غیر فانی نغمے سنتے سنتے شاعر مرجانا چاہتا ہے تاکہ وہ اس دکھ اور درد سے بھری ہوئی دنیا میں پھر قدم نہ رکھ سکے۔ یہاں شاعر نے ایک جادو موسیقیت پیدا کی ہے جو نہایت خوبی سے الفاظ کے اُتار اور چڑھاؤ میں موجود ہے اس نظم کی موسیقی، حسن اور جاذبیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلبل میٹھی آواز سے نغمہ ریز ہے بقول پروفیسر حسین علی خان یہ نظم نہ صرف کیٹس کی شاہکار ہے بلکہ انگریزی ادب کی جان ہے۔ Ode an a Grecian Urn اس نظم میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ زندگی فنون لطیفہ سے بالکل جدا ہے جبمیں صرف حسن دوامی ہے جس طرح عندلیب کے نغمے ابدی ہیں جو Ode on Melanchol یہ نظم کہتے وقت شاعر نہایت غمگین حالت میں تھا اسی لئے وہ کہتا ہے کہ ہم زندگی میں مسرت اور دلکشی اسی وقت حاصل کرسکتے ہیں جبکہ ہم درد اور غم میں گھرے ہوئے ہیں۔

ستمبر ۱۸۲۰ء کو کیٹس انگلستان کو خداحافظ کہہ کر اٹلی روانہ ہوا اور جب وہ اپنے منزل مقصود سے قریب تر ہوتا جارہا تھا اُس وقت کیٹس نے .... Bright Star یہ آخری سانیٹ کہی۔ کیٹس کی بعض نظموں کا آزاد ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

شعراء

رنج وغم کے آنسو بہانے والے اور مسرت وشادمانی میں گم ہونے والے شعراء
تم نے اپنی یاد کو ہمارے پاس چھوڑ دیا ہے
لیکن تمہاری روحیں آسمانوں میں رہتی ہیں
وقت واحد میں مختلف صورتوں میں تم دو جگہ رہتے ہو،

ہاں تم آسمانوں میں سرگرم گفتگو ہو
اور چاند سورج کی نغمہ بردار گردش سے محفوظ ہورہی ہو
اور آبشاروں کے سریلے گیت سن رہے ہو
فردوس بریں کے درختوں کی کانا پھوسی کو محسوس کررہے ہو
جنت کے سایہ دار درختوں کے سایہ میں بیٹھے
لامکانی پھولوں کو
جہاں گلِ بہار گلاب سے زیادہ عطر بیز ہیں
اور گلاب کی نکہتیں زمین کے پھولوں سے زیادہ روح پرور ہیں
جہاں عندلیب کے خوش آئند نغمے بے معنی نہیں
بلکہ سحر آگیں اور مسرت بخش ہیں
اور ان کے گیت سچائی کے حامل ہیں
جو آسمانوں کے رازوں سے آشنا ہیں
اور پند و نصائح اور عاقلانہ باتوں پر مشتمل ہیں
اس طرح تم اوپر بھی رہتے ہو اور پھر
زمین پر بھی زندہ ہو (اپنی غیر فانی نظموں میں)
جو ہم کو تم تک پہونچنے کا راستہ بتلاتی ہیں
جہاں تم عشرت سے ہمکنار ہو
بلا تھکے ہوئے اور بلا مسرت کی مسلسل کثرت سے گھبرائے ہوئے
یہاں تمہاری نظمیں
ہمارے رنج و غم مسرت و عشرت میں شمع راہ ہیں۔
ہمارے جذبات ہمارے وجدانات
ہماری شہرت اور ہماری نادانیوں کے لئے رہبر ہیں
اس طرح تم ہر روز ہمیں سکھاتے ہو
عاقلانہ باتیں اگرچہ نظروں سے دور ہو
رنج وغم کے آنسو بہانے والے اور مسرت وشادمانی میں گم ہونے والے شعراء!
تم نے اپنی یاد کو زمین پر چھوڑ دیا ہے
لیکن تمہاری روحیں آسمانوں میں رہتی ہیں
وقتِ واحد میں مختلف صورتوں میں تم دو جگہ رہتے ہو،

پُرمسرت دیوانگی

ڈسمبر کی کپکپا دینے والی ٹھنڈی رات میں
ٹھٹھرے ہوئے درخت کی برف پوش شاخیں کبھی یاد نہیں رکھتیں
اپنی گذری ہوئی رنگینیوں کو اور بہار کی ...
سرد ہوائیں اُنھیں فنا نہیں کرسکتیں
اور برف کے تودے اُنہیں مردہ نہیں کرسکتے
بلکہ وہ دوسری بہار کے قابل ہوتے ہیں
ڈسمبر کی کپکپا دینے والی رات میں
منجمد اور خاموش چشمے
پانی کی دلکش روانی کو بھول جاتے ہیں
گرم سورج کی رنگین شعاعوں میں ....
وہ ایک بھولی ہوئی یاد کی طرح
خاموش رہتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں

لیکن وہ بالکل فنا نہیں ہو جاتے
آہ کیا ایسا ہی ہوتا ہے بے شمار
عورتوں اور مردوں کے ساتھ
وہ تکلیف میں اپنے گذرے ہوے
محبت کے مسرور لمحے یاد کرتے ہیں
اور انہیں بہ چشم تر وسعت خیال میں لاتے ہیں
جب ان کا نشان تک نہیں ہوتا
ان دنوں کو بھولنے کی کوشش نہیں کرتے اگر وہ
درختوں چشموں کی طرح بھول جاتے تو اچھا ہوتا
لیکن محبت میں کبھی ایسا نہیں ہوتا

زندگی کے دور

چار موسم سال کے پیمانہ کو بھرتے ہیں
انسان کی ہستی کو بھی چار دور گھیرے ہوئے ہیں
جب اس کے خیالات پختہ ہوتے ہیں وہ جوش جوانی میں قدم رکھتا ہے
اس وقت ہر حسین شئے سے وہ بہت جلد متاثر ہوتا ہے
پھر اس کا سرگرم دور آتا ہے اور جبکہ قدرت خیال
تمام مسرتوں کو اس کے قدموں پر ڈال دیتی ہے وہ حسن اور محبت
کا مرکز بنا رہتا ہے۔
اور وہ ایک خیالی دنیا میں سرمست رہتا ہے
تیسرے دور میں اس کی روح تھکے ہوئے پرندے کے مانند
فرط پرواز کے قابل نہیں ہوتی اور گذرے ہوئے
جوانی اور مسرت کے لمحے اس کے پیش نظر رہتے ہیں
اور نئی آرزوئیں نئے حوصلے کوئی دلچسپی کا سامان نہیں رکھتے
وہ عام ہونے کی وجہ سے فرط مسرت کا باعث نہیں ہوتے
پھر اس کا دور خزاں آتا ہے زرد شکل میں
جبکہ وہ اپنی فطرت فانی کی طرف رخ کرتا ہے

عندلیب

اس غیر فانی نظم کے بعض حصوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے
میرے دل میں کچھ درد سا محسوس ہو رہا ہے اور مجھ پر ایک سکون پرور بیہوشی چھا رہی ہے
(کیونکہ اے عندلیب میں تیرے شیریں نغمے سن رہا ہوں)
میرے احساسات مدہوش ہوئے جاتے ہیں گویا میں نے
شراب تند کے کئی بوتل خالی کردئے ہیں
یا مجھے سحر آگیں تاثرات نے گھیر لیا ہے
یہ اس لئے نہیں کہ میں تیری پر مسرت زندگی سے حسد کرتا ہوں
بلکہ میں تیرے نغموں کی دائمی مسرت میں خود بھی ڈوب گیا ہوں
دور بہت دور میں تجھ تک آؤں گا
شراب پی کر نہیں مخمور ہو کر نہیں
بلکہ شاعری کی قوت تخیل کی مدد سے (اس دنیا کو بھلا کر)
میں ان وجد آفریں ساعتوں میں تیرے ساتھ ہوں
میرے خیالات تجھ تک مجھے لا رہے ہیں

یہ رات بھی کتنی حسین ہے ملکۂ شب (چاند) اپنے نورانی
تخت پر جلوہ افروز ہے۔
اور اس کے گرد اس کی سہیلیوں (تاروں) کے
جھرمٹ ہیں۔
تاریکی میں بیٹھا ہوا میں تیرے گیت سن رہا ہوں
میں اپنے اکثر شعروں میں موت کا طالب ہوا ہوں
میں صاف طور پر اس کی دعوت دے چکا ہوں کہ
وہ ایسے وقت میں آئے جب میں تیرے نغمے
سن رہا ہوں ایسے وقت مرنا قابل صد رشک ہے۔
جبکہ آدھی رات کے وقت دنیا کے آلام سے میں
بیفکر ہوں اور تیرے مدھ بھرے شیریں گیت
میں سن رہا ہوں ایسے خوش آئند لمحے میں۔

روشن ستارے (یہ نظم کیٹس کی آخری فکر سخن کا نتیجہ ہے)

اے روشن ستارے کاش میں بھی اپنی محبت میں تیری طرح
غیر متزلزل اور غیر تغیر پذیر ہوتا۔ فضائے بسیط پر چھائے ہوئے
محبت کی سرد مہری اور تنہائی کا خیال کئے بغیر صبر آزما
دل کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو دیکھتا
جس طرح قدرت خاموشی سے ہر چیز کا مطالعہ کرتی ہے
سمندر کی موجیں ساحل پر آ کر ٹکراتی ہیں
اور انسانوں کے گناہوں سے اس کو پاک کرتی ہیں
اے چمکدار ستارے تو برف کے تودوں کو گھورتا رہتا ہے
پہاڑوں اور گودیوں پر تیری نگاہیں ہیں
اس پر بھی تو غیر متزلزل اور غیر تغیر پذیر ہے
کاش میں بھی خاموش اور ساکت اپنے محبوب کے
سینے پر سر رکھے ہوئے اس کی نغمہ ریز گرمیٔ نفس سے
لطف اندوز ہوتا رہوں
اور میری زندگی اسی میں گذر جائے یا میں اسی حالت
میں مرجاؤں۔

غزیز احمد (عثمانیہ)

چھٹیوں میں

طالبات کے لئے زندگی کی دلچسپیاں لوٹنے کا صرف ایک موقع ملتا ہے اور وہ موسم گرما کی طویل تعطیلات ہوتی ہیں۔ طالبات کو خصوصیت اس لئے دی گئی کہ طلبا، تو اپنی دلچسپیاں ہر صورت میں نکال لیتے ہیں خواہ وہ ہنگاموں میں ہی کیوں نہ حاصل ہوں لیکن ہماری خواہشات تو فرصت ڈھونڈتی ہیں! سال بھر خانگی دوستوں کی دعوتوں کے لئے عذر لنگ یا عذر "معذور" ہونے لگتے ہیں۔ کسی نے گلہ کیا اور "انشاء اللہ چھٹیوں میں" کے مختصر جواب سے ان کی تمنا پوری کردی۔ کسی غریب نے ہمارے مستعملہ کپڑوں کی خواہش کی اور عدیم الفرصتی کا عذر کرکے "چھٹیوں میں" کہکر گلو خلاصی کرلی۔ امی نے خانہ داری سے بے بہرہ ہونے پر لکچر دیا اور "چھٹیوں میں" کہکر انہیں چپ کردیا۔ ہمیں پر کیا موقوف کسی سے اگر اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا کوئی خاص کھانا کھلانے کی آرزو کی جاتی ہے تو چھٹیوں پر ٹالدیا جاتا ہے۔

اب اس سے بحث نہیں کہ شدت گرمی سے ان کے نازک جسم ان کی جان بخشی کرادے گو اس وقت کسی کو یہ پوچھنا تو یاد نہیں رہتا کہ "سردی طبع کے باعث مغرب سے "رم آہو" کی طرح کیوں بھاگ نکلی تھیں؟ اب اتنی سی گرمی برداشت نہیں ہوتی، بہرحال موقعی حیلہ تو اچھا ہے "چھٹیوں میں"!! گملوں کی قطع برید کی ضرورت پڑی "چھٹیوں میں" کہکر اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس حالت میں چھٹیوں تک ان پر "سکرات" لگ چکی ہوتی!

پردے، میز پوش، غلاف اور پلنگ کی چادریں، جن کے جگر شب و روز کسی کاوش سے انجن ڈرائیوروں کی طرح قبل از وقت چھد گئے ہوں، حسن خدمت پر سبکدوشی چاہتے ہیں لیکن "چھٹیوں میں" یہ تبادلے نہایت آسانی سے سرانجام پاتے ہیں ورنہ ہمارا دفتر کثرت کار کے باعث خود سبکدوشی چاہنے لگے گا!

کالج کے متعدد مضامین ختم نہیں کئے، نوٹس باقی ہیں اور چھٹیوں میں کہکر اپنے اساتذہ کرام کو مطمئن کرادیا — کالج کا آخری روز ہے دوستوں سے ملاقاتیں ہورہی ہیں صرف چند لمحہ اپنے کو محظوظ کرنے کے لئے ملے ہیں لیکن "وہاں" ہماری سخت طلبی ہورہی ہے اور ایک طویل فہرست مضامین "ہوم ورک" کی "چھٹیوں میں" کی سریلی آواز کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے —! مطالعہ سرسری کی کتابیں ہیں اور کورس ختم نہیں ہوا تو بس چھٹیوں میں پڑھنے کا ارشاد ہوگیا۔ ہمارے خرمن تمنا پر کیسی بجلی گری ہوگی!؟ آخر کسی کا یہ شعر ؎

بلائیں ڈھونڈتی رہتی ہیں میرے آشیانے کو
تڑپتی پھر رہی ہیں بجلیاں خرمن جلانے کو

پڑھتے ہوئے چین بہ جبین "وہاں" سے رخصت ہوئے ۔ لائبریری ایک نظر عنایت کی محتاج ہے اور محض "چھٹیوں میں" کہکر اس کو اطمینان قلب دیدیا گیا۔

قرآن شریف حفظ کرنے کی تمنا ہے۔ عالم شعور میں آتے ہی اس کی سنگ بنیاد پڑ چکی اور اس عظیم الشان عمارت کی تکمیل پیش نظر ہے لیکن "چھٹیوں میں" اس کار خیر کی تکمیل اطمینان سے ہوسکتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے یونیورسٹی بن چکی اس کا افتتاح بھی ہوگیا۔ دنیا کی کایا پلٹ گئی۔ زمین والے آسمان کی خبریں لانے لگے۔ عزائم جلیلہ نے اپنے کرشمے و عجوبہ روزگار بنادئے لیکن ایک پورا نہیں ہوتا تو وہ ہمارا مقدس ارادہ!!!

غرض کیا بتاؤں کہ ان چھٹیوں پر ہماری ضروریات زندگی کا کتنا بڑا انحصار ہے! ہر کام جو موجودہ وقت پر کرنے کو دل نہ چاہے چھٹیوں پر ٹل جاتا ہے۔ اب اس سے بحث نہیں کہ ہماری چھٹیاں محض فرمائشی کھانوں سالنوں، میٹھوں اور میوؤں پر بسر ہوں یا تیراکی اور سیکل بازی کی "دل آویز" گھڑیوں پر یا نینی کی محبوبانہ ہمراہی میں ختم ہوجائیں یا موسم گرما میں آئسکریم کی دعوتوں میں۔ یا پھر دوستوں کی مہربانیوں اور اختر شماریوں پر یا غداروں کی سحر کاریوں اور غم روزگار کی ہر کاریوں پر یا عزیز و اقربا اور خود کی بیماریوں پر یا زمانہ کی فریب کاریوں پر یا خود کردہ را علاج نیست کی جگر کاریوں پر یا پھر کالج کھلنے کے انتظار، یا نتائج کے اخبار اور اس کی ہنگامہ بے تمیزی کے تماشہ بر پا اپنی "کرمفرما" کی ملاقات کی تمنا پر بہرحال جن چھٹیوں پر سال بھر کی تمناؤں کا انحصار ہو ان کا یوں خون ہوجائے! ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!!

میرے خیال میں اگر ہم ایک ڈائری بعنوان "چھٹیوں میں" بنائیں اور تمام نظام الاوقات ترتیب دے لیں اور ساری چھٹیاں اس کے مطابق کام کرتے رہیں تو شائد خلیفہ عبدالعزیز کی طرح کثرت کار کے باعث سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہ ملے۔

مجبوری تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھٹیوں کے بجا استعمال کا موقع بھی نہیں ملتا۔ کیا کریں!

مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہر ذاتی دکھانے کی

بیگم احمد النساء ثریا جبین (بی اے آخری)

ایک خط

اسیر شوق ہوں۔ فرقت نصیب ہوں آدوست
حدودِ مرگ سے گویا قریب ہوں اے دوست

خدا گواہ کہ اب وقفِ یاس رہتا ہوں
یہ حال ہے کہ ہمیشہ اداس رہتا ہوں

رلا چکی ہے بہت قسمت زبوں مجھ کو
گرا چکی ہے بہت لغزشِ جنوں مجھ کو

نشانِ راحتِ عہدِ کرم نہیں ملتا
سکون کہیں بھی تمھاری قسم نہیں ملتا

تمھاری یاد میں دن رات رو رہا ہوں میں
تمھیں خبر بھی ہے برباد ہو رہا ہوں میں

یقین نہو تو۔ ستاروں سے پوچھ لو آکر
چمن فروز نظاروں سے پوچھ لو آکر

سکوتِ شام وسحر کی کہانیاں ہیں گواہ
بہار و لالہ وگل کی جوانیاں ہیں گواہ

کوئی قرار کی صورت نظر نہیں آتی
مجھے اب اپنی ضرورت نظر نہیں آتی

یہ جانتا ہوں کہ تم واقفِ ملال نہیں
یہ جانتا ہوں کہ تم کو مِرا خیال نہیں

یہ جانتا ہوں کہ مجھ کو بھلا دیا تم نے
حقیقتوں کو فسانہ بنا دیا تم نے

اب التفاتِ محبت مجھے نصیب کہاں
حریمِ ناز کہاں اور میں غریب کہاں

مگر بایں ہمہ شاید وہ دن بھی آئیں گے
کہ میرے اشک تمھیں بھی کبھی رلائیں گے

قادر محی الدین احمد اسیر متعلم بی۔ اے (آخری)

بھکارن!

(ایک دلگداز نفسیاتی افسانہ)

یہ اُس وقت کی بات ہے لاجُو ـــــ جب ہم ٹولی بنا کر بھیک مانگا کرتے تھے ـــــ تب میری یہ پان کی دکان نہ تھی اور نہ میں آج کی طرح خوشحال تھا ـــــ خدا نے وہ دن بھی دکھائے ہیں بھائی! ـــــ آج کچھ بچتا نہیں ـــــ لیکن روٹی کپڑا تو خیر سے چل رہا ہے ـــــ اور یہ بھی سب کچھ اُسی بھیک ہی کی کمائی سے ہے ـــــ ہاں تو ـــــ میں کیا کہہ رہا تھا؟ ـــــ ہم ٹولی بنا کر بھیک مانگا کرتے تھے۔ ہم تین ساتھی تھے ـــــ میں، بندھو اور جیتو ـــــ ہم لوگوں کی زندگی دوسرے بھکاریوں سے کچھ مختلف تھی۔ ہم نے یہ پیشہ محض پیسے کمانے کے لئے اختیار نہیں کیا تھا اور نہ ہم پیدائشی بھکاری تھے ـــــ ہم لاچار تھے اسی لئے ہم مانگ مانگ کے بھوک کے شعلوں کو بجھاتے تھے۔

میں لاہور کے ایک چھاپے خانے میں ملازم تھا۔ تیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ گھر میں میرا کوئی نہ تھا ـــــ میں بالکل اکیلا تھا ـــــ ماں باپ مجھے اس پاپ اور دکھ کی بستی میں تنہا چھوڑ کر نور کی بستی میں چلے گئے تھے ـــــ جو تنخواہ مجھے ملتی تھی اسے میں کھانے پینے ہی میں اُڑا دیتا تھا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی تھی ـــــ ایک دن میں مشین چلا رہا تھا ـــــ کاغذ دھڑا دھڑ چھپ کر نکل رہے تھے، میں ہنس ہنس کر ایک دوست سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا اور کام بھی ـــــ میں اُن باتوں میں اتنا کھو گیا کہ میرا پیر مشین پر کب پڑا، کچھ خبر نہیں اس سے پہلے کئی دفعہ اسٹینڈ پر اس طرح پاؤں رکھ چکا تھا۔ لیکن اس دفعہ بدقسمتی سے میرا پاؤں اسٹینڈ پر نہ پڑا بلکہ چلتی مشین پڑا اور بری طرح

مجروح ہو گیا اور ساتھ ہی بالکل بے ہوش بھی ـــــ جب مجھے ہوش آیا تو میں دواخانے میں تھا۔ میرے پیر کا نچلا حصہ مشین میں بالکل پس گیا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر نے اس کو کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔ جب میں اچھا ہوا تو لکڑی ٹیکتا ہوا چھاپے خانے کے مالک کے پاس گیا۔ وہ بولا ـــــ "مجھے تم سے بے حد ہمدردی ہے۔ لیکن میں نے اب تو دوسرا نوکر رکھ لیا ہے۔ اور تم اب کام بھی تو ویسی تیزی سے نہیں کر سکتے۔ آج کل کام بھی بہت تھوڑا ہے۔ جب کام بڑھے گا اور مجھے تمھاری ضرورت ہوگی، تو میں تمھیں بلاؤں گا" میں بہت گڑگڑایا ـــــ "سرکار میں غریب ہوں! میرے پاس کھانے کو مطلق نہیں، میں بیٹھا بیٹھا کچھ کر لیا کروں گا" وہ بولا ـــــ "یہ لو ایک روپیہ۔ جا کر روٹی کھا لو، ابھی تو میرے پاس کوئی نوکری نہیں ہے، جب ہوگی، تب دیکھا جائے گا" میں لاچار اپنی قسمت کو کوستا اور اپنی موجودہ حالت پر آنسو بہاتا ہوا لوٹ آیا ـــــ

بہت سارے مقامات پر نوکری تلاش کی ـــــ لیکن مجھ لنگڑے کو پانچ روپے پر بھی کوئی نوکر رکھنے آمادہ نہ ہوا ـــــ ساتھی جو میرے ساتھ رات دن کھاتے پیتے رہتے تھے، وہ مجھے تاش کا جوکر سمجھ کر الگ ہو گئے ـــــ غرض کچھ دن، میں بھوک کی آگ میں بری طرح جلتا رہا ـــــ میرا دل بھوک سے تڑپنے کے باوجود مجھے بھکاری بننے کی اجازت نہ دیتا تھا ـــــ لیکن آہ! بالآخر مجھے پیٹ کے جہنم کے شعلوں کو بجھانے کے لئے لوگوں سے گڑگڑا گڑگڑا کر مانگنا ہی پڑا ـــــ اور میں کر ہی کیا سکتا تھا! ـــــ دوسرا ساتھی بندھو، ایک بار چوری کے الزام میں گرفتار ہوا تھا ـــــ جب جیل سے رہائی نصیب ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو اس سنسار ساگر میں اکیلا پایا ـــــ ایک چور کو کوئی اپنے پاس نوکر رکھنے کے لئے تیار نہ ہوا۔

تیسرا ساتھی جیتو ایک آنکھ کا کانا ہونے کے علاوہ کوڑھی بھی تھا۔ اس کا جسم اس درخت کے مانند تھا جس میں گھن لگ گیا ہو ـــــ اس کا جسم چمکتا تھا ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں سڑ گل کر جھڑ چکی تھیں ناک سوج کر پھیلی ہوئی بیماز کی طرح ہو گئی تھی۔ ہونٹ کچھ کچھ گل کر نیچے کی طرف لٹک آئے تھے اور اس کا سارا جسم بدبودار تھا اس کے جسم کی بدبو سے ہمارا ناک میں دم آ جاتا لیکن اسے ساتھ رکھنے کے لئے ہم مجبور تھے۔ کیونکہ اس کی ایسی حالت ہونے سے

ہمیں بھیک بہت ملتی تھی۔

اب ہم گلی گلی کوچہ کوچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے پھرتے تھے ——— "کوئی بھوکے کو پیسہ دے دے۔ کوئی محتاج کو روٹی دے دے"

ہر روز پو پھٹنے سے پہلے ہی ہم پڑاؤ سے چل پڑتے۔ جب مانگتے مانگتے گلیوں میں پہنچتے تو کچھ لوگ جاگ پڑتے، کچھ کروٹیں بدلتے اور کچھ جاگنے کے ارادے سے جمائیاں لیتے رہتے، سویرے ہمارے گانے کی آواز لوگوں پر اچھا اثر کرتی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب کہ ہماری جھولیاں نہ بھرتی ہوں۔ ہم خوش خوش پڑاؤ کو لوٹتے تھے ——— غرض اسی طرح ہمارے اچھے برے دن گذر رہے تھے ——— دن بھر بیساکھی کے سہارے مارے مارے گلیوں میں پھرنے سے میرے کندھے میں درد ہونے لگتا ——— لیکن جب رات کو باسی روٹی کے جھوٹے ٹکڑے، بدبودار سالن کے ساتھ حلق سے نیچے اُتارتے اور کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیتے تو ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی اور وہیں درخت کے نیچے زمین کے بچھونے پر سو جاتے۔ آہ! خدا کو ہماری یہ بدتر حالت دیکھ کر بھی ترس نہ آتا تھا ——— اب کسی کو بھی ہماری حالت پر رحم نہ آتا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ہمیں اس حالت میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے ——— عورتیں ہم لوگوں کو گاتا دیکھ کر جھٹ کواڑ بند کر لیتیں۔ لیکن ہم ان باتوں کا مطلق خیال نہ کرتے اور برابر چلایا کرتے ——— "دے دے بھائی، بھگوان تمھارا بھلا کرے گا۔ دیا لیا بھیا سنگ چلے گا، داتا رہے گا نام۔ بھوکوں محتاجوں کو روٹی دو۔ اے بھائی اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو" ——— اس طرح نہ معلوم ہم کیا کیا کہتے چلے جاتے تھے۔

عورتیں زور سے کواڑ بند کرتیں اور بڑبڑاتی ہوئی کہتیں ——— "ان موؤں نے بھی کیا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کیا ہم نے روز روز کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ مردود ہر دم آکر سر کھایا کرتے ہیں۔ ابھی کل تو روٹی دی تھی، اس گرانی کے زمانے میں اپنے ہی بال بچوں کی پرورش مشکل سے ہوتی ہے، تم لوگوں کو کہاں سے دیں۔ کیا ہم روز لنگر لگا کر بیٹھے ہیں؟" لیکن ایسی باتیں سن کر بھی ہم اپنا چلانا موقوف نہیں کرتے تھے کیونکہ ہر وقت ایسی باتوں کے سننے کے ہم عادی ہو گئے تھے۔ ہم یہ کہتے ہوئے آگے

بڑھ جاتے ——— "جو دے گا اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا" ہم در بدر پھرتے تھے۔ ہمارے لئے بھنگی چمار، ہندو اور مسلمان سب ہی داتا تھے ——— دولت مند ہمیں دھتکار دیتے تھے، لیکن غریب اپنے پسینے کی کمائی سے ہمیں کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

کئی بار ہم چلاتے رہتے؟ لیکن اونچے اونچے عالیشان محلات میں رہنے والے امیروں کے کانوں میں ہماری درد بھری پکار نہ پہنچتی۔ چلاتے چلاتے جب ہمارے حلق سوکھ جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے ہمارے گلوں میں سوئیاں چبھو دی ہیں۔ تب ہم ناامید ہو کر پھٹی آنکھوں سے ایکدوسرے کو دیکھتے اور پھر بازار کا رخ کرتے، بازار میں سینکڑوں گالیوں کے بعد بھی کچھ پیسے اور جھوٹے ٹکڑے مل ہی جاتے ——— رات کے وقت ہم پڑاؤ پہ باسی روٹی کے ٹکڑوں پر کتوں کی طرح لڑتے تھے اور دن بھر کا غصہ رات کے وقت ہم آپس میں نکالتے تھے ——— اس طرح ہماری زندگی روٹی کے جھوٹے ٹکڑوں، لوگوں کی گالیوں اور تانبے کے کچھ پیسوں پر گذر رہی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——— جاڑے کی ایک سرد رات تھی ——— برف سے زیادہ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی ——— ٹھنڈ سے جسم کانپ کانپ کر سن ہو رہا تھا ——— ہم درختوں کے سوکھے پتے جلا کر آگ کے پاس بیٹھے ہوئے روٹی کے کچھ ٹکڑوں پر جھگڑ رہے تھے۔ آگ کی لال لال لپٹیں ہم لوگوں تک آ آ کر لوٹ جاتی تھیں گویا وہ بھی ہماری ہنسی اڑا رہی تھیں۔

یکایک جیتو کی بھرائی ہوئی آواز میرے کان میں پڑی ——— "بھوکی ہے، روٹی کھائے گی؟"

میں نے اوپر دیکھا تو سامنے ایک تیرہ چودہ برس کی خوبصورت لڑکی ہماری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دن سے بھوکی ہے۔

اس دوشیزہ کو دیکھ کر ہم لڑنا جھگڑنا بھول گئے اور اسے بھی روٹی کے کچھ ٹکڑے کھانے کو دئے وہ روٹی کے کچھ ٹکڑوں پر اس طرح گری جس طرح چیل گوشت کے ٹکڑے پر گرتی ہے۔

جیتو نے میرا پاؤں دبایا اور میرے کان کے پاس اپنا منہ لا کر بولا ——— "ہیرا ہے! ہیرا!! سنا، اگر ہاتھ آجائے تو بہت کام آئے گا۔"

ہمیں بھیک بہت ملتی تھی۔

اب ہم گلی گلی کوچہ کوچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے پھرتے تھے —— "کوئی بھوکے کو پیسہ دے دے۔ کوئی محتاج کو روٹی دے دے"

ہر روز پو پھٹنے سے پہلے ہی ہم پڑاؤ سے چل پڑتے۔ جب مانگتے مانگتے گلیوں میں پہنچتے تو کچھ لوگ جاگ پڑتے، کچھ کروٹیں بدلتے اور کچھ جاگنے کے ارادے سے جمائیاں لیتے رہتے، سویرے ہمارے گانے کی آواز لوگوں پر اچھا اثر کرتی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب کہ ہماری جھولیاں نہ بھرتی ہوں۔ ہم خوش خوش پڑاؤ کو لوٹتے تھے —— غرض اسی طرح ہمارے اچھے برے دن گذر رہے تھے —— دن بھر بیساکھی کے سہارے مارے مارے گلیوں میں پھرنے سے میرے کندھے میں درد ہونے لگتا —— لیکن جب رات کو باسی روٹی کے جھوٹے ٹکڑے، بدبودار سالن کے ساتھ حلق سے نیچے اتارتے اور کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیتے تو ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی اور وہیں درخت کے نیچے زمین کے بچھونے پر سو جاتے۔ آہ! خدا کو ہماری یہ بدتر حالت دیکھ کر بھی ترس نہ آتا تھا —— اب کسی کو بھی ہماری حالت پر رحم نہ آتا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ہمیں اس حالت میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے —— عورتیں ہم لوگوں کو گاتا دیکھ کر جھٹ کواڑ بند کر لیتیں۔ لیکن ہم ان باتوں کا مطلق خیال نہ کرتے اور برابر چلایا کرتے —— "دے دے بھائی، بھگوان تمھارا بھلا کرے گا۔ دیا لیا بھیا سنگ چلے گا، داتا رہے گا نام۔ بھوکوں محتاجوں کو روٹی دو۔ اے بھائی اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو" —— اس طرح نہ معلوم ہم کیا کیا کہتے چلے جاتے تھے۔

عورتیں زور سے کواڑ بند کرتیں اور بڑبڑاتی ہوئی کہتیں —— "ان موؤں نے بھی کیا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کیا ہم نے روز روز کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ مردود ہر دم آکر سر کھایا کرتے ہیں۔ ابھی کل تو روٹی دی تھی، اس گرانی کے زمانے میں اپنے ہی بال بچوں کی پرورش مشکل سے ہوتی ہے، تم لوگوں کو کہاں سے دیں۔ کیا ہم روز روز لنگر لگا کر بیٹھے ہیں؟" لیکن ایسی باتیں سن کر بھی ہم اپنا چلانا موقوف نہیں کرتے تھے کیونکہ ہر وقت ایسی باتوں کے سننے کے ہم عادی ہو گئے تھے۔ ہم یہ کہتے ہوئے آگے

بڑھ جاتے —— "جو دے گا اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا" ہم در بدر پھرتے تھے۔ ہمارے لئے بھنگی چمار، ہندو اور مسلمان سب ہی داتا تھے —— دولت مند ہمیں دھتکار دیتے تھے، لیکن غریب اپنے پسینے کی کمائی سے ہمیں کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

کئی بار ہم چلاتے رہتے؟ لیکن اونچے اونچے عالیشان محلات میں رہنے والے امیروں کے کانوں میں ہماری درد بھری پکار نہ پہنچتی۔ چلاتے چلاتے جب ہمارے حلق سوکھ جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے ہمارے گلوں میں سوئیاں چبھو دی ہیں۔ تب ہم ناامید ہو کر پھٹی آنکھوں سے ایکدوسرے کو دیکھتے اور پھر بازار کا رخ کرتے، بازار میں سینکڑوں گالیوں کے بعد بھی کچھ پیسے اور جھوٹے ٹکڑے مل ہی جاتے —— رات کے وقت ہم پڑاؤ پہ باسی روٹی کے ٹکڑوں پر کتوں کی طرح لڑتے تھے اور دن بھر کا غصہ رات کے وقت ہم آپس میں نکالتے تھے —— اس طرح ہماری زندگی روٹی کے جھوٹے ٹکڑوں، لوگوں کی گالیوں اور تانبے کے کچھ پیسوں پر گذر رہی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ —— جاڑے کی ایک سرد رات تھی —— برف سے زیادہ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی —— ٹھنڈ سے جسم کانپ کانپ کر سن ہو رہا تھا —— ہم درختوں کے سوکھے پتے جلا کر آگ کے پاس بیٹھے ہوئے روٹی کے کچھ ٹکڑوں پر جھگڑ رہے تھے۔ آگ کی لال لال لپٹیں ہم لوگوں تک آ آ کر لوٹ جاتی تھیں گویا وہ بھی ہماری ہنسی اڑا رہی تھیں۔

یکایک جیتو کی بھرائی ہوئی آواز میرے کان میں پڑی —— "بھوکی ہے، روٹی کھائے گی؟" میں نے اوپر دیکھا تو سامنے ایک تیرہ چودہ برس کی خوبصورت لڑکی ہماری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دن سے بھوکی ہے۔

اس دوشیزہ کو دیکھ کر ہم لڑنا جھگڑنا بھول گئے اور اسے بھی روٹی کے کچھ ٹکڑے کھانے کو دئے وہ روٹی کے کچھ ٹکڑوں پر اس طرح گری جس طرح چیل گوشت کے ٹکڑے پر گرتی ہے۔

جیتو نے میرا پاؤں دبایا اور میرے کان کے پاس اپنا منہ لا کر بولا —— "ہیرا ہے! ہیرا!! سنا، اگر ہاتھ آ جائے تو بہت کام آئے گا۔"

روٹی کھا چکنے کے بعد جتیو اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا اور باتوں ہی باتوں میں اس نے بتایا کہ وہ لاوارث ہے، اس کا کوئی نہیں جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اس کے ماں باپ موت کا شکار ہو گئے ۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس بدنصیب کو کوئی اپنے یہاں پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا ۔ وہ بہت دنوں سے اسی طرح ماری ماری پھر رہی ہے ۔ ہاں لوگوں سے سُنا تھا کہ وہ ایک برہمن کی لڑکی ہے ۔ جتیو نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ——— "تم، ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو۔" اس کے بعد وہ اس سے بہت چکنی چپڑی باتیں کرنے لگا ۔ آخر کار وہ اُسے ہمارے ساتھ رہنے کے لئے راضی کر لیا ۔

ہماری ٹولی اب تین سے چار ہو گئی ۔ ہم نے اسے وہ تمام گیت سکھا دئے جنھیں گا کر ہم بھیک مانگا کرتے تھے ۔

اس حسین لڑکی کے آتے ہی ہمارے دن پھر گئے ——— شامو خوبصورت ہونے کے علاوہ گاتی بھی خوب تھی ۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا ۔ ہم اس کو ٹولی کے سامنے رکھتے تھے ۔ آگے آگے شامو اور پیچھے پیچھے ہم لوگ گاتے اور مانگتے چلے جاتے تھے ۔ شامو کی رسیلی آواز لوگوں کے دلوں پر اثر کئے بغیر نہ رہتی لوگ بلا بلا کر اس سے گیت سنتے اور بھیک دیتے تھے ——— وہ بڑے بڑے محلات میں رہنے والے دولت مند نوجوان، جو ہم لوگوں کی صورت دیکھتے ہی پھٹکار دیتے اور بابا معاف کرو کہکر ٹال دیتے تھے، اب وہی نوجوان ہمیں بار بار بلاتے، گھنٹوں شامو سے گیت سُنتے اور شامو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتے تھے ۔

ایک دن ایک رئیس کے یہاں بیاہ تھا ۔ ہم لوگ ایسے مبارک دن کے لئے تو دعائیں مانگتے تھے ۔ کیونکہ اس دن ہمیں لذیذ کھانا اور مٹھائیاں چکھنے کو ملتی تھیں ——— شامو زنانے میں چلی گئی ۔ شام کو جب ہم پڑاؤ کو واپس ہوئے تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ ہماری جھولیاں اچھی اچھی مٹھائیوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ اس شام کو ہم نے خوب جی بھر کر جھوٹے چاول، چوسی ہوئی ہڈیاں اور قسم قسم کی مٹھائیاں کھائیں ——— ہم جانتے تھے کہ یہ کتوں کی غذا ہے لیکن افسوس غربت نے ہمارے دل سے یہ احساس

دور کر دیا تھا ۔

ہم کھا پی چکنے کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے ۔ شامو نے بندھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "بیاہ میں بہت عورتیں تھیں بندھو بھیا ——— خوشنما لباس اور قیمتی زیورات میں وہ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں ——— ان کے کپڑے اس قدر اچھے تھے کہ کیا کہوں ؟ ——— جی چاہتا ہے کہ میں بھی ویسے بھاری کپڑے اور قیمتی زیورات پہنوں ۔" یہ سن کر میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی، میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ جتیو قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور منہ بنا کر بولا ——— "اری پگلی، تو کسی رانی کے پیٹ سے کیوں پیدا نہ ہوئی ؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ——— "شامو ہم لوگ بھکاری ہیں، ایسی قسمت کہاں ؟ ہمارے لئے یہی کیا کم ہے کہ اُلٹا سیدھا کھانے کو مل جاتا ہے ۔" بندھو نے آہ بھرتے ہوئے کہا ——— "جانے بھی دو بھیا، کیسی باتیں کرتے ہو ۔"

شامو ہماری باتیں سن کر اداس سی ہو گئی ۔ لیکن کچھ بولی نہیں ۔ ہم لوگ کبھی پلاؤ اور کبھی مٹھائی کا ذکر کرتے ہوئے سو گئے ۔

صبح جب ہم اُٹھے تو دن بہت چڑھ آیا تھا ۔ ہم نے دیکھا کہ شامو کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اور آواز بھی بھاری ہو گئی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات بھر نہیں سوئی ——— اس دن وہ گا نہ سکی ۔ جب ہم پڑاؤ کو پہنچے تو جھولیاں کھول کر روٹی کھانے لگے ۔ ہم نے دیکھا کہ شامو، ایک درخت کے تنے پر سر رکھکر سسک رہی تھی ۔

میں نے کہا ——— "شامو !" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ——— "ہاں بھیا !"

"کیا ہوا تمھیں ؟" میں نے پیار سے پوچھا ۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی بولی ——— "کچھ نہیں" میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا، اسے بخار تھا اور اس کا جسم توے کی طرح تپ رہا تھا ۔ اس رات میں سو نہ سکا ۔ محبت کی آگ میرے دل میں بھڑک رہی تھی ——— میرے دل میں شامو کی محبت گھر کر چکی تھی ——— اس دن میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھیک مانگنے نہ جا سکا ۔

شامو کی بیماری کی وجہ سے میں نے بھیک مانگنے جانا بند کر دیا ـــــ سارا دن اس کی تیمارداری میں لگا رہتا ۔ اس کے لئے خیراتی دواخانے سے دوا لاتا اور وقت پر کھلاتا ۔ بندھو اور جنتو شہر جاتے، اور جو کچھ لاتے اسی سے ہم چاروں اپنے پیٹ کی دوزخ کو بھرتے خدا خدا کر کے شامو کئی دن کے بعد صحت یاب ہوئی ۔

لیکن شامو اب وہ شامو نہ تھی ـــــ وہ ہر دم اداس اور غمگین نظر آتی تھی ـــــ وہ ہماری ٹولی کے آگے منہ لٹکائے چلا کرتی ۔

ہم میں سے ہر شخص اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن وہ خوش نہ ہوتی ـــــ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی ۔

کئی دن اسی طرح بیت گئے ـــــ اب شامو اکیلی جا کر بھی بھیک مانگ لاتی تھی ـــــ ایک دن وہ بہت خوش خوش واپس آئی ـــــ آتے ہی دونوں ہاتھوں کو ہمارے آگے رکھ کر بولی ـــــ "دیکھو کیسی اچھی چوڑیاں ہیں ۔ اب میرے پاس بھی اُن عورتوں کی طرح خوشنما لباس اور قیمتی زیورات آجائیں گے"۔

اس کے سفید چہرہ پر مسرت کی سرخی دوڑ رہی تھی جس سے وہ بہت حسین نظر آ رہی تھی ۔ بندھو نے اسے جھڑکتے ہوئے پوچھا ـــــ "ارے، یہ کہاں سے لائی ؟"

وہ بندھو کی طرف بغیر دیکھے ہی کہتی گئی ـــــ "گوال منڈی میں ایک بابو رہتے ہیں، وہ بڑے اچھے ہیں ۔ انہوں نے مجھے یہ چوڑیاں دی ہیں ۔ وہ مجھے اچھے اچھے کپڑے دیں گے، اچھے اچھے زیورات دیں گے اور وہ مجھے بہت سے پیسے بھی دیں گے، وہ بہت نیک ہیں"۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل میں زور سے گھونسہ مار دیا ہو ۔ میں نے پھٹی آنکھوں سے جنتو کی طرف دیکھا ۔

"دیکھو، اب پھر کبھی اس بابو کے پاس مت جانا، شہر کے لوگ بڑے خراب ہوتے ہیں، اگر جاؤ گی تو ٹھیک نہ ہوگا"۔ ـــــ جنتو نے ذرا سختی سے کہا ۔

رات کو جب شامو درخت کے تنے پر سر رکھ کر سو گئی تو بندھو نے آہستہ سے کہا ـــــ "اس کے

آثار اچھے نظر نہیں آتے ۔ بہتر ہوگا اگر ہم اس کو تنہا کہیں نہ جانے دیں، نہیں تو یہ خوبصورت چڑیا ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی"۔

اس کے بعد ہم بڑی ہوشیاری سے رہنے لگے ۔ ہم اس بات کی ہمیشہ کوشش کرتے کہ شامو ہم سے الگ نہ ہونے پائے، نیز ہم یہ بھی کوشش کرتے کہ شامو ہمیشہ خوش رہے ۔ جہاں تک ہو سکتا ہم اسے اداس نہ ہونے دیتے ۔

ایک دفعہ سویرے وہ یکایک کہیں چلی گئی اور بہت رات گئے واپس ہوئی ۔ ہم نے دیکھا وہ فیروزی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئی تھی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسرت رقص کر رہی تھی ـــــ صاف ستھرے کپڑوں میں وہ رانی معلوم ہو رہی تھی ـــــ اس کو دیکھتے ہی جنتو چلا اُٹھا ـــــ

"اری شیطان کی بچی کہاں گئی تھی ؟ ـــــ پھر گئی تھی اس بابو کے پاس ؟"

"ہاں گئی تھی تو کیا ہوا ؟" ـــــ اس نے یوں ہی لاپرواہی سے جواب دیا ۔

غصہ سے میری ابروؤں پر بل پڑ گئے ۔ میں نے اسے غصہ سے کہا ـــــ "شامو، یہ ٹھیک نہیں، تمھیں ہر وقت ہمارے ساتھ رہنا چاہئے ۔ ہماری اجازت کے بغیر تم کہیں نہیں جا سکتیں ۔"

"وہ دن مت بھولنا، جب بھوک سے بیتاب ہو کر ماری ماری پھرتی تھی ۔ اب نئے چاہنے والے پیدا کر لئے ہیں" ـــــ بندھو نے کہا ۔

یہ سن کر اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا ۔ اس نے زخمی شیرنی کی طرح گرج کر کہا ـــــ "تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے ؟ میرا جہاں جی چاہے گا، جاؤں گی ۔ تم سب اتنا کیوں اکڑتے ہو ؟ تمھارے پاس ہے کیا، جس پر اتنا اتراتے پھرتے ہو ؟ بڑے آئے میرا پیٹ پالنے والے ـــــ نہ تو مجھے پیٹ بھرنے کو روٹی ہی برابر ملتی ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ـــــ میں یہ چیتھڑے لٹکائے کیوں پھروں ؟ تم میرے ہوتے کون ہو ؟"

"ہم بھی دیکھیں گے، تو یہاں سے کیسے جاتی ہے ؟" ہم تینوں نے بہ یک آواز کہا ۔

"یہ بندر بھبکی کسی اور کو دینا ۔ میں اس بابو کے پاس جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی ۔ وہ مجھے

اچھے کپڑے دیتا ہے، عمدہ کھانے کھلاتا ہے تم لوگ لنگڑے، لولے، کوڑھی میری ہی مدد سے جی رہے ہو اور مجھ ہی پر اکڑتے ہو۔"

یہ کہکر وہ ہمیں منہ چڑاکر، ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی —— ہم اپنے مقام سے ہل تک نہ سکے، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

ہم رات بھر نہ سو سکے —— سویرا ہوا —— دن چڑھا —— دوپہر ڈھلی —— ہم اس کا انتظار ہی کرتے رہے —— لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آئی —— اس طرح کئی دن بیت گئے —— ہم اسے بھول جانے کی کوشش کرتے —— لیکن بھول نہ سکتے —— بہترا تلاش کرنے پر بھی وہ کہیں نہ ملی۔

شامو کے چلے جانے کے بعد میں کچھ کھویا سا رہنے لگا —— ایک دن ہم بھیک مانگ رہے تھے کہ ایک موٹر تیزی سے پوں پوں کرتی ہوئی ہمارے آگے سے نکل گئی۔ ہم نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا —— اس میں ایک اپٹوڈیٹ نوجوان کے ساتھ شامو بیٹھی ہوئی تھی —— وہ خوشنما ساڑی اور جگمگاتے زیورات میں رانی معلوم ہو رہی تھی —— ہم دیکھتے ہی رہے —— گویا خواب دیکھ رہے ہیں۔ پھر چونک کے ہم ایکدوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہم میں سے کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے —— جگنو کی حالت اب پہلے سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اس کا سارا جسم سڑتا ہی جا رہا تھا۔ اب وہ چل پھر بھی نہ سکتا تھا۔ ایک رات جو سویا تو پھر نہ اُٹھا —— کچھ روز بعد جب بندھو نے دیکھا کہ یہاں تو بھوک ہڑتال پر نوبت پہنچ چکی ہے تو وہ کسی دوسری ٹولی میں جا ملا —— اب میں اکیلا تھا —— کچھ دن ادھر اُدھر گھوما، لیکن دل نہ لگا۔ میں نے اپنے دل میں کہا —— چلو اب اس شہر ہی کو الوداع کیوں نہ کہدیں۔

دیوالی کا تہوار تھا —— امرتسر کے بازار میں میلا سا لگا تھا —— رات کو یہاں کا مندر روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے اور اس کی سجاوٹ دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں —— دیوالی کے تہوار میں صبح سے شام تک یہاں میلا لگا رہتا ہے —— آج بھی میلا ہی تھا —— لاکھوں

آدمیوں کا عظیم الشان مجمع تھا —— مندر میں لوگوں کی آمد و رفت بکثرت تھی —— میں بھی آنے جانے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر —— "بابو خدا کے نام پر بھوکے کو ایک پیسہ دیتے جاؤ خدا تمھارا بھلا کرے گا" کہتا جا رہا تھا —— مجھے خوب پیسے مل رہے تھے کیونکہ تہوار کے موقع پر ایک دو پیسے خیرات کر دینا کسی کو بھی بار نہیں معلوم ہوتا۔ رات کے گیارہ بجے تک بھیک مانگتا رہا —— جب میں نے بھیڑ سے باہر جاکر ایک کونے میں پیسے گنے تو پونے پانچ روپے تھے —— میں خوشی سے اچھل پڑا۔ اتنے پیسے جب سے میں بھکاری بنا تھا ایک دن بھی جمع نہ ہوئے تھے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھا۔ بغل میں بیساکھی ہونے سے میرے کندھے چور چور ہو رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ پڑاؤ پر جاؤں یا یہیں کہیں پڑ رہوں۔ میں ادھر اُدھر بیساکھی ٹیکتا ہوا جا رہا تھا کہ پان والی کی دکان کے پاس میری نظر ایک دبلی پتلی عورت پر پڑی، جو بڑی عاجزی سے آنے جانے والوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔

میں ٹھٹک گیا، مجھے کچھ شبہ ہوا، آگے بڑھا، اس کی گود میں ایک خوبصورت بچہ تھا، کوئی چھ سات مہینے کا۔

اب اس عورت کی صورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا اور میرے منہ سے بے اختیار نکل پڑا —— تم، تم یہاں کہاں شامو؟ اوہ! تم تو رانی بن گئی تھیں، اب رانی سے پھر بھکارن کیسے بن گئیں؟ وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگی اور اپنے بچہ کو زور سے سینے سے لگا لیا، لیکن کچھ بولی نہیں —— میں نے قہقہہ مار کر کہا —— "پگلی، کہیں بھکارن بھی رانی بن سکتی ہے؟ آخر دھوکا دیا نا اس بابو نے، گئی تھی رانی بننے —— جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے اسے کوئی نہیں مٹا سکتا —— آؤ میرے ساتھ، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ——" نیچے گردن جھکائے اور اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹائے وہ چپ چاپ میرے ساتھ ہو گئی —— ہم پڑاؤ پر پہنچ گئے اور ایک بڑے درخت کے نیچے دونوں بیٹھ گئے —— اوپر آسمان میں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی تھی اور کبھی آہ سرد بھر کر آسمان کی طرف ——

بہت دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے —— نہ تو میں ہی اُس سے کچھ بول سکا اور نہ وہ

ــــــ وہ ٹکٹکی باندھکر میری طرف دیکھ رہی تھی ــــ اس سے اس کا حال پوچھنے میری ہمت نہیں ہو رہی تھی ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ہمارے منہ کو قفل لگا دیا ہے ۔

مجھے ہوش آیا اور میں چونک کر بولا ــــ "اوہ ! شامو، تم اس ٹاٹ پر اپنے بچے کے ساتھ سو جاؤ ۔" میں نے اپنا ٹاٹ اس کو دیتے ہوئے کہا ۔

وہ سوگئی ــــ میں نے دل ہی دل میں کہا ــــ سویرے اس سے سب حال پوچھوں گا ــــ اور درخت کے تنے پر سر رکھ کر زمین پر سوگیا ۔

رات کے چار بجے بچے کے رونے سے میری آنکھیں کھل گئیں ــــ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا ــــ بچہ رو رہا تھا اور ــــ شامو وہاں نہ تھی ــــ وہاں دس روپے کے پیسے ادر آنے پڑے تھے ــــ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا ــــ میں نے اُسے چاروں طرف بہت ڈھونڈا ــــ اُس کا کچھ پتہ نہ چلا ــــ میں نے بچے کو اُٹھا لیا ــــ اور اس کو اپنا بچہ سمجھ کر پالا ہے ــــ اور اب وہی میرے لئے عصائے پیری ہے ــــ آج دس برس ہوگئے، وہ مجھے اس وقت سے اب تک کہیں نظر نہیں آئی ــــ

انہیں روپیوں کو ملا کر میں نے یہ چھوٹی سی پان کی دُکان کھولی ہے ــــ

(ترجمہ)

محمد علی نیّر بی ۔ اے (ابتدائی)

غزل

جلوہ نما ہے دردِ محبت کہاں کہاں
پھیلی ہوئی ہے غم کی حکایت کہاں کہاں

محکوم جسم و روح مسخر دل و دماغ
قائم ہوئی ہے اُنکی حکومت کہاں کہاں

دنیائے خواب میں کہ تصور کے عرش پر
رہتا ہوں اب میں تیری بدولت کہاں کہاں

رخسار میں حنا میں شفق میں شگوفہ میں
نکھری ہے خون قلب کی رنگت کہاں کہاں

شبنم پہ ضوئے مہر تو خرمن پہ ایک برق
پڑتی ہے تیری نظر عنایت کہاں کہاں

وہ بادشاہ حسن ہے تو اک گدا خلیلؔ
سرزد ہوئی ہے تجھ سے حماقت کہاں کہاں

محمد خلیل الرحمن امتعلم سال چہارم

محمود گاوان کے مزار پر

سکوتِ موت طاری ہے زمینوں آسمانوں میں
لہو رورو کے سورج چھپ گیا ہے کوہساروں میں

کوئی رازِ عدم شاید نہاں ہے اس خموشی میں
ہوا کی آہ وزاری میں، فضا کی بیخودشی میں

فرشتے تیرے مدفن پر صفِ ماتم بچھاتے ہیں
تری درماندگی پر نور کے آنسو بہاتے ہیں

طلسمِ خواب باندھا ہے تقدس کی ہواؤں نے
تبسم سا کیا پیدا فرشتوں کی دعاؤں نے

"یہاں آکر زمیں نے آسماں کی ہمسری کرلی
یہاں مٹی نے حاصل دوجہاں کی سروری کرلی"

یہاں آکر مسلماں کے لہو نے زندگی پائی
فنا میں زیست پائی، زیست کی تابندگی پائی

یہاں ہر مردِ مومن کے لئے عبرت کا ساماں ہے
یہاں مٹی کے ذرّوں میں پیامِ زیست پنہاں ہے

محمد نعیم الدین صدیقی متعلم سال چہارم

علم تاریخ کی ماہیت اور اہمیت

علمائے ماضی و حال کا اس امر پر اتفاق ہے کہ تہذیب نفس، اصلاح معاشرت، تحقیق حقائق اور خود شناسی کے لئے تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ تاریخ ایک ایسا علم ہے جس میں مثالیں ہی مثالیں نظر آتی ہیں اور تمام تواریخ تمثیلات سے مملو ہیں۔

طرز بیان کو موثر اور انوکھا بنانے کے لئے کسی باکمال مورخ کی قوت متخیلہ کا زبردست ہونا ازبس ضروری ہے۔ لیکن یہ امر ذہن نشین کرلیا جانا چاہئے کہ وہ صرف اصل مواد کی حد تک اپنی طبیعت کی جولانیاں کہا جاسکتا ہے، مواد کے ساتھ من گھڑت واقعات کا شامل کرنا غیر مستحسن فعل قرار دیا جائے گا۔ مورخ کو قوتِ استدلال کا بھی حامل ہونا چاہئے تاکہ وہ متشابہ و متجانس نوعیت کے واقعات سے کسی قطعی نظریہ کا استخراج کرسکے۔ بعض مستند ہستیوں نے یہاں تک کہدیا ہے کہ تاریخ کی ابتدا ناول کی سی ہوتی ہے لیکن اس کا اختتام مضمون کی شکل میں ہوتا ہے۔

دنیا کا سب سے پہلا اور شاید سب سے بڑا مورخ، عہد قدیم کے اعتبار سے، ہیروڈوٹس یونانی ہوا ہے جس کی طرز تحریر آورد نہ تھی بلکہ آمد تھی۔ یہ مورخ اُس زمانہ میں ہوا ہے جبکہ اہل یونان دورِ جدت پسندی عجوبہ پرستی، تجسس علمی اور تشکیک سے گذر رہے تھے۔ گو اس زمانہ میں فنون لطیفہ معراج کمال پر تھے تاہم فلسفہ ابھی عالم طفولیت ہی میں تھا۔ اسی زمانہ میں ٹوٹی پھوٹی نثر کی ابتدا ہوتی ہے کیونکہ ابتک نثر کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور اس کی عدم موجودگی میں ہر چیز کو منظوم پیرایہ میں لکھنے کا رواج تھا۔ اس زمانہ میں ہم کو کسی قسم کی باضابطہ تاریخ بھی نہیں ملتی۔ بلکہ گذشتہ واقعات کو ہم روایات، قصوں اور کہانیوں کی شکل میں افراد کی زبانوں پر نسلاً بعد نسلٍ من وعن آتے پاتے ہیں۔ بسا اوقات اُن میں کچھ اضافہ ہی ہوتا۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جاچکا ہے،

نثر کے رواج کے فقدان کی بنا پر تعلیم و تعلم کا ذریعہ مکالمہ قرار پاچکا تھا۔ چنانچہ سُقراط اور ارسطو کے مکالمے آج بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نثر نویسی سے کس طرح غفلت اور بے توجہی کی گئی۔

یہ کہنا کہ تاریخ کبھی کُل جزوی و کلّی، اہم اور غیر اہم، معمولی اور غیر معمولی واقعات کو پیش نہیں کر سکتی، بے شک غلط نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم کسی مکمل تاریخ کو ترتیب دینا چاہیں گے تو ہمیں نہ صرف زمانۂ زیر بحث کی اہم چیزوں کو بلکہ ناقابل لحاظ چیزوں کو بھی قلمبند کرنا ہوگا جو دراصل تاریخ کا صحیح مقصد نہیں ہے۔ کیونکہ اگر سہو، اتفاق سے کوئی غیر اہم بات بھی سہواً چھوٹ جائے تو تاریخ میں سُقم پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم اُسی تاریخ کو بہترین قرار دیں گے جس میں واقعات ماضیہ کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہو کہ زمانۂ زیر بحث کی ہر قابل لحاظ چیز پیش نظر ہو جائے۔

جس طرح عہد قدیم میں اہل یونان نے تاریخ کے لکھنے میں سبقت کی تھی بعینہ عصر جدید میں اقوام یورپ نے سب سے پہلے اس جانب قدم اُٹھایا۔ فرائسارت (Froissart) اپنے زمانہ کا ہیروڈوٹس ہوا ہے۔ چنانچہ اس بنا پر اٹلی کی مثال یورپ کے لئے بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ ایتھنز کی یونان کے لئے۔ یہ امر یقینی ہے کہ گذشتہ دو صدیوں کے مورخین، بہ نسبت مورخین عہد قدیم کے زیادہ حقائق پیش نہیں کرتے اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ وہ مقابلتاً دروغ بافیوں کا ارتکاب کم کرتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تاریخ کی راہ مذہبی عقیدت اور حُسن ظن کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ فلسفۂ تاریخ کے سمجھنے میں حالیہ مورخین، مورخین عہد قدیم پر ہر طرح فوقیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ امر ذہن نشین ہونا چاہئے کہ مذاق و تخیل آفرینی، انداز بیان، فن ترغیب اور امور عامہ کے سراہنے میں قدما بھی متاخرین سے کچھ کم نہ تھے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالیہ مورخین نے صدق بیانی سے کسی نہ کسی حد تک بلاشبہ ضرور انحراف کیا ہے۔ اس انحراف کا باعث اُنکا زور استدلال تھا نہ کہ اُنکی قوت متخیلہ، جس کی وجہ سے وہ مجبور تھے۔ وہ قدما سے اس حیثیت سے بھی بہت آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ عام واقعات سے عمومی اصول استخراج کرتے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے بدقسمتی سے اکثر مواقع پر محض واقعات کو اصول پر منطبق کرنے کی خاطر واقعات کی صحت کو متضرر کر دیا ہے۔ تاریخ صرف مشاہدہ کا نام نہیں ہے بلکہ روایت کا اور پھر قرائن کا تجسس ظنون غالبہ، اور بحث و تعلیل کا۔ عصر جدید کے مورخین کے شاندار علمی کارناموں میں غلط بیانیوں کی وہ کثرت ہے کہ الامان والحفیظ۔ جس وقت مورخین عصر بہ دوران مناقشہ جودت طبع کا اظہار کرتے ہیں

تو وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ تاریخ میں صحت بیان کی سی بھی کوئی چیز لائق التفات ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہر مورخ صحت بیانی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنے علمی کارنامہ میں مؤثر طرز بیان اختیار کر سکتا ہے۔ اور اس کا یہ طرز عمل کہ محض انداز بیان کی خاطر صحت واقعات جیسی چیز کو قربان کرنے میں پس و پیش کرے حد درجہ افسوس ناک ہوگا۔ اکثر مورخین تذکروں (Memoirs) کے مصنفین کے بارے میں اپنے دلوں میں عجیب خود سرانہ (Autoratic) حقارت کے جذبات پرورش کرتے ہیں اور تاریخ کی ترتیب کے موقعہ پر، خصوصی، دلچسپ اور اہم واقعات کو وہ محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اُن کی دانست میں وہ اتنے غیر اہم ہوتے ہیں کہ تاریخ کی عظمت اُن واقعات کی حفاظت گوارا نہیں کر سکتی۔ یہ امر کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ کوئی قدیم واقعہ بذاتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اِلّا یہ کہ وہ مستقبل کے متعلق صحیح قیاس لگانے میں رہنمائی کرتا ہے اور ایسی تاریخ جو تاریخ کے اس مقصد عظیم کو پورا نہ کرتی ہو، بالکل مہمل و لایعنی ہوگی خواہ وہ لڑائیوں، معاہدوں، بغاوتوں کے ایک لامتناہی سلسلہ سے کیوں نہ مملو ہو، ایسے حالات کا تاریخ میں بیان کیا جانا ازبس ضروری ہے جنھوں نے بنی نوع انسان کی خوشی، اخلاق و اطوار کے علاوہ باشندگان ملک کی تمول سے تسفّل، علمیت سے جہالت اور بربریت سے مدنیت کی حالتِ مروری (Transition State) پر گہرے اثرات چھوڑا ہو۔ اسی نوعیت کے حالات کو "خاموش انقلاب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان حالات کی ترقی کی روش اُن واقعات سے شاذ ہی معلوم کی جاسکے جن کو حالیہ مورخین اپنی دانست میں "اہم واقعات" سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ اُس خاص نوعیت کے حالات نہ تو کسی فوج کی ظفر مندی کے بیان سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور نہ مقننہ میں وضع کئے جاسکتے ہیں، وہ نہ تو کسی معاہدے میں طے کئے جاتے ہیں اور نہ ہی کسی دفتر میں اُن کو محفوظ کیا جاتا ہے۔

کامیاب مورخ صرف وہی کہلایا جاسکتا ہے جس کے علمی کارنامہ میں زمانۂ زیر بحث کے موجود الوقت نقطۂ نظر، عام ذہنی سطح و حالت اور طبعی میلانات کو مُصغّر (Meniature) صورت میں پیش کیا گیا ہو۔ ایسا مورخ نہ تو خاص طور پر ہر واقعہ کو اہمیت دیتا ہے اور نہ ہی ہر فرد کی تعریف بیجا کے پُل باندھتا ہے بلکہ اپنے صحیح انتخاب واقعات، درست استرداد (Rejection) اور عمدہ ترتیب سے وہ حقیقت کو ایسا دلچسپ بنا دیتا ہے کہ افسانوی رنگ ماند پڑ جاتا ہے، وہ سرکار و دربار، خیمہ و خرگاہ کا ذکر ضرور کرے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ

وہ قوم کی عام حالت کا نقشہ بھی کھینچ دے گا ۔ یہاں تک تو علمِ تاریخ کے مفہوم، نوعیت اور لوازمات سے بحث کی گئی، اب اُس کی اہمیت پر غور کیا جائے گا۔

تاریخ کی اہمیت کی سب سے شاندار مثال ہم انگلستان کے اس اقدام سے اخذ کرسکتے ہیں جس کی رو سے بربنائے احکام پارلیمان انگلستان، ائرستان میں جو انگلستان کے ماتحت تھا۔ عرصۂ دراز تک مضامین فلسفہ اور دینیات کے ساتھ تاریخ کی تعلیم بھی ممنوع قرار دی گئی تھی۔ تاریخ کے ممنوع قرار دئے جانے کا واحد مقصد یہ تھا کہ اُن ستم رانیوں اور چیرہ دستیوں کو جو انگلستان کی جانب سے باشندگانِ ائرستان پر روا رکھی گئی تھیں، پردۂ خفا ہی میں رکھا جائے کہ جس کا انکشاف اہل ائرستان کو آناً فاناً انتقام کا پیاسا بنا دینے کے لئے کافی ہوسکے گا۔ لیکن حقیقت کب تک پوشیدہ رہ سکتی تھی! چنانچہ اُس حقیقت کے انکشاف کے دور رس نتائج آج آئرش فری اسٹیٹ (Irish Free State) کی شکل میں ظہور پذیر ہیں۔

ہندوستان کا بھی کم و بیش یہی حال ہے ۔ اگر یہاں ہر مضمون تاریخ کو بالکل ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے تو اس کے بجائے اتنا ضرور کیا گیا ہے کہ تاریخ کی تربیت و انضباط ہی غلط طور پر کیا گیا ہے۔ نصابی تاریخوں میں جس چیز کو نمایاں کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں نے برسر اقتدار ہو کر مسلمانوں کے حقوق کو کیسے پامال کیا اور دوسری طرف یہ کہ مسلمانوں نے حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے کر ہندوؤں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے ۔ بجائے اس کے کہ ہم تاریخ پڑھ کر اتحاد و یگانگت کے خیالات اپنے دل میں پرورش کرتے، باہمی نفرت و بے زاری کے جذبات دل نشیں ہو گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندستانی تہذیب و تمدن کے بقا کا خیال تو کجا، باہمی اتحاد و رواداری کا جذبہ ہی مفقود ہے۔ ان سب علل کی علت صرف تاریخ کی غلط ترتیب ہے ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی قوم کو بگاڑنا مقصود ہو تو غلط واقعات کو تاریخی حیثیت دینے سے وہ مقصد بخوبی تکمیل پاجاتا ہے ۔ برخلاف اس کے تاریخ کی صحیح ترتیب و تعلیم سے کسی قوم میں ترقی و عروج کے ولولے پیدا ہونا بعید از امکان نہیں۔

اور دیگر محرکاتِ عمل میں سے صحیح تاریخ کا مطالعہ بھی ایک ہے کہ جس کی بنا پر اگر ایک جانب

ہر ہٹلر، بسمارک کے عزائم کی تکمیل کی دھن میں سرگرم عمل ہے تو دوسری طرف مسولینی سائپیو افریکینس (Scipio Africanus) کے فتح کردہ کارتھیج کو اطالیہ کی ملکیت تبلاتا ہوا شمالی افریقہ کے پورے ساحلی علاقہ پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہے ۔

روس کا فن لینڈ پر جارحانہ اقدام بھی صحیح تاریخ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، کیونکہ صحیح تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ جنگ عظیم سے پیشتر فن لینڈ کا علاقہ روس کے زیر نگین تھا جس کو جنگ عظیم کے بعد آزاد کرایا گیا۔ چنانچہ اسی قدیم قبضہ کو روس اپنے اس جارحانہ اقدام کے جواز میں پیش کر رہا ہے ۔

محمد عبدالعزیز صدیقی متعلم بی۔ اے (آخری)

شباب

شمع بزم زندگی ہوں نام ہی میرا شباب
سوز و ساز آرزو ہے میرے ساغر کی شراب

برق بن کر دیدۂ ساقی میں ہوں رقصاں کبھی
سینۂ میکش میں بھر دیتا ہوں گاہے التہاب

مسند آرائے سریر حسن و الفت ہوں کبھی
گاہ سوتوں کو سناتا ہوں حدیث انقلاب

شورش ہستی میں بنتا ہوں کبھی راز سکوں
سینۂ مزدور میں کھاتا ہوں گاہے پیچ و تاب

گاہ گرماتا ہوں میں بے حس غلاموں کا لہو
جھومتا ہوں گاہ سن کر نغمۂ چنگ و رباب

گاہ صحرا میں بنا موج سموم جانگداز
چشم نرگس کو کیا گلشن میں گاہے مست خواب

رعد بن کر محفل ہستی کو تھرایا کبھی
گاہ سطح بحر پر ظاہر ہوا بن کر حباب

حیرت نظارہ سے میں ہو گیا ساحل کہیں
اور کبھی شوریدہ سر موجوں میں ہوں مضطراب

رنگ و آب جسم انسانی نہیں ہرگز نہیں
وہ تو اک جوش تمنا ہے کہیں جسکو شباب

مرزا متین احمد بیگ سروش

ہمارا نصب العین

بغیر کسی نصب العین کے ہماری زندگی پھول کی اس پتی کے مانند ہے جو پھول سے الگ ہو کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑ جائے اور ہوا کی لہروں میں چکر کھاتے کھاتے گم ہو جائے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حسن طلب نگاہوں کے لئے ایسی ہی زندگی میں دلکشی اور دلفریبی ہو ۔ اور جو سہل انگاری ہی کو زندگی کا حسن سمجھتے ہوں اور جن کو وہی راستہ زیادہ خوشنما اور خوبصورت نظر آئے جس میں رکاوٹیں اور مزاحمتیں نہ ہوں اور جسے وہ اپنی ذاتی مہارت اور قابلیت صرف کئے بغیر خود بخود اس طرح طے کر سکیں کہ انہیں یہ بھی محسوس نہ ہو کہ وہ کدھر سے آئے تھے اور کہاں پہنچ گئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زندگی کا صحیح راستہ یہی ہے جسمیں رکاوٹیں اور مزاحمتیں نہ ہوں اور جس پر سے ہم غیر اختیاری طور پر یوں گذر جائیں جس طرح کہ ہوا خاک کو اڑا لے جاتی ہے ۔ اگر زندگی ایسی ہی بے معنی تھی تو خدا کو اس کی تخلیق ہی کی کیا ضرورت تھی ؟ اور اس نے کیوں اتنی وسیع جیتی جاگتی کائنات بنا کر رکھ دی؟ کیا خدا نے یہ سب کچھ بغیر کسی مقصد کے پیدا کر دیا ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے اور یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ تخلیق حیات میں خدا کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے تو پھر انسان کا ایک بے مقصد زندگی کو حسین اور بہتر زندگی کہنا کہاں تک درست ہے ۔ یہ مانا کہ اس میں تھوڑی سی دلکشی اور خوشنمائی ضرور ہے لیکن خوبصورتی اور بہتری میں بہت فرق ہے ۔ خوبصورتی کی تمنا کرنے والے بھی دل میں ہمیشہ بہتری ہی کے طالب رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہی حُسن دراصل حُسن ہے جو بہتری کا حامل ہو ۔ اور ہر انسان کے دل میں بے جانے بوجھے یہ خواہش ضرور موجود رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو قوی تر اور زندہ تر بنا کر قائم رکھے اور ہو سکے تو اس کو دائم بنا دے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اکثر اپنی اس خواہش کو خود واضح اور نمایاں شکل میں نہیں

دیکھتے یا دیکھنا ہی نہیں چاہتے اور اس طرح خود اپنے کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اس خواہش کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نیز زندگی کو قوی تر اور زندہ تر بنانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہ ہو اور ہم اپنا کوئی منتہائے کمال نہ مقرر کرلیں۔

اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ اس مقصد کی نوعیت کیا ہو۔ خواہ وہ کوئی معاشری تحریک ہو یا کوئی مذہبی نصب العین، تربیت اطفال ہو یا خانہ داری غرض کچھ ہو اس کچھ نہ کچھ کا ہونا ضرور ہے کیونکہ زندگی کو زیادہ پائیدار اور دائم بنانے کی خواہش اگر تعاون کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار نہ کرے گی تو بلاشبہ ایک شعلہ کی طرح آہستہ آہستہ بجھ کر رہ جائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی ایک پیہم کشاکش ہے اور بالخصوص آج کل کی متمدن زندگی کیونکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ جیسے جیسے ہم تہذیب و تمدن میں ترقی کرتے جائیں گے زندگی کی کشمکش بڑھتی جائیں گی لیکن کانٹ نے اس کشمکش کے مسئلہ کو کس خوبی سے سلجھایا ہے۔ وہ کہتا ہے :" یہ کشاکش وہ ذرائع ہیں جو قدرت نے انسان کی بہترین قوتوں کو ابھارنے کے لئے وضع کئے ہیں" انسان آرام سے زندگی گذارنا چاہتا ہے لیکن قدرت جو اس سے زیادہ بہتر جانتی ہے کہ وہ کیوں تخلیق کیا گیا ہے اُسے مشکل کام کرنے کو دیتی ہے اور اسے مصیبتوں میں ڈال دیتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے غموں کے حلقے سے بالاتر و بلند تر ہو کر ایک بہتر انسان بن جائے۔ گویا ایک بہتر انسان' اور بہتر زندگی' کی تخلیق قدرت کا منتہائے کمال ہے۔ پھر ایک بے مقصد زندگی کو دلکش اور بہتر سمجھنا کیا قدرت کے اس نصب العین کی اور خود قدرت کی توہین نہیں ؟

انسانی برادری ایک ایسی جماعت ہے جس کا مقصد مل جل کر خوشیوں سے لطف اُٹھانا ہے ؟ لیکن ساتھ ہی مل جل کر غم میں بھی شریک ہونا ہے اس لئے اگر محض خوشی اور مسرت کو منتہائے زندگی قرار دیا اور صرف حصول مسرت ہی ہمارا نصب العین ہو تو ہم کبھی اپنی زندگی کو قوی تر اور زندہ تر نہ بنا سکیں گے۔

اب یہاں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کی متمدن زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور بالخصوص اپنے مالک کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس وقت ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہئے آیا وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ بلاشبہ اس وقت ہمیں کسی انفرادی نصب العین سے زیادہ ایک مشترک نصب العین کی ضرورت ہے

اور وہ اجتماعی زندگی کی بہتری ہے اور اس کے ساتھ ایک بہتر اور دائم زندگی کا حصول۔ اب سوچنا یہ ہے کہ وہ کونسا شاندار کام ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کو سُدھار سکتا ہے اور اُسے بہتر اور دائم بنا سکتا ہے اور جو ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے۔ وہ کام موجودہ تہذیب کو بسیار پسندی کی "اگیا بتیال" سے نکال کر اس کے سامنے بلند معیاری کا ایک نصب العین قائم کرنا ہے اور اسے بیشتر سے بہتر کی طرف رہبری کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے بلکہ ایک حد تک ناممکن لیکن جب خدائے برتر نے انسان کے جسم میں روح پھونکی تو اُس نے ناممکن ہی کو انسان کا نصب العین بنایا اور کام در اصل وہی کرنے کے قابل ہے جو "ناممکن" ہو اور تاریخ تمدن شاہد ہے کہ انسان یقیناً اس بلند منتہائے کمال کے ہمیشہ قابل ہے۔

ہم اس غائت درجہ دشوار کام کو یقیناً سر انجام دے سکتے ہیں اگر ہم بلند معیاری کو اپنا نصب العین بنالیں" بلند معیاری کی تلاش کرو" سچائی، خوبصورتی، اچھائی خود بخود بڑھتی چلی آئے گی"۔

اس کے بعد دوسرا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اجتماعی زندگی کی بہتری کے لئے کس قسم کی تربیت ضروری اور مفید ہے۔ بلاشبہ سب سے پہلے اس کے لئے نفس انسانی کی تربیت لازمی ہے اور ایک تجربہ کار مدرس کا قول ہے کہ" اگر تم چاہتے ہو کہ انسانی نفس کی تربیت کرو تو نفس کی تربیت نہ کرو بلکہ کسی اور شئے کی تربیت کرو" اور وہ شئے "جسم" ہے جو ہر قسم کی تخلیقی مہارت کا ذریعہ ہے اور جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے وہ ایک میکانی نقش نہیں ہے۔ نوع انسان کو زیادہ صحت مند اور زیادہ تنومند بنانا بہت آسان ہے بشرطیکہ اس کے لئے بہتر کام موجود ہو۔ حالات اور ماحول انسانی فطرت پر بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھے کاموں سے بھی اچھے انسان بنائے جاسکتے ہیں اور بہتری اور ترقی کا سب سے صحیح طریقہ یہی ہے۔ انسانی تجربہ ہمیں بتلاتا ہے کہ برے کام میں مصروف رہنے والے اور مصروف رکھنے والے سب کے سب شریر النفس اور خبیث ہوجاتے ہیں ایسے لوگوں کو ذرا سی بات بھی مشتعل کرسکتی ہے اور وہ مرنے مارنے پر تیار ہوجاتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی بلندی کو کھو دیتے ہیں۔ پس اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ہمارا سب سے پہلا اور اصلی مقصد ہر انسان کی ذات کو بلند تر کرنا اور اس دشوار کام کو شروع کرنے کا صحیح ذریعہ یہ ہے کہ ذاتی مہارت اور صلاحیت اور امانت داری کی اعانت سے انسانی کارگذاری کو زیادہ

بلند معیار بنا دیا جائے۔

محض پند و نصائح انسان کو بہتر انسان نہیں بنا سکتے۔ ہم کو چاہئے کہ جہاں ہم خرابیاں دیکھیں ان کو فوراً براہ راست وعظ و تلقین سے دور کرنے میں وقت ضائع نہ کریں بلکہ کوئی ایسا عملی طریقہ اختیار کریں جس سے دوسرے متاثر ہو کر اُن خرابیوں کو چھوڑ دیں۔

ہمارے حقوق و فرائض کا تعلق محض اس مادی دنیا سے نہیں ہے بلکہ ساری کائنات سے ہے اور ساری کائنات کی آنکھیں ہر انسان کے کام پر لگی ہوئی ہیں۔

کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی تمنا ہر دل میں ضرور موجود رہتی ہے اور یہ تمنا یقیناً اچھی ہے۔ حصول کی خواہش ضرور ہونی چاہئے اور مقابلہ بھی ہونا چاہئے لیکن اس لئے نہیں کہ ہم اُسے صرف "ہَل مِن مزید" کا ایک نعرہ بنا دیں۔ بلکہ اس لئے کہ کون سب سے اچھا کام کرتا ہے۔ اس طرح کے اعلیٰ مقابلہ سے ہم اپنے لئے ہمیشہ قائم رہنے والے عالیشان قصر تعمیر کر سکیں گے اور زمانہ خود انکی حفاظت کرے گا۔ کیونکہ جب کوئی آدمی توجہ کے ساتھ اچھا کام کرنے لگتا ہے تو ازلی خوبیاں خود بخود اس پر اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتی ہیں۔ ازلی خوبیاں کوئی غیر مرئی بھوت پریت نہیں ہیں۔ وہ انسانی محنت کے جیتے جاگتے اصول ہیں اور ہم اپنی ذاتی محنت اور مہارت سے بہت آسانی کے ساتھ انکو مربی اور سود مند بنا سکتے ہیں۔

دوسرا قدم جو اجتماعی زندگی کی بہتری کے لئے ہم اُٹھائیں وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہونی چاہیے جو 'امداد باہمی' کی دنیا کہلائی جا سکے اور اگر ہم اس کو اپنی زندگی کا سب سے ضروری مطمح نظر بنا لیں تو یہ کام بہت آسان ہو سکتا ہے۔

'امداد باہمی' کے معنی ہیں انسانی ارادوں کی مختلف طاقتوں کا مل جُل کر ایک مشترک مدعا کی طرف چل نکلنا۔ اور انسان ایک دوسرے کے سچے رفیق اگر ہو سکتے ہیں تو صرف مشترک محنت اور 'ہم کاری' کے ایک متحد ماحول میں اور انسانی اُنس و محبت کی بہترین نشو و نما اگر ہو سکتی ہے تو صرف سود مند کاموں میں مل جُل کر حصہ لینے سے۔

ہمیں زندگی کے مقاصد کو مسائل سمجھ کر ان کے حل کرنے میں اُلجھا رہنا چاہئے بلکہ ہمیں چاہئے کہ

اسے ایک مسلسل محرکہ بنا دیں تاکہ اس کشمکش سے نجات پانے کی کاوش باقی نہ رہے۔

ایک اور اہم چیز جو ہماری اجتماعی زندگی کی بہتری میں مانع ہے وہ ہماری اخلاقی پستی ہے اور یہ اخلاقی نقاہت نتیجہ ہے زندگی کو محض خوشی کی ترازو میں تولنے کا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا اثر کم و بیش ہر طبقہ پر پڑ رہا ہے اور اس کو دور کرنے کے لئے ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہمارے ارادوں کی قوت ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی ارادی قوتوں کو مضبوط اور استوار بنانے کی کوشش کریں تاکہ ہم کشمکش اور مصیبتوں سے گھبرا کر پیچھے نہ بھاگ نکلیں بلکہ آگے بڑھ کر مردانہ وار اسے لبیک کہیں اور اپنے ارادوں میں اتنی مضبوطی اور استواری ہم اس وقت تک پیدا نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم اس قول کو اپنی زندگی کا اصول نہ بنا لیں کہ " انسانی تمدن اور بہتر زندگی کا منتہائے کمال خوشی نہیں بلکہ خوبی ہے " تاکہ ہماری اخلاقی توانائیاں ہمیں زیادہ قوی بنا دیں اور نوع انسان ایک بہتر زندگی کی تخلیق کر کے اُسے دائم بنا سکے۔

خوبی کا اصول اور اپنا کام بخوبی انجام دینے کا قانون اتنا ہی عمیق اور وسیع ہے جتنی کہ خود کائنات اور اسی اصول کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا کر ہم صحیح معنوں میں کائنات کے باشندے بن سکتے ہیں۔ اور ہم متمدن اور تعلیم یافتہ انسانوں کا تو سب سے پہلا یہ کام ہونا چاہئے کہ ہم اپنے نفوس میں فیاضی اور دیانت داری کے جذبات کو ابھاریں (بڑھائیں) اور ہمارے گھر بار کی زندگی میں جو دلکش خوبیاں ہوں ہم انھیں چھپا کر نہ رکھیں بلکہ ان کو عوام کی خدمت کے کام میں لائیں۔ اور اپنے دلوں میں حُبِ وطن کا وہ جذبہ پیدا کریں جو ہماری انسانیت کو زیادہ اجاگر کر دے۔ اپنے اصولوں کو فرائض اور حالات کے سانچے میں ڈھالیں اور یہ ہمارا ایمان و ایقان ہو کہ وہ نیکی جو ناقابل عمل ہے محض ناکارہ ہے خواہ وہ کتنی ہی بہتر اور بلند کیوں نہ ہو۔ اور اُس راہ میں جہاں ہم توانائی کے ساتھ مصروف عمل ہو سکیں شوق سے غلطیاں کرنے کے خطرے میں پڑ جائیں نہ یہ کہ اپنے روز و شب یوں پڑے پڑے گزار دیں کہ نہ ہم پر کوئی الزام عائد ہو اور نہ ہم دنیا میں کسی کام آ سکیں۔ اور اپنی اس زندگی پر ہم مفتخر بھی ہوں۔

جب ہم نے اجتماعی زندگی کی بہتری کو اپنا نصب العین بنایا ہے تو ہمیں ہر خطرے اور مصیبت کو انگیز کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے ایک بلند دائم زندگی اسی طرح حاصل ہوسکتی ہے۔

اپنی زندگی کے اس اعلیٰ اور بلند نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایسی تندہی اور جانفشانی کی ضرورت ہے جو کبھی تھک نہ سکے۔ ہمیں اپنے ارادوں میں اتنا اٹل ہونا چاہئے کہ کوئی قوت ہمیں ہماری راہ سے منحرف نہ کرسکے اور ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ جو اپنا کام کرتے کرتے سوجاتا ہے وہ اپنے فرائض کماحقہٗ انجام نہیں دیتا۔ اور وہ کبھی اس بہتر اور دائم زندگی کو حاصل نہیں کرسکتا جسے خود قدرت نے انسان کا نصب العین بنایا ہے۔

رضیہ بی۔ اے (ابتدائی)

غزل

حسرتوں کو مری پامال کیا کرتے ہیں
سوچئے آپ ذرا سوچئے کیا کرتے ہیں

کچھ اس انداز سے وہ مجھ پہ جفا کرتے ہیں
جیسے یہ بھی کوئی احسان کیا کرتے ہیں

درد کا حال وہی پوچھ رہے ہیں مجھ سے
درد بن کر جو مرے دل میں رہا کرتے ہیں

ہجر کی رات اسی طرح کٹی جاتی ہے
ہم اسی طرح سے مر مر کے جیا کرتے ہیں

ہم غریبوں سے ابھی تک ہے کدورت باقی
راہ میں دیکھ کے منہ پھیر لیا کرتے ہیں

عالم کون و مکاں سے بھی گزر جاتا ہوں
آپ جس وقت تصور میں رہا کرتے ہیں

یہ بھی انداز محبت ہیں کسی کے خسروؔ
غیر سے حال مرا پوچھ لیا کرتے ہیں

امیر احمد خسروؔ۔ بی۔ اے (ابتدائی)

چھتری

میڈم آوری لی ایک نہایت جزرس خاتون تھیں۔ وہ ہر فرانک کی صحیح قدر و قیمت اچھی طرح جانتی اور دولت بڑھانے کے تمام سخت اصولوں سے لیس رہتی تھیں۔ ان کی ملازمہ کے لئے اپنا گھر بھرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ خود موسیو آوری لی کے لئے اپنی بیوی سے جیب خرچ حاصل کرنا ایک نہایت ہی دشوار امر تھا۔ ہر چند کہ یہ جوڑا آرام کی زندگی بسر کرتا تھا اور انہیں کوئی اولاد بھی نہیں تھی، تاہم میڈم آوری لی کے لئے اپنی تھیلی سے چمکدار چاندی کے ٹکڑے نکالنے حد درجہ رنج و تکلیف کا باعث ہوتے تھے۔ گویا ہر سکہ ان کے دل سے کھنکھنا تا تھا۔ جب کبھی انہیں کسی ناگزیر خرچ سے سابقہ پڑتا تو انہیں رات رات بھر نیند نہ آیا کرتی تھی۔

موسیو آوری لی بار بار اصرار کیا کرتے تھے "تم کو موجودہ اخراجات سے کچھ تو زیادہ خرچ کرنا چاہئے، ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق کبھی خرچ نہیں کیا"۔ لیکن ان کی بیوی کا ایک ہی جواب ہوا کرتا تھا "محفوظ راستہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے، کون جانے آئندہ کیا پیش آئے!"

وہ صاف ستھری رہا کرتی تھیں۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور مزاج میں تلون تھا۔ موسیو آوری لی اپنی بیوی کے سخت احکامات پر ہمیشہ جھنجھلایا کرتے تھے، خصوصاً بعض توہین آمیز واقعات پر، کیونکہ ان سے ان کا مردانہ پندار مجروح ہوتا تھا۔

وہ محکمۂ جنگ میں ایک منشی کی حیثیت سے کارگذار تھے اور یہ خدمت صرف اپنی بیوی کی فرمانبرداری کے تحت انجام دیا کرتے تھے۔ مسلسل دو سال وہ دفتر کو ایک پرانی پیوندلگی چھتری اپنے ساتھ لاتے رہے جو ان کے ہم کاروں کے لئے چھیڑ چھاڑ کا ایک موضوع بن گئی تھی۔ وہ اس سے زیادہ

اپنے ساتھیوں کی پھبتیاں برداشت نہ کرسکے، آخرش اپنی بیوی سے ایک نئی چھتری کے خریدنے پر اصرار کرنے لگے۔ بیوی نے بڑی رد و قدح اور تلاش و جستجو کے بعد اشتہار تقسیم کرنے والے چھوکروں کی ایک مستعملہ چھتری پر پورے اٹھارہ فرانک خرچ کئے۔ اس قسم کی چھتریاں جن پر دوکانوں کے نام اور دوسری چیزیں بھی رہتی ہیں ظاہر ہے کہ شہر میں بہت ملتی تھیں۔ اس چھتری کے دیکھتے ہی ان کے ساتھیوں نے معمول سے زیادہ قہقہے لگانے شروع کئے اور موسیو آوری لی بہت ہی جھینپے۔ لیکن حسن اتفاق سے اس چھتری کی خریدی بہت ہی برا سودا ثابت ہوئی کیونکہ تین ہی مہینے کے اندر وہ بالکل پھٹ گئی اور اس کی شکست و ریخت نے پورے محکمۂ جنگ کو حیران کردیا۔ فی الواقع وہ ایک 'نظم' کا موضوع بھی بن گئی تھی۔ یہ نظم موسیو آوری لی کے دفتر میں صبح سے شام اور فرش سے چھت تک روزانہ سنائی دیتی تھی۔ موسیو آوری لی نے تنگ آکر ایک دن نہایت ہی برہمی سے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ وہ کم از کم بیس فرانک ایک عمدہ قسم کی نئی چھتری خریدنے میں صرف کرے، اور رقم نقد ادا ہو۔ بیوی بڑے بحث مباحثے کے بعد اٹھارہ فرانک کی چھتری خریدنے پر راضی ہوئیں، اور افسردگی کے ساتھ چھتری اپنے میاں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا "دیکھو! یہ چھتری تمھیں کم از کم پانچ سال کام دیگی!"

چھتری کا مالک خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دفتر میں بھی وہ نہایت ہی شاداں و فرحاں داخل ہوا۔

شام کو جب وہ گھر لوٹے تو بیوی نے چھتری پر مضطربانہ نظر ڈالی۔ "تم کو چاہیے کہ ربر کا حلقہ زیادہ تنگ نہ رکھا کریں" انھوں نے فرمایا۔ "کیونکہ اس کی وجہ سے ریشم کٹ جاتا ہے۔ تم اس کی جتنی زیادہ حفاظت کروگے اتنا ہی اچھا ہے۔ بس قریب میں تمھیں دوسری چھتری دلانے سے تو رہی"۔ پھر فوراً ہی انھوں نے چھتری اپنے شوہر کے ہاتھ سے لے لی، کھٹکا دبایا اور کھول کر دیکھنے لگیں۔ پھر یکایک حیرت اور غصہ سے اسے گھورنا شروع کیا۔ چھتری کے عین درمیانی حصہ میں تقریباً ایک فارذنگ کے برابر سوراخ ہوگیا تھا" جو بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی جلتے سگریٹ کے ٹکڑے سے پڑگیا تھا۔

"ذرا دیکھئے تو سہی! وہ چلائیں۔

"کیا بات ہے؟ شوہر نے بردباری سے بغیر اپنا منہ پھیرے کے پوچھا "آپ کس چیز کے

چھتری

میڈم آوری لی ایک نہایت جزرس خاتون تھیں۔ وہ ہر فرانک کی صحیح قدر و قیمت اچھی طرح جانتی اور دولت بڑھانے کے تمام سخت اصولوں سے لیس رہتی تھیں۔ ان کی ملازمہ کے لئے اپنا گھر بھرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ خود موسیو آوری لی کے لئے اپنی بیوی سے جیب خرچ حاصل کرنا ایک نہایت ہی دشوار امر تھا۔ ہر چند کہ یہ جوڑا آرام کی زندگی بسر کرتا تھا اور انہیں کوئی اولاد بھی نہیں تھی، تاہم میڈم آوری لی کے لئے اپنی تھیلی سے چمکدار چاندی کے ٹکڑے نکالنے حد درجہ رنج و تکلیف کا باعث ہوتے تھے۔ گویا ہر سکہ ان کے دل سے کھنکھتا تھا۔ جب کبھی انہیں کسی ناگزیر خرچ سے سابقہ پڑتا تو انہیں رات رات بھر نیند نہ آیا کرتی تھی۔

موسیو آوری لی بار بار اصرار کیا کرتے تھے "تم کو موجودہ اخراجات سے کچھ تو زیادہ خرچ کرنا چاہئے ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق کبھی خرچ نہیں کیا"۔ لیکن ان کی بیوی کا ایک ہی جواب ہوا کرتا تھا۔ "محفوظ راستہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے، کون جانے آئندہ کیا پیش آئے!"

وہ صاف ستھری رہا کرتی تھیں۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور مزاج میں تلون تھا۔

موسیو آوری لی اپنی بیوی کے سخت احکامات پر ہمیشہ جھنجھلایا کرتے تھے، خصوصاً بعض توہین آمیز واقعات پر، کیونکہ ان سے ان کا مردانہ پندار مجروح ہوتا تھا۔

وہ محکمۂ جنگ میں ایک منشی کی حیثیت سے کارگذار تھے اور یہ خدمت صرف اپنی بیوی کی فرمانبرداری کے تحت انجام دیا کرتے تھے۔ مسلسل دو سال وہ دفتر کو ایک پرانی پیوندلگی چھتری اپنے ساتھ لاتے رہے جو ان کے ہم کاروں کے لئے چھیڑ چھاڑ کا ایک موضوع بن گئی تھی۔ وہ اس سے زیادہ

اپنے ساتھیوں کی پھبتیاں برداشت نہ کر سکے، آخرش اپنی بیوی سے ایک نئی چھتری کے خریدنے پر اصرار کرنے لگے۔ بیوی نے بڑی ردوقدح اور تلاش و جستجو کے بعد اشتہار تقسیم کرنے والے چھوکروں کی ایک مستعملہ چھتری پر پورے اٹھارہ فرانک خرچ کئے۔ اس قسم کی چھتریاں جن پر دوکانوں کے نام اور دوسری چیزیں بھی رہتی ہیں ظاہر ہے کہ شہر میں بہت ملتی تھیں۔ اس چھتری کے دیکھتے ہی ان کے ساتھیوں نے معمول سے زیادہ قہقہے لگانے شروع کئے اور موسیو آوری لی بہت ہی جھینپے۔ لیکن حسن اتفاق سے اس چھتری کی خریدی بہت ہی برا سودا ثابت ہوئی کیونکہ تین ہی مہینے کے اندر وہ بالکل پھٹ گئی اور اس کی شکست و ریخت نے پورے محکمۂ جنگ کو حیران کر دیا۔ فی الواقع وہ ایک 'نظم' کا موضوع بھی بن گئی تھی۔ یہ نظم موسیو آوری لی کے دفتر میں صبح سے شام اور فرش سے چھت تک روزانہ سنائی دیتی تھی۔ موسیو آوری لی نے تنگ آکر ایک دن نہایت ہی برہمی سے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ وہ کم از کم بیس فرانک ایک عمدہ قسم کی نئی چھتری خریدنے میں صرف کرے، اور رقم نقد ادا ہو۔ بیوی بڑے بحث مباحثے کے بعد اٹھارہ فرانک کی چھتری خریدنے پر راضی ہوئیں، اور افسردگی کے ساتھ چھتری اپنے میاں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا "دیکھو! یہ چھتری تمھیں کم از کم پانچ سال کام دیگی!"

چھتری کا مالک خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دفتر میں بھی وہ نہایت ہی شاداں و فرحاں داخل ہوا۔

شام کو جب وہ گھر لوٹے تو بیوی نے چھتری پر مضطربانہ نظر ڈالی۔ "تم کو چاہیے کہ ربر کا حلقہ زیادہ تنگ نہ رکھا کریں"۔ انھوں نے فرمایا۔ "کیونکہ اس کی وجہ سے ریشم کٹ جاتا ہے۔ تم اس کی جتنی زیادہ حفاظت کروگے اتنا ہی اچھا ہے۔ بیں قریب میں تمھیں دوسری چھتری دلانے سے تو رہی"۔ پھر فوراً ہی انھوں نے چھتری اپنے شوہر کے ہاتھ سے لے لی، کھٹکا دبایا اور کھول کر دیکھنے لگیں۔ پھر یکایک حیرت اور غصہ سے اسے گھورنا شروع کیا۔ چھتری کے عین درمیانی حصہ میں تقریباً ایک فارذنگ کے برابر سوراخ ہو گیا تھا" جو بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی جلتے سگریٹ کے ٹکڑے سے پڑ گیا تھا۔

" ذرا دیکھئے تو سہی! وہ چلائیں۔

" کیا بات ہے؟ شوہر نے بردباری سے بغیر اپنا منہ پھیرے کے پوچھا "آپ کس چیز کے

متعلق دریافت کر رہی ہیں ؟"

اب تو غصہ کے مارے ان کی آواز بیٹھنے لگی۔

"تم ...... تم ......" رک رک کر انہوں نے ادا کیا " تم ..... نے جلادیا..... تمھاری .... سوراخ ہوگیا.... تمھاری نئی چھتری میں...... یقیناً تم پاگل ہو۔ کیا تم ہم کو تباہ کرنا ہی چاہتے ہو ؟"

موسیو اوری لی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ " آپ نے کیا کہا ؟" انہوں نے پلٹ کر دریافت کیا۔

" میں کہتی ہوں کہ تم نے چھتری میں ایک سوراخ کر دیا...... جلاکر..... ذرا دیکھو تو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے چھتری اپنے شوہر کی طرف پھینکی، گویا وہ انہیں مارنا چاہتی تھیں، انہوں نے چھتری اس زور سے پھینکی کہ سوئے اتفاق سے چھتری کا سوراخ دار حصہ موسیو اوری لی کی ناک پر جالگا۔ اس کے بعد وہ چھتری پر شعلہ بار نظریں ڈالنے لگیں۔

" یہ کیونکر ہوا" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا " اس کی بالکل خبر نہیں، میں قسمیہ کہتا ہوں کہ یہ میرا کام نہیں ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ کیسے ہوا۔"

" ہاں میں جانتی ہوں" بیوی نے کہا " میں شرطیہ کہتی ہوں کہ تم دفتر میں اس چھتری کو کھول کر دکھاتے رہے ہو، اور چھتری کے ساتھ حماقت آمیز حرکات کرتے رہے"

" ہاں میں نے اسے صرف ایکبار کھولا تھا، اور وہ بھی یہ دکھانے کے لئے کہ میری چھتری کس قدر خوبصورت ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔"

غصہ سے بے قابو ہوکر میڈم اوری لی نے اپنے شوہر سے ایسا برتاؤ کیا کہ شادی شدہ زندگی کا ایسا نظارہ ایک امن پسند آدمی کے لئے اس میدان جنگ سے بھی زیادہ ہیبت ناک ہو جاتا ہے جہاں گولیوں کی بارش ہو رہی ہو۔

میڈم اوری لی نے ایک پرانی چھتری کے کپڑے سے اس نئی چھتری میں پیوند لگایا گو اس

نئی چھتری کے کپڑے کا رنگ پرانے کپڑے سے بالکل مختلف تھا۔

دوسرے دن موسیو اوری لی اترا ہوا چہرہ لئے، اپنی پیوند لگی چھتری بغل میں دبا دفتر روانہ ہوئے۔ دفتر میں انہوں نے چھتری ایک الماری پر احتیاط سے رکھ دی اور دل سے اس کے خیال کو محو کرنے کی کوشش کرتے رہے گویا کہ اس کی یاد ایک نہایت تکلیف دہ چیز تھی۔ اس شام دفتر سے گھر واپس ہوتے ہی بیوی نے ان کی بغل سے چھتری کھینچی تاکہ اس کی طرف سے اپنا پورا اطمینان کرلیں۔ ان کی نظریں جب چھتری پر پڑیں تو غم و غصہ سے ان کا عجیب حال ہوگیا۔ چھتری کا پورا کپڑا چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے چھلنی ہوگیا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام سوراخ سگریٹ کے نیم سوختہ ٹکڑوں سے پڑ گئے تھے۔ علاوہ ازیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ متعدد سگریٹوں کی راکھ چھتری کے ہر حصہ پر جھٹکی گئی تھی۔ چھتری کا ستیاناس ہوچکا تھا۔ وہ تباہ ہوچکی تھی —— بالکل تباہ۔ فرط الم سے میڈم اوری لی کا گلا بیٹھ گیا اور وہ چھتری پر اپنی نظریں گاڑی ہوئی تھیں اور ان کے شوہر خوف و ہراس کے مارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھتری کے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں، شوہر نے اپنی نظریں نیچی کرلیں۔ میڈم اوری لی نے چھتری ان کے منہ پر دے ماری۔

" کم بخت نگوڑے !" غیض و غضب کے جوش میں پھر ان کی قوت گویائی عود کر آئی۔ " نگوڑے! تم نے قصداً ایسا کیا۔ میں تم کو اس کا مزہ چکھاؤنگی ! اب تمھیں دوسری چھتری ہرگز نہیں ملے گی !"

اب ایک دوسرا ہی منظر پیش نظر تھا۔ پورے ایک گھنٹے کے بعد وہ کچھ عذر معذرت کرنے کے قابل ہوئے۔ انھوں نے قسم کھائی کہ انھیں اس بات کا قطعاً گمان بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی حادثہ پیش بھی آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے انتقام یا حسد کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔ دروازے پر ایک گھنٹی کی آواز نے آخر امن پیدا کیا۔ آج شام انھوں نے ایک دوست کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ میڈم اوری لی نے یہ معاملہ اس کے روبرو پیش کیا اور قطعی طور پر کہہ دیا کہ یہاں اپنے شوہر کے لئے نئی چھتری خریدنے کا سوال ہے ہی نہیں۔ اب وہ نئی چھتری کسی صورت نہیں خریدیں گی۔

" مگر، دیکھئے میڈم ! مہمان نے سنجیدگی سے اعتراض کیا " ان کے کپڑے خراب ہو جائیں گے

اور ایسی صورت میں معاملہ اور اہم ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا" پست قد خاتون چلائیں جو ابھی تک غصہ میں بھری بیٹھی تھیں۔" انھیں ملازم کی معمولی چھتری دلادی جائے گی۔ اب میں ان کے لئے ریشمی چھتری لانے سے تو رہی۔"

اس اعلان نے موسیو اوری لی کو بغاوت پر آمادہ کردیا۔" ایسی صورت میں، میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں دفتر کو اپنا استعفا روانہ کردوں گا۔ معمولی نوکر کی حقیر چھتری کے ساتھ دفتر جانے پر مجھے کوئی شئے مائل نہیں کرسکتی۔"

"کیوں نہ اس چھتری کو ٹھیک کرالیا جائے" مہمان نے تجویز پیش کی۔" اس پر کچھ زیادہ خرچ نہیں آئیگا۔"

"جناب اس کے لئے کم از کم آٹھ فرانک خرچ ہوں گے" میڈم اوری لی نے تنگ آکر کہا۔ آٹھ فرانک اور اٹھارہ فرانک، جملہ چھبیس فرانک۔ ایک چھتری کے لئے چھبیس فرانک! ہوں! کیا ستم ہے!! ایسا کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔"

مہمان جو ایک غریب آدمی تھا، ایک نئے خیال سے چونک پڑا۔" آپ اسے بیمہ کمپنی لے جائیے کیونکہ بیمہ والے ہر آتش زدہ شئے کا معاوضہ دیا کرتے ہیں، بشرطیکہ آتش زدگی کا حادثہ آپ ہی کے گھر میں پیش آئے۔"

اس تجویز نے جادو کا کام کیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میڈم اوری لی اپنے شوہر کی طرف پلٹیں" کل تم دفتر جاتے ہوئے اس چھتری کو رشلو کمپنی لے جاسکتے ہو جو تمھارے راستے پر ہی پڑتی ہے۔ ان کو جلا ہوا حصہ دکھاؤ اور اس کا معاوضہ طلب کرو۔" یہ سن کر موسیو اوری لی جھلاگئے۔ کہنے لگے" مجھے ایسا کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوگی۔ یہ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ فرانک ہی کا تو معاملہ ہے۔ اس سے ہم کچھ تباہ تو نہیں ہو جائیں گے۔"

خوش قسمتی سے اگلے دن مطلع صاف تھا، اس لئے موسیو اوری لی چھتری کے بجائے ایک چھڑی لئے ہوئے دفتر روانہ ہوئے۔

گھر پر بالکل یکا و تنہا رہ کر میڈم اوری لی اپنے برباد شدہ اٹھارہ فرانک پر غور و فکر کئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔

چھتری کھانے کے کمرے کی میز پر پڑی ہوئی تھی اور وہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر بار بار اس کے گرد گھومتی رہیں۔ بیمہ کمپنی والی تجویز نے ان پر جادو کا سا اثر کیا تھا، مگر وہ بیمہ کمپنی کے منشیوں کی طنز آمیز نظروں سے خائف تھیں۔ سوسائٹی میں وہ ہمیشہ شرمائی سی رہتی تھیں اور معمولی معمولی باتوں پر ان کا رنگ متغیر ہو جایا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں اجنبیوں سے کبھی بھی بے تکلف بات کرنے کے قابل نہ ہو سکتی تھیں۔ پھر بھی اٹھارہ فرانک کا نقصان ان کو گہرے زخم کی سی تکلیف پہنچا رہا تھا۔ انہوں نے اس خیال کو اپنے دل سے نکالدینے کی بے فائدہ کوشش بھی کی، لیکن اپنے مالی نقصان کی یاد بری طرح کھٹکتی ہی رہی۔ اب انہیں کرنا کیا چاہیے تھا؟ کئی گھنٹے گذر گئے، مگر پھر بھی ان کا تذبذب دور نہ ہوا۔ یکایک ایک بزدل کی طرح انہوں نے اپنی ہمت مضبوط کی اور کچھ کرنے کا قصد کیا۔" میں کمپنی جاؤں گی، پھر دیکھوں وہاں کیا ہوتا ہے" انہوں نے سوچنا شروع کیا" پہلے تو چھتری کا معاملہ اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ نقصان ناقابل تلافی اور قطعی معلوم ہو۔" انہوں نے طاق سے دیا سلائی اُٹھائی اور چھتری کی دو کاڑیوں کے درمیان اپنی ہتھیلی کے برابر کپڑا جلادیا۔ پھر نہایت ہی چالاکی سے چھتری بند کی، کاڑیوں پر ربر کا حلقہ چڑھایا، گون اور ٹوپی پہن بیمہ کمپنی کے دفتر کی طرف چل پڑیں جو رو ڈی ای ڈلی پر واقع تھا۔ جیسے جیسے وہ کمپنی کے دفتر کے قریب ہوتی جاتی تھیں ان کے قدم سست پڑتے جاتے تھے۔ وہ دفتر والوں سے کیا کہیں گی؟ ان لوگوں سے انہیں کیا جواب ملے گا؟ وہ دروازوں کے نمبروں پر نظر دوڑانے لگیں۔ بیمہ کمپنی کے دفتر کے لئے ابھی اٹھائیس گھر اور باقی تھے۔" ٹھیک ہے ——" اس بُعد کی وجہ سے ان کو سوچنے کا کافی موقع مل گیا اب وہ آہستہ چلنے لگیں۔ دفعتہً انہوں نے چونک کر ایک دروازہ دیکھا جس پر موٹے حروف میں "رشلو کمپنی —— آتش زدگی کا بیمہ" لکھا ہوا تھا۔ اب وہ منزل مقصود پر پہنچ چکی تھیں۔ شش و پنج اور گومگو کے عالم میں وہ کچھ دیر دروازے پر ٹھیریں، دو مرتبہ اُلٹے پاؤں پھریں، پھر دو مرتبہ دروازے تک آئیں۔" اچھا —— کام تو بہر حال کرنا ہی ہے" انہوں نے دبی آواز میں کہا" یہ جتنا جلا ختم ہو جائے بہتر ہے" چوکھٹ پار کر کے وہ اندر داخل ہوئیں تو ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف دیوار سے میزیں لگی ہوئیں تھیں جن کے سامنے آہنی جال لگی ہوئی تھی۔ اندر کی طرف صرف چہرے دکھائی دیتے تھے

اور بقیہ جسم بالکل نظر نہ آتا تھا۔ میڈم اوری لی ایک شخص کی طرف بڑھیں جو بغل میں کچھ کاغذات دبائے کمرے میں اِدھر اُدھر آجا رہا تھا۔ "جناب معاف فرمائیے" انھوں نے دبی اور تھرتھرائی آواز میں کہا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آتش زدگی کے نقصان کے معاوضہ کے بارے میں کہاں رجوع ہونا چاہئے"

"داہنی جانب 'تیسری منزل'" اس نے اونچی اور گونجتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میڈم اوری لی ہمیشہ سے زیادہ اس وقت اس جواب سے حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلنے اور اپنے اٹھارہ فرانک کی قربانی پر تیار ہو گئیں۔ لیکن اٹھارہ فرانک کے خیال نے پھر ان میں ہمت پیدا کردی۔ ہانپتی کانپتی اور ہر زینے پر رکتی ہوئی وہ سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ تیسری منزل پر انہوں نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لمبی باریک آواز نے انھیں اندر آنے کی اجازت دی اور وہ ایک ایسے وسیع کمرے میں داخل ہوئیں جہاں صاف ستھرے بلکہ بھڑکیلے کپڑے پہنے تین آدمی آپس میں سنجیدہ گفتگو میں منہمک تھے۔ ان میں کا ایک ان کی طرف پلٹا اور کہا "میڈم میں آپ کی کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں؟"

"میں اس ......لئے" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگیں "میں اس لئے...... آئی.....ایک حادثہ" اس شخص نے انتہائی خوش اخلاقی سے میڈم اوری لی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھئے میڈم۔ بس دو ایک ہی منٹ میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔"

ناتمام گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔

"جناب! آپ کے معاملہ میں" کمپنی کے منتظم نے کہا "کمپنی اس بات کی ذمہ دار نہیں ہے کہ وہ چار لاکھ فرانک سے زیادہ ادا کرے۔ ہم آپ کے مزید ایک لاکھ فرانک کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کرسکتے۔ علاوہ ازیں اس کی قیمت ...."

"بہت اچھا جناب" بقیہ دو آدمیوں نے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا "عدالت سے تصفیہ ہوجائے گا۔ لہٰذا ملاقات کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔"

رسمی مصافحے اور کورنش کے بعد دونوں آدمی کمرے سے چلے گئے۔ اس وقت اگر میڈم اوری لی ہمت کرسکتیں تو وہ بھی ان کی پیروی کرتیں اور اپنے اٹھارہ فرانک قربان کر دیتیں۔ مگر اب تو

موقع ہاتھ سے جا چکا تھا۔ منتظم ان کی طرف متوجہ ہوا اور کورنش بجا لاتے ہوئے کہا "فرمائیے میڈم! میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

"میں اس لئے آئی تھی" انہوں نے بڑی کوشش سے سانس کو قابو میں کرتے ہوئے کہا "میں آئی تھی ...... اس کے لئے!"

منتظم نے اس چیز پر بڑی حیرانی سے نظر ڈالی جو گویا اس کے لئے سامان حیرت مہیا کرنے کے لئے پیش کی گئی تھی۔ میڈم اوری لی کی انگلیاں ربر کے چھلّے کو برابر کرنے میں مصروف تھیں۔ کئی مرتبہ کی کوشش کے بعد وہ چھتری کھولنے میں کامیاب ہوئیں اور فوراً ہی اس کی باقیات کو پوری طرح کمپنی کے منتظم کے سامنے کردیا۔

"اس کی ہیئت تو بالکل بگڑ چکی ہے" منتظم نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"مجھے اس کی قیمت بیس فرانک ادا کرنی پڑی" گویا وہ منتظم کے اندازے کا امتحان کرنا چاہتی تھیں۔

منتظم کو بہت تعجب ہوا۔

"واقعی؟ اس چھتری کی قیمت اتنی زیادہ ہے!"

"جی ہاں بہت ہی نفیس تھی۔ میں چاہتی تھی کہ آپ بھی اس کی موجودہ حالت کا بخوبی اندازہ کرلیں"

"جی ہاں اس میں کوئی شک ہے۔ مگر میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہا کہ اس چھتری کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟"

اس گفتگو سے میڈم اوری لی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ کہیں کمپنی اس کو معمولی نقصان سمجھ کر معاوضہ دینے سے انکار نہ کردے "آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ یہ جل گئی ہے!"

"ظاہر ہے" منتظم نے اس کے بیان کی صحت میں بالکل شبہ نہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اب تو الفاظ نے میڈم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک زور زور سے سانس لیتی رہیں پھر یکایک انہیں خیال آیا کہ وہ منتظم کو اپنا نام بتانا بھول گئیں ہیں "میں میڈم اوری لی ہوں" انہوں نے جلدی سے منتظم کی معلومات میں اضافہ کیا "ہم نے آپ کی کمپنی میں بیمہ کی پالسی لی تھی اور اب میرا ارادہ ہے کہ اس کا

کچھ معاوضہ طلب کروں۔"

منتظم کے غیر واجبی انکار کے امکان کا پہلے ہی سے اندازہ کر کے انہوں نے فوراً اس جملہ کا اضافہ کردیا "میں چاہتی ہوں کہ چھتری کی صرف درستی کروادی جائے"۔

"مگر میڈم" منتظم نے پریشان ہو کر احتجاجاً کہا "ہم چھتریوں کا معاملہ نہیں کرتے۔ ہم کو اس قسم کی چیزوں کی درستی سے کوئی تعلق نہیں۔"

اب میڈم اوری لی کا فطری جھگڑالو پن عود کر آیا۔ یہیں کشمکش ہونے والی تھی، اور وہ اس کے لئے تیار تھیں، ان کے دل سے اب خوف بھی نکل چکا تھا۔

"میں آپ سے صرف اس کی درستی کے اخراجات کی طالب ہوں۔ البتہ درست میں خود کروالونگی۔"

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کمپنی کے منتظم کو شکست ہو رہی تھی۔

"واقعی میڈم یہ ایک معمولی شکایت ہے۔ ہم سے کوئی شخص ایسے معمولی حادثات پر معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ آپ کو تو یہ معلوم ہی ہوگا کہ ہم سے کوئی ایسی بات کی توقع نہیں کرسکتا کہ ہم بتیوں، دستانوں، سوئیوں، پرانے جوتوں اور اسی قسم کی تمام ناکارہ چیزوں کا معاوضہ دیتے رہیں جو ان میں کسی وقت بھی جل سکتی ہیں۔"

اب میڈم اوری لی کے بڑھتے ہوئے غصہ کے ساتھ ساتھ ان کا رنگ بھی بدلتا جا رہا تھا "جناب، گذشتہ ڈسمبر میں ہمارے باورچی خانے کی چمنی میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے درست کرانے میں ہمارے پانسو فرانک خرچ ہوئے، لیکن موسیو اوری لی نے کمپنی سے ایک فارونگ کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ اس لئے اب یہی مناسب ہے کہ آپ میری چھتری کی درستی کے اخراجات ادا کریں۔"

کمپنی کا منتظم اس سفید جھوٹ پر مسکرانے لگا۔

"میڈم! آپ اس سے انکار نہیں کرسکتیں کہ یہ بات بڑی ہی تعجب انگیز ہے کہ موسیو اوری لی نے اس نقصان کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا جس کی مقدار پانچ سو فرانک تھی اور آپ صرف ایک چھتری کے نقصان کا معاوضہ طلب کر رہی ہیں، جس کی مقدار پانچ چھ فرانک سے زیادہ نہیں ہوتی۔"

"جناب، معاف کیجئے" اس نے ڈھٹائی سے کہا "پانچ سو فرانک کا تعلق موسیو اوری لی سے تھا،

لیکن اٹھارہ فرانک میڈم اوری لی کی تھیلی سے نکلے ہیں جو ایک بالکل جدا چیز ہے"

کمپنی کے منتظم نے یہ محسوس کر کے کہ اس طرح وہ پورا دن صرف کئے بغیر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گا، ملاقات ختم کرنے کے انداز میں کہا "کیا آپ مہربانی فرما کر حادثہ کی نوعیت بتا سکتی ہیں؟"

اپنی فتح کا یقین ہو جانے کے بعد انہوں نے قصہ شروع کیا "جناب! ہوا یہ کہ ہمارے کمرے میں چھتری اور چھڑیاں رکھنے کے لئے ایک مخصوص اسٹانڈ بنا ہوا ہے۔ کل باہر سے آکر میں نے حسب عادت اپنی چھتری اس پر رکھدی۔ مجھے آپ سے یہ بھی سچ سچ کہہ دینا چاہئے کہ اس کے اوپر دیا سلائی اور چراغ رکھنے کا محراب بنا ہوا ہے۔ رات میں نے ہاتھ بڑھا کر دیا سلائی نکالی۔ پہلی دیا سلائی جلی نہیں، میں نے دوسری کھینچی، وہ ہاتھ سے چھوٹ گئی، پھر تیسری سلائی ٹوٹ گئی"

"وہ دیا سلائیاں شائد مفت آئی ہوں گی!" منتظم نے مزاحاً بات کاٹی۔

"ممکن ہے" میڈم اوری لی نے مزاح کا لحاظ کئے بغیر جواب دیا "بہر طور بات دراصل یہ ہے کہ چوتھی سلائی سے میں قندیل روشن کرنے میں کامیاب ہوئی۔ چار گھنٹے کے بعد مجھے کسی چیز کے جلنے کی بو آتی محسوس ہوئی۔ میں آگ سے ہمیشہ بہت خائف رہتی ہوں۔ اگر کبھی آتش زدگی ہو جائے تو یقیناً اس میں میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ چمنی کے حادثہ کے بعد، جس کا کہ میں نے ابھی ذکر کیا، ہم ہمیشہ آگ سے بے حد خوف محسوس کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں بستر سے اُٹھی اور کمرے سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جس طرح کتا شکار کو سونگھتا پھرتا ہے میں بھی ادھر اُدھر سونگھنے لگی۔ آخر کار مجھے معلوم ہوا کہ یہ جلنے والی چیز میری چھتری تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کوئی دیا سلائی اس پر جا پڑی ہوگی۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ اب اس کا کیا حال ......"

کمپنی کے منتظم نے اس بلائے بے درمان کے آگے سر تسلیم خم کردیا!

"میڈم! اب آپ کس قدر رقم کی طالب ہیں؟"

لیکن وہ اپنی مطلوبہ رقم بتانے کی جرأت نہ کرسکیں۔ اس لئے خاموش رہیں۔

"یہ میں آپ ہی پر چھوڑتی ہوں" آخر کار انہوں نے اپنے آپ کو بڑا ہی فیاض ظاہر کرتے ہوئے کہا "آپ صرف اس کو درست کروا دیں۔"

"میڈم! یہ کام ہم نہیں کرسکتے۔ مہربانی کرکے آپ ہی رقم کا تعین کریں"

"کیوں ...... میرا خیال ہے کہ ...... نہ نہ سنئے جناب ...... میرا ارادہ آپ سے کوئی بے جا فائدہ اُٹھانے کا نہیں ہے۔ بہترین طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی درزی کے ہاں جاکر موٹے لیکن صاف ریشم سے اسے درست کروالوں اور اس کا بل آپ کو لادوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بہت خوب! معاملہ طے ہوچکا۔ یہ لیجئے درزی کے لئے یہ چٹھی موجود ہے۔ وہ درستی کی اُجرت جوڑ لے گا۔"

کمپنی کے منتظم نے انھیں ایک چٹھی دی۔ انھوں نے چٹھی اپنی مٹھی میں مضبوط پکڑی، کرسی سے اُٹھیں اور شکریہ کے الفاظ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی اس ڈر کے مارے کہ کہیں منتظم صاحب اپنا ارادہ نہ بدل دیں جلدی سے کمرے سے نکل گئیں۔

اس شاندار فتح کے بعد قدرتاً سڑک پر وہ اکڑتی چلیں اور کسی اونچی دوکان کی تلاش کرنے لگیں۔ بالآخر ایک نہایت شاندار دوکان نظر پڑی تو اس میں بڑی شان سے داخل ہوئیں اور اس کے منتظم سے تحکمانہ لہجے میں کہا:

"اس چھتری پر اپنے ہاں کا بہترین کپڑا چڑھاؤ —— ہاں اپنے ہاں کا بہترین ریشم۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے اخراجات کیا ہوں گے!"

(ترجمہ از جاپان)

سیّد مبارز الدین احمد متعلم بی۔ اے (ابتدائی)

یاد ہے

خرمنِ دل پر مرے بجلی گرانا یاد ہے
وہ ترا آنکھیں چُرا کر مسکرانا یاد ہے

چاندنی راتوں کی وہ پُرکیف صحبت کے مزے
جامِ صہبائے مسرت کا پلانا یاد ہے

دامنِ موجِ ہوا سے رُخ پہ ہونا منتشر
ناز سے گیسوئے مشکیں کا ہٹانا یاد ہے

یاد ہیں خلوت کی باتیں یاد ہیں رازونیاز
یاد ہے مجھ کو محبت کا زمانا یاد ہے

جسمیں میری باریابی باعثِ عشرت ہوی
جسمیں تم تھے جلوہ گر وہ آشیانا یاد ہے

جس سے ابتک لطف لیتی ہے مری فطرت عظیم
عشرتِ ماضی کا وہ رنگین فسانا یاد ہے

عظیم بی۔ اے ابتدائی (عثمانیہ)

شام

(وشنو سکھارام کھانڈے کر) مرہٹی زبان کے مشہور نقاد، افسانہ نویس، ناول نگار اور ESSAYIST ہیں اس وقت تک آپ کی ۲۹ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں، مرہٹی کے ایک بلندپایہ ماہنامہ "جیولنا" کے ایڈیٹر بھی ہیں، ذیل کا مضمون ان کی ایک کتاب "سانٹیکال" سے ماخوذ ہے۔

(امجد یوسف زئی)

اگر کوئی مجھ سے دریافت کرے کہ چوبیس گھنٹوں میں تمھیں کونسا وقت پسند ہے تو میں فوراً کہوں گا "شام" ہر شخص کا مذاق جدا ہوتا ہے چنانچہ فرانس کا مشہور مصنف فلابرٹ ہر روز آٹھ آٹھ گھنٹے میز پر بیٹھا اپنے مضمون کا ایک ایک لفظ قارئین کو بھلا معلوم ہونے کے لئے انتھک کوششیں کیا کرتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ "بغیر بیٹھے اور بغیر سوچے انسان کو لکھنا نہیں آسکتا۔ اس کے برخلاف جرمنی کا مشہور فلسفی نیٹشے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ "چلتے چلتے انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی مفید اور کار آمد ہوتا ہے۔"

لیکن اگر ان دونوں سے کسی نے دریافت کیا ہوتا کہ دن اور رات میں تمھیں کونسا وقت پسند ہے تو مجھے یقین ہے کہ دونوں نے یہی جواب دیا ہوتا "شام"

شاعر حساس ہونے کی وجہ سے شام پر کتنی اچھی نظمیں لکھتا ہے لیکن اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے ثبوت کے لئے میں شاعر کو پیش کروں اور اگر میں ایسا کروں تو کسی کو فوراً کسی قدیم مشہور شاعر کی کتابیں جو اس سے نفرت کرتا ہو مجھ پر پھینکنے دیر نہ لگے گی، اور میرا خیال ہے کہ شام کی دلفریبی بیان کرنے کے لئے گواہ وغیرہ کی ضرورت ہی کہاں ہے؟

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ مجھے شام کے سوا کوئی دوسرا وقت پسند نہیں جس طرح موسیقی کے شائقین کو کوئی راگ زیادہ بھاتا ہے یا کسی کو خاص خاص پھول زیادہ پسند آتے ہیں میری حالت بھی اسی قسم کی ہے۔

یوں دیکھا جائے تو شام، صبح، دوپہر اور سہ پہر دن کے مختلف حصے ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے لحاظ سے کافی اچھے ہیں۔ میں نے دن کے ان مختلف اوقات سے اسی طرح لطف اُٹھایا ہے جس طرح کوئی مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔

ڈاڑھ دکھنے کی وجہ سے یا کسی نئے ناول لکھنے کے لئے کوئی قصہ دماغ میں کھیل رہا ہو اور نصف شب تک نیند نہ آئے تو میں تھوڑی دیر تک چڑ جاتا ہوں جسم کو بھی بچھونے پر سے اُٹھانا بار معلوم ہوتا ہے لیکن اگر بازو کی کھڑکی میں سے دبے پاؤں آئی ہوئی چاندنی کی طرف میری نظر پڑی کہ ایک ہی لمحہ میں یہ سارے خیالات درہم برہم ہو جاتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاندنی مجھے کھیلنے کے لئے باہر بلا رہی ہے اور دروازہ کھول کر باہر آتے ہی اس دلفریب منظر کو دیکھ کر ڈاڑھ کا درد کافور ہو جاتا ہے۔ جدھر دیکھو چاندنی کا سمندر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جھلملاتے ہوئے تارے اس سمندر کی سطح پر اُبلنے والے بلبلوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں چھوٹی چھوٹی عمارتیں سمندر کی تھپیڑیں کھانے والی چٹانوں کے مانند نظر آتی ہیں، اس وقت یہی خواہش میرے دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے کہ اس خاموش سمندر میں ایک مچھلی کی طرح ناچتے رہوں۔ میرے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ بقیہ آدمی اس قدر مردہ دل کیوں ہیں؟ ان مدہوشان خواب کو یہ کہاں معلوم ہے کہ دنیا کو کس قدر حسین خواب پڑا ہے؟ کوئی کہے گا کہ چاندنی رات ہمیشہ نہیں رہتی یہ میں بھی جانتا ہوں۔

نصف شب میں اگر بیدار ہو جائیں اور جدھر نگاہ دوڑائیں تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی دکھائی دے اور ایسے وقت خاموشی سے اپنے بستر پر جاکر سو جائیں۔ کیا یہ خیال انسان کے دل میں آئے گا؟

دوسروں کا تجربہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن مجھے شب تاریک شب روشن کی طرح پسند ہے، ایک دفعہ میں شب دیجور کو کمرے سے باہر آیا۔ تاریکی کو دیکھ کر میرے دل میں کیا خیال آیا ہوگا؟ دنیا سیاہ ساڑھی پہنی ہوئی ہے۔ نہیں اس قسم کے خیالات شاعر کی بہ نسبت تاجر کو زیب دیں گے، شام نے اپنی زلفِ سیاہ کو بکھیر دیا ہے، گو یہ خیال پہلے سے اچھا ہے لیکن میرا خیال بالکل الگ تھا۔ مادرِ ارض نے اپنے بچوں کو کالا کمبل اوڑھنے اس لئے دیا ہے کہ انھیں سردی نہ ہو" چاندنی دنیا کو خوبصورت بناتی ہے تو تاریکی اس کو

ایک جان اور متحد کرتی ہے۔

آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی رات کا حُسن قائم رہتا ہے' صبح ہوشیار ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان کا بچپن عود کر آیا ہے۔ جھولے میں کے کھیلنے والے بچہ کی طرح ہم اس تکیہ پر سے اس تکیہ پر لوٹتے ہیں دیہات سے آنے والے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز اس طرح سُنائی دیتی ہے جس طرح کہ کوئی بچے کے پاس گھنگرو وغیرہ بجائے۔ مرغوں کی بانگیں اور کوؤں کی کائیں کائیں سُنائی دیتی ہیں۔ قدرت ہمارے لئے مختلف قسم کے کھلونے فراہم کرتی ہے۔ دروازہ کے باہر آتے ہی سرد ہوا کا جھونکا فرحت بخشتا ہے آسمان میں صبح کا تارہ ہنستا ہوا دکھائی دیتا ہے اور صحن میں کے پھولوں کی بو آتے ہی دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ قسمت بھی ایک پھول کے درخت کی طرح ہے جس پر ہمیشہ خوشبودار پھول نہیں کھلتے اور جب کبھی کھلتے ہیں تو چند لمحوں کے بعد ہی مرجھا جاتے ہیں"

صبح کے بعد کے وقت میں بھی کچھ کم جاذبیت نہیں ہوتی' نیم باز آنکھیں کھولیں تو دروازہ میں سے سورج کی سنہری کرنیں جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں' ہم اُٹھ جاتے ہیں اور غسل خانہ میں چلے جاتے ہیں جہاں گرم پانی منہ دھونے کے لئے تیار رہتا ہے۔ منہ دھو کے گھر میں آتے ہیں تو کیتلی میں سے چائے کے بخارات ناچتے ناچتے باہر نکلتے ہیں' چائے پی کر باہر آتے ہیں تو پھولوں کے درختوں پر کی پوری کلیاں کھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس وقت دماغ میں یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے دل کی کلیاں بھی آج نہیں تو کل اسی طرح کھلیں گی' صبح انسان کا بچپن عود کر آتا ہے تو اس کے بعد کے وقت میں اس کے لڑکپن کا جنم ہوتا ہے۔

کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ صبح اور اس کے بعد کے وقت کی خوشی دوپہر کے منظر میں نہیں آتی۔ گو مختلف پہلوؤں سے میں یہ قبول کرتا ہوں کہ دوپہر کا وقت کٹھن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چلچلاتی ہوئی دھوپ میں انسان کا اگر سایہ چھپ بھی جائے تو بھی اسی دھوپ میں سے مرگ کے پانی کا حسین منظر جھانکتا ہوا دکھائی نہیں دیتا؟

اس دلفریب منظر کی یاد میرے دماغ سے کبھی نہیں جاسکتی جب کہ میں گوکن کے ایک گاؤں کو جانے کے لئے نکلا تھا۔ بارہ بج گئے۔ لیکن موٹر وقت پر وہاں نہ پہنچ سکی۔ اس مقام سے میل ڈیڑھ میل

پیدل جانا پڑتا تھا۔ موٹر کو اس قدر دیر نہ لگے گی اس خیال سے میں نے چھتری بھی ساتھ نہیں رکھی تھی۔

اسٹانڈ پر موٹر سے اترتے ہی باہر کی دھوپ کا جسم کو ایک چرکہ بیٹھا۔ ایسی دھوپ میں میل ڈیڑھ میل پیدل جانے کے خیال سے میرا دل مصیبت اور تکلیف کے سمندر میں غوطے مارنے لگا۔ لیکن دھوپ کو میرے دل سے کیا کرنا تھا اُس کا جان لیوا کھیل یکساں جاری تھا۔ تپی ہوئی زمین پر میں چلنے لگا۔ نصف فرلانگ ہی جانے تک سارا بدن پسینہ سے شرابور ہوگیا۔ آگے نصف فرلانگ کے فاصلہ پر ایک پیپل کا درخت دکھائی دیا۔ اس کے پتّے اس کی ننھی ننھی شاخیں ہل رہی تھیں شاید وہ مجھے بلا رہی تھیں میں نے خیال کیا کہ میں وہاں کب پہونچتا ہوں لیکن اگر دل نے وہاں تک پرواز کی بھی تو انہی وزنی پاؤں سے چل رہا تھا۔ اتنے میں بائیں بازو کے کشادہ میدان کی طرف میں نے دیکھا۔ میدان کی دوسری جانب سمندر کی نیلی موجیں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیں' میں اسی کو دیکھنے لگا' سر کو تپانے والی دھوپ کو بالکل بھول گیا' اس کی ٹھنڈی ہواؤں نے میرے دل کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو طراوت بخشی۔ اس کو دیکھتا ہوا میں گھر پہنچ گیا مجھے اس وقت یہ تجربہ ہوا کہ اگر سخت دھوپ بھی ہو تو انسان کہیں کے دل بہلانے والے واقعات میں گم ہو کر اپنی راہ آسانی سے طے کر سکتا ہے۔"

بعض حضرات کا خیال ہے کہ گرمائیں دوپہر کے بارہ بجے جسم میں سے پسینہ کی دھاریں نکلتی ہیں ایک کارخانہ کے مزدور اور ایک قیدی کو اُس مرگ کا خیال کیا ہوگا؟

چکیوں' مشینوں' ٹائپ اٹڑوں کی آوازوں سے پرے ان آدمیوں کو دوسری آوازیں کبھی بھی سنائی نہیں دیتیں انہیں صرف ایک ہی بات دکھائی دیتی ہے ..... کام۔

دن کا یہ درمیانی حصہ اُس کا عالم شباب ہے اور نوجوان کہیں تو شیواجی کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے' جھانسی کی لکشمی بائی سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ تعلیم کی کتابوں کو بازو رکھ کر ملک کی خدمت کرنے والا تلک آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے' کتنا خوبصورت اور کتنا عجیب و غریب لفظ ہے نوجوان۔

لوگوں کو دوپہر جس قدر خراب دکھائی دیتی ہے وہ درحقیقت اتنی نہیں ہوتی لیکن ممکن ہے کہ

لوگ اس کے ماننے میں پس وپیش کریں اور مجھ سے بحث وتکرار کریں ... سہ پہر میں تمھیں کونسی خوبصورتی دکھائی دیتی ہے ۔ آؤ اب دیکھیں'

سہ پہر میں نرالا حسن ہوتا ہے ۔ اور یہ میرا تجربہ ہے کہ چار پانچ گھنٹے کام کرکے گرم گرم چائے کے اس وقت کے گھونٹ میں جو لطف ہے وہ کسی وقت کی چائے میں نہیں' نصف سے زیادہ کام ختم ہونے کی وجہ سے اس چائے کے پیتے وقت دل کو اسی طرح اطمینان ہوتا ہے جس طرح کہ ندی کا پیراک بھرپور ندی میں نصف سے زیادہ ندی تیر کر فخر سے پیچھے دیکھتا ہے'

کتنوں کی قسمت میں یہ خوشی ہوئی ہوگی اور کتنے اس کا کھلے بندوں استقبال کرتے ہوں گے ۔ خیال کیجئے کہ اگر اپنے چہیتے دوست ملاقات کے لئے آنے والے ہیں ۔ ایسے وقت اگر دروازہ میں پاؤں کی آواز آتے ہی ہم اُس طرف دیکھنے لگتے ہیں ۔ سہ پہر میں سرد ہواؤں کے جو جھونکے چلتے ہیں وہ کیا اسی طرح شام کی یاد نہیں دلاتے ۔ اور شام کے خیال ہی سے جس کا دل گدگدا نہ اُٹھے ویسا بدنصیب دل دنیا میں کوئی نہ ہوگا ۔

دن کے مختلف اوقات میں شام کا خیال آتے ہی میرے دل میں خوشی موجیں مارنے لگتی ہے' بچپن میں صبح کی یاد ہوئی تو بستر پر سے کسی نہ کسی خوف سے اُٹھ جاتا اور مدرسہ کی ہیبت آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ۔ اس وقت کی دوپہر بھی ویسی ہی تھی ۔ کسی کے پھٹے پرانے کپڑے لا کر اس کے پردے بنا کر ہم لڑکے لڑکیاں یاد نہ کئے ہوئے نقلوں کے ناٹک کیا کرتے' ہمارے والدین نیند میں خلل ہونے کے خیال سے یہ کہتے' ناٹک اور ڈراموں کو اب زوال آگیا ہے ؟ یہ بات مجھے بچپن میں کیوں معلوم ہوئی ۔ یہ شاید میری ذہنی اپجوں کو پہلے ہی دبا دیا گیا ۔

بچپن کی شام البتہ جنت کی طرح معلوم ہوتی تھی ..... وہ خوشی کا یا آرام کا ساگر تھی .. کسی لفظ کا بھی اظہار کریں تو اس کی خوبصورتی کہاں سے آسکتی ہے ۔ مدرسہ چھوٹتے ہی میرے دل میں خوشی کا دیوتا ناچنے لگتا تھا ۔ باہر نکلتے وقت مدرسہ چھوٹا' اور اس قسم کے دوسرے جملے کہتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہوتی تھی ۔ اور میں ان کو گنگناتا ہوا گھر آتا اور ماں بھوک لگی ہے کہتے ہی ماتاجی لڈو ہاتھ میں دیتیں

اس وقت دل بلیوں اچھلتا' بھائی میری پسند کی چیزیں خود نہ کھا کر میرے لئے چھوڑ جاتے اور ماتاجی وہ مجھے دیتیں ۔ اس محبت کی یاد سے اب بھی میں خوش ہوتا ہوں ۔

کھا پی کر اندھیرا ہوتے ہی چراغ روشن کیا جاتا ۔ دیپک نمسکار کرنے اور تلسی کی پوجا میں میں خاص لطف محسوس کرتا تھا ۔ اس کے بعد اندھیرے کو دیکھ کر بھوت پریت کی باتیں دل میں آنے لگتیں تو ماتاجی کے ہمراہ باورچی خانہ سے دالان تک اور دالان سے باورچی خانہ تک ماتاجی کا آنچل پکڑے ہوئے جانے میں دل کو اطمینان ہوتا تھا ، کتنا ہی بڑا بھوت ہو تو ماتاجی کے آنچل میں چھپ جائیں تو وہ انگلی بھی نہیں لگائے گا ۔ اس قسم کی وہ معصوم باتیں کس قدر دلچسپ تھیں ۔ دیواروں پر اپنی اور ماتاجی کی پرچھاؤں کو دیکھ کر کچھ وقت گزر جاتا اور اس کے بعد ماتاجی گرم گرم گھی اور کچھ ساگ سامنے رکھدیتیں ۔ اس غذا میں جو لذت تھی وہ پچاسوں پکوان میں نہیں تھی ۔

میں کھانے بیٹھتے ہی جمنی ' راگھو اور بہت سے دوست احباب مجھے ایک ایک نوالہ دیتے' کبھی میں خیال کرتا کہ مجھے اسی طرح کھلانے کے لئے ایشودا مائی یا پُران میں کے دیوی دیوتا آئیں گے ۔ غرض یہ شام کی دلچسپ اور معصوم باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں ۔

انگریزی مدرسہ میں جانے کے بعد شام مجھے اور زیادہ دلچسپ دکھائی دینے لگی ۔ چار بجنے سے قبل میں خیال کرتا کہ مدرسہ کب چھوٹتا ہے اور مجھے کرکٹ کھیلنے کے لئے کب میدان جانا پڑتا ہے ۔ اس کھیل میں طبیعت بہل جاتی تھی' اس مدرسہ میں میرا روز چوبیس گھنٹوں کا نہیں تھا اس کی لمبائی ۲۲ گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم ہوگئی تھی ۔

کالج میں جانے کے بعد شام نے میرے دل پر عجیب قسم کا اثر کیا ۔ کھیلنے کے بجائے کہیں دور تفریح کے لئے نکل جاتا ۔ کسی ٹیلہ پر جا کر بیٹھ جاتا اور مغرب کی طرف جو رنگ آمیزی ہوتی ہے اسے غور سے دیکھتا ۔ اندھیرا ہوتے ہی کمرے کی طرف لوٹنے لگتا تو وہی دلفریب منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرتا رہتا ۔ رات میں مطالعہ کے لئے بیٹھیں تو کتابوں کی دنیا سے ایک قسم کی بیزاری محسوس ہوتی ۔ کتابوں کو باز و رکھ کر کھڑکی میں سے چاند کی روشنی یا تاروں کی

لوگ اس کے ماننے میں پس و پیش کریں اور مجھ سے بحث و تکرار کریں ... سہ پہر میں تمھیں کونسی خوبصورتی دکھائی دیتی ہے۔ آؤ اب دیکھیں'

سہ پہر میں نرالا حسن ہوتا ہے۔ اور یہ میرا تجربہ ہے کہ چار پانچ گھنٹے کام کر کے گرم گرم چائے کے اس وقت کے گھونٹ میں جو لطف ہے وہ کسی وقت کی چائے میں نہیں' نصف سے زیادہ کام ختم ہونے کی وجہ سے اس چائے کے پیتے وقت دل کو اسی طرح اطمینان ہوتا ہے جس طرح کہ ندی کا پیراک بھرپور ندی میں نصف سے زیادہ ندی تیر کر فخر سے پیچھے دیکھتا ہے'

کتنوں کی قسمت میں یہ خوشی ہوئی ہوگی اور کتنے اس کا کھلے بندوں استقبال کرتے ہوں گے۔

خیال کیجئے کہ اگر اپنے چہیتے دوست ملاقات کے لئے آنے والے ہیں۔ ایسے وقت اگر دروازہ میں پاؤں کی آواز آتے ہی ہم اُس طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ سہ پہر میں سرد ہواؤں کے جو جھونکے چلتے ہیں وہ کیا اسی طرح شام کی یاد نہیں دلاتے۔ اور شام کے خیال ہی سے جس کا دل گدگدا نہ اُٹھے ویسا بدنصیب دل دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

دن کے مختلف اوقات میں شام کا خیال آتے ہی میرے دل میں خوشی موجیں مارنے لگتی ہے' بچپن میں صبح کی یاد ہوئی تو بستر پر سے کسی نہ کسی خوف سے اُٹھ جاتا اور مدرسہ کی ہیبت آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ اس وقت کی دوپہر بھی ویسی ہی تھی۔ کسی کے پھٹے پرانے کپڑے لا کر اس کے پردے بنا کر ہم لڑکے لڑکیاں یاد نہ کئے ہوئے نقلوں کے ناٹک کیا کرتے' ہمارے والدین نیند میں خلل ہونے کے خیال سے یہ کہتے' ناٹک اور ڈراموں کو اب زوال آگیا ہے؟ یہ بات مجھے بچپن میں کیوں معلوم ہوئی۔ یہ شاید میری ذہنی اپجوں کو پہلے ہی دبا دیا گیا۔

بچپن کی شام البتہ جنت کی طرح معلوم ہوتی تھی ..... وہ خوشی کا یا آرام کا ساگر تھی .. کسی لفظ کا بھی اظہار کریں تو اس کی خوبصورتی کہاں سے آسکتی ہے۔ مدرسہ چھوٹتے ہی میرے دل میں خوشی کا دیوتا ناچنے لگتا تھا۔ باہر نکلتے وقت مدرسہ چھوٹا' اور اس قسم کے دوسرے جملے کہتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔ اور میں ان کو گنگناتا ہوا گھر آتا اور ماں بھوک لگی ہے کہتے ہی ماتاجی لڈو ہاتھ میں دیدیتیں

اس وقت دل بلیوں اچھلتا' بھائی میری پسند کی چیزیں خود نہ کھا کر میرے لئے چھوڑ جاتے اور ماتاجی وہ مجھے دیتیں۔ اس محبت کی یاد سے اب بھی میں خوش ہوتا ہوں۔

کھاپی کر اندھیرا ہوتے ہی چراغ روشن کیا جاتا۔ دیپک نمسکار کرنے اور تلسی کی پوجا میں میں خاص لطف محسوس کرتا تھا۔ اس کے بعد اندھیرے کو دیکھ کر بھوت پریت کی باتیں دل میں آنے لگتیں تو ماتاجی کے ہمراہ باورچی خانہ سے دالان تک اور دالان سے باورچی خانہ تک ماتاجی کا آنچل پکڑے ہوئے جانے میں دل کو اطمینان ہوتا تھا، کتنا ہی بڑا بھوت ہو تو ماتاجی کے آنچل میں چھپ جائیں تو وہ انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ اس قسم کی وہ معصوم باتیں کس قدر دلچسپ تھیں۔ دیواروں پر اپنی اور ماتاجی کی پرچھاؤں کو دیکھ کر کچھ وقت گزر جاتا اور اس کے بعد ماتاجی گرم گرم گھی اور کچھ ساگ سامنے رکھدیتیں۔ اس غذا میں جو لذت تھی وہ پچاسوں پکوان میں نہیں تھی۔

میں کھانے بیٹھتے ہی جمنی ' راگھو اور بہت سے دوست احباب مجھے ایک ایک نوالہ دیتے' کبھی میں خیال کرتا کہ مجھے اسی طرح کھلانے کے لئے ایشودا مائی یا پُران میں کے دیوی دیوتا آئیں گے۔ غرض یہ شام کی دلچسپ اور معصوم باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں۔

انگریزی مدرسہ میں جانے کے بعد شام مجھے اور زیادہ دلچسپ دکھائی دینے لگی۔ چار بجنے سے قبل میں خیال کرتا کہ مدرسہ کب چھوٹتا ہے اور مجھے کرکٹ کھیلنے کے لئے کب میدان جانا پڑتا ہے۔ اس کھیل میں طبیعت بہل جاتی تھی' اس مدرسہ میں میرا روز چوبیس گھنٹوں کا نہیں تھا اس کی لمبائی ۲۲ گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم ہوگئی تھی۔

کالج میں جانے کے بعد شام نے میرے دل پر عجیب قسم کا اثر کیا۔ کھیلنے کے بجائے کہیں دور تفریح کے لئے نکل جاتا۔ کسی ٹیلہ پر جا کر بیٹھ جاتا اور مغرب کی طرف جو رنگ آمیزی ہوتی ہے اسے غور سے دیکھتا۔ اندھیرا ہوتے ہی کمرے کی طرف لوٹنے لگتا تو وہی دلفریب منظر آنکھوں کے سامنے رقص کرتا رہتا۔ رات میں مطالعہ کے لئے بیٹھیں تو کتابوں کی دنیا سے ایک قسم کی بیزاری محسوس ہوتی۔ کتابوں کو بازو رکھ کر کھڑکی میں سے چاند کی روشنی یا تاروں کی

جھلملاہٹ دیکھیں تو دماغ کو ایک سکون معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت میں ہفتہ میں تین چار نظمیں لکھا کرتا تھا۔ ان نظموں میں سورج کے غروب ہونے کا یا شفق کا ذکر ہوتا۔

صبح اُٹھتے ہی انسان اپنے اپنے کام کاج میں لگ جاتا ہے اور یہ ہر شخص کو مکان کے باہر لے جاتی ہے۔ لیکن شام گائیوں کو گھنٹیاں بجاتے انھیں گھر آنے کی دعوت دیتی ہے جنگلوں سے گھونسلوں کی طرف۔ چراگاہوں سے کوٹھوں کی طرف اور کارخانہ سے مکان کی جانب، پرندوں، گائیوں اور دیگر جانوروں، مزدوروں کو گھر لوٹتے وقت "شام" سب وقتوں سے زیادہ عزیز ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

(ترجمہ)

امجد علی خان یوسف زئی، متعلم سال چہارم

حقیقتِ غم

میری والدہ محترمہ کے انتقال ہی نے مجھے دردِ غم سے روشناس کرایا ہے اور اسی وقت میں نے غم کی حقیقت کو جانا ہے! (بزمی)

(ادارہ)

جب کبھی روداد غم اپنی سُنا دیتا ہوں میں
زندگی پر ہنسنے والوں کو رُلا دیتا ہوں میں

غم سے الفت ہے مجھے غم سے محبت ہے مجھے
غسم کا طوفاں دمبدم دل میں اُٹھا دیتا ہوں میں

رات دن پہلو میں رہتا ہے تسلی کے لئے
اس لئے غم خوار۔ خود غم کو بنا دیتا ہوں میں

سوزِ دل سوزِ جگر غسم کا نتیجہ ہی تو ہے
جب کبھی سوتا ہے دل غم کو جگا دیتا ہوں میں

جب کبھی میں دیکھتا ہوں بحرِ غسم کو موجزن
ناخدائے کشتیٔ دل کو دعا دیتا ہوں میں

خندہ زن رکھتا ہے مجھ کو دردِ ناکامی میرا
اضطرابِ غم بڑھا کر مسکرا دیتا ہوں میں

جب کبھی رہتا نہیں غم دل میں رہتا ہوں اُچاٹ
زندگی کو غسم کے دامن کی ہوا دیتا ہوں میں

دیکھ اے غم! تو نہ ہرگز چھوڑنا دل کو میرے
آستاں پر تیرے ہی سر اپنا جھکا دیتا ہوں میں

کیا ہوا اے برق مضطر! کیوں چمک کر رہ گئی
لے اب اپنے آشیاں کو خود جلا دیتا ہوں میں

فرطِ غم میں وا ہوئے جاتے ہیں عقدے زیست کے
جو نہفتہ راز غم کا ہے بتا دیتا ہوں میں

تا نہ ہو بزمیؔ زمانہ میں تیری رسوائیاں
آ تجھے آدابِ رنج و غم سکھا دیتا ہوں میں

یہ خوشی کون و مکاں کی سب برائے نام ہے
غم ہی پر آخر ہمارا آخری انجام ہے

احمد معین الدین بزمیؔ متعلم سال چہارم

نامیاتی کیمیا اور اس کا ارتقاء

کتب سائنس کی صفحہ گردانی سے یہ روشن ہوتا ہے کہ گو کیمیائی تعاملات کا مشاہدہ بنی نوع انسان نے ہزارہا برس پہلے جبکہ علم کیمیا تصور موہوم معلوم ہوتا تھا کیا ہوگا اور ان کا استعمال دھاتوں کے ذرات سے حاصل کرنے کے عمل اور فنون گریزی اور چمڑا سازی میں بھی ہوا ہوگا لیکن یہ استدلال اس حقیقت کا مشاہدہ ہیں کہ ان صنعتوں کی ترقی تعاملات کی خاصیت کے صحیح علم کی مرہون منت ہے یہ سب مشاہدات اتفاقات پر یا ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں آزمایشی تجربات پر مبنی تھے۔ لیکن ان کلیات اور نظریات کا پورا (Record) موجود نہیں ہے حالانکہ یہ بات مشتبہ نہیں کہ متقدمین کو عام اشیاء کے خواص اور استعمال کا بخوبی علم تھا اس لئے اگر یہ تصور کیا جائے کہ کیمیا کی ابتداء متذکرہ فنون کی بنا پر ہوئی تو بیجا نہ ہوگا اور اس رو سے یہ درحقیقت تجرباتی سائنس کہے جانے کی مستحق ہے۔

نامیاتی کیمیا کو نشو و نما پائے نسبتاً طویل عرصہ نہیں گذرا ہے اس کی صحیح زندگی کا آغاز دراصل ۱۸۳۷ء سے ہوا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ نامیاتی اشیاء اور ان چیزوں کے تعاملات کے علم سے لوگ اس سے قبل ناآشنا تھے جس کی تصدیق متذکرہ صدر بیان سے ہوتی ہے متعدد نباتاتی اور حیوانی اشیاء مثلاً شکر۔ نشاستہ۔ تیل۔ گوند اور رال وغیرہ اور اصول صابن سازی سے لوگ ابتدا میں بھی واقف تھے علم تخمیر اور کشید کے باعث متعدد اشیاء مثلاً الکوہل۔ تارپین کا تیل اور ریٹک ترشیہ وجود میں آئے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں شیل نامی ایک مشہور سائنسدان نے نامیاتی ترشوں کے جدول میں متعدد ترشوں کا مثلاً سیلک ترشہ سائٹرک ترشہ اگزیلیک ترشہ اور بنیزوائنک ترشہ جو علی الترتیب سیب، لیمو، سارل اور لوبان سے حاصل کئے گئے تھے اضافہ کیا اور زیتون کے تیل سے

گلیسرین تیار کی۔ لیکن اس وقت تک سوائے چند قدرتی اشیاء کی تحقیقات کے نامیاتی کیمیا کے باقاعدہ مطالعہ کے لئے کوئی خاص اصول مرتب نہیں کئے گئے تھے دراصل اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن ہونا بہت محال تھا جس وقت تک کہ فلوجیسٹنی نظریہ (Phlogistic theory) کا وجود تھا لیکن نئی صدی کی نورانی صبح نے بہت جلد احتراق اور نامیاتی مرکبات کی ترکیب Composition کی اصلیت کو لوگوں پر منکشف کر دیا اور مرکبات کی ترکیب کے علم کی جستجو میں سب سے پہلے لیوائیزر کامیابی کی منزل پر پہونچا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ نامیاتی مرکبات تین عناصر کاربن ہائڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہیں اور اس میں بعد ازاں برتھولیٹ نے نائٹروجن کا اضافہ کر دیا لیکن پھر بھی اس مضمون کا کوئی پرسان حال نہیں ہوا جس کے مندرجہ ذیل وجوہات ہو سکتے ہیں نامیاتی کیمیا میں معدنی اشیاء اور ان کے مشتقات شامل تھے اور برخلاف اس کے غیر نامیاتی مرکبات ترکیب کی سادگی کے باعث ہر ایک کے تختہ مشق بنے تھے دو یا تین عناصر عام طور پر ایک یا دو اور بمشکل تین کے تناسب میں تعامل کر کے مرکبات پیدا کرتے تھے سوڈیم اور کلورین سے پیدا شدہ فقط ایک نمک سوڈیم کلورائڈ یا معمولی کھانے کا نمک موجود تھا ہائیڈروجن اور آکسیجن سے پیدا ہونے والی فقط ایک شئے پانی موجود تھی اور کیلسیم گندھک اور آکسیجن سے پیدا ہونے والا ایک مرکب جپسم (ایک قسم کا پلاسٹر) تھا۔

لیکن نامیاتی مرکبات مثلاً الکوہل۔ شکر۔ گلیسرین اسیٹک ایڈ تیل اور چربیاں جن کے خواص میں زمین آسمان کا فرق ہے گو وہ بھی تین عناصر پر مشتمل تھے لیکن ان کے تناسب ہر ایک میں مختلف تھے یہ بعید الفہم تھا کہ کس طرح تین عناصر سے اتنے بہت سے مرکبات وضع کئے جا سکتے تھے جن کے خواص اتنے پیچیدہ تھے اس لئے کسی غیبی قوت کے وجود کا اعلان کیا گیا جو ان مرکبات کی پیدائش میں ممد رہتی تھی اور اس کو حیاتی قوت Vital Force کے نام سے موسوم کیا گیا غرض اس طرح قواعد وضع کئے گئے جن کے مطابق نامیاتی کیمیا نے گمنامی کی گود سے اتر کر انسانی ہاتوں کی مدد سے ترقی کی راہ میں چلنا شروع کیا اس کے اور غیر نامیاتی کیمیا کے کلیات میں بہت اختلاف تھا۔ اس سے

متعلق مرکبات کو نامیاتی کہا جاتا تھا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کی علت نامیاتی مادہ تھی۔
سنہ ۱۸۱۴ء میں برزیلیس نے نامیاتی تشریح کا نیا قاعدہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس کے ذریعہ سے وہ کچھ نامیاتی ترشوں کی صحیح ترکیب معلوم کرنے میں کامیاب ہوا اور دوران تجربہ میں ان سے اس نے نامیاتی مرکبات کے اجزاء ترکیبی کے جواہر کے سادہ تناسب کو آشکارا کر دیا اور اس طرح سے نامیاتی اور غیر نامیاتی مرکبات میں اس تفریق کو مٹا دیا۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد آخر غیر نامیاتی مادے سے نامیاتی مرکبات کی تیاری نے حیاتی قوت کے اعتقاد کی مستحکم دیواروں کو ہلا دیا یہ بالکل درست ہے کہ شیل نے سنہ ۱۷۶۹ء میں اگزیلیک ترشہ۔ شکر۔ اور نائٹرک سے تیار کیا تھا جو ہنوز سارل میں پایا گیا اور ڈوبیرنیر نے سنہ ۱۸۲۲ء میں یہ مشاہدہ کر لیا کہ ٹارٹیرک ترشہ تکسید کے بعد فارمک ترشہ پیدا کرتا ہے جو اس سے پہلے جنیٹون کے پانی کے ساتھ کشید سے حاصل کیا گیا تھا (اور اس میں بھی کلام نہیں کہ سنہ ۱۸۲۶ء میں ہینل نامی ایک انگریز عطار نے اس کے اجزاء ترکیبی سے الکوہل تیار کی اور بعد ازاں سنہ ۱۸۲۸ء میں دھلر نے بیڈ سائینٹ اور امونیم کلورائڈ سے یوریا تیار کیا جو خالص حیوانی شئے ہے لیکن ان مصنوعی اشیاء میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جو بغیر حیوانی یا نباتاتی مادے سے تیار کی جا سکتی ہے حتیٰ کہ سائنٹس (Cyanates) بھی پوٹیشم فیری سائنیڈ سے اخذ کئے جاتے تھے جس کی تیاری میں حیوانی مادہ استعمال ہوتا تھا لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ اس آخری تفریق کی شمع گل ہونے لگی جس نے نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا کو جدا کر دیا تھا اور نامیاتی کیمیا کاربن کے مرکبات کی کیمیا کہلائے جانے لگی۔ اس وقت جب کہ نامیاتی کیمیا اپنی زندگی کے اس معیار تک پہونچ چکی تھی سنہ ۱۸۳۲ء میں لیبگ اور وھلر کی نیز واشک ترشہ کے اصلیت سے متعلق تحقیقات سے اس کی زندگی میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی بقول ان کے یہ تحقیقات نامیاتی کیمیا کی تاریک سطح کو مجلا کر سکتی ہے۔

نامیاتی کیمیا جو اس وقت کچھ سو اشیاء پر مشتمل تھی جو نباتاتی یا حیوانی مادے سے اخذ کئے گئے تھے اب کئی لاکھ مرکبات پر مشتمل ہے جو دار التجربہ میں تیار ہوتی ہیں اس وقت یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر یہ ترقی کس چیز کی بدولت ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ پہلا سبب تو وہ کلیات ہیں جو سنہ ۱۸۵۸ء میں کیکول نے پہلی مرتبہ وضع کئے جو نامیاتی مرکبات کی بناوٹ کی بنیاد ہیں ان کلیات سے نامیاتی اشیاء کی بڑی تعداد کو متحد کرنے میں ہی مدد نہیں دی ہے بلکہ ان کی بناء پر کیمیا گر اور مرکبات کے وجود کی تعین سے پیشین گوئی کر سکتے ہیں جو ابتک نامعلوم زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں دوسرا سبب نامیاتی کیمیا میں تحقیقات کا صنعتی استعمال ہے جس کی ابتداء پرکن نے سنہ ۱۸۵۶ء میں کی مصنوعی رنگوں کی ایجاد نے جن رنگریزی کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اکثر اشیاء کے مخدرانہ اور تعصیمانہ عمل کے انکشاف سے ڈاکٹروں کو بہت مدد ملی ہے اور فوٹوگراف بھی نامیاتی Developers کا معتقد ہے۔ مصنوعی ادویات وعطریات آجکل بہت مستعمل ہیں علاوہ ان کے چمڑا سازی اور مختلف چیزوں کے بنانے میں مثلاً نشاستہ صابون کاغذ پیرافین۔ روشنائی۔ گوند اور جلاٹین ربر اور بارود وغیرہ کی تیاری میں نامیاتی کیمیا کا احسان مند ہونا پڑتا ہے۔ نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا ہی ابتک قائم رکھی گئی ہے جس کا سبب ان کے بنیادی اصولوں میں اختلاف نہیں بلکہ سہولت کا خیال ہے نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا میں فرق کے اسباب :۔ کیمیا کو ان دو شاخوں میں تقسیم کر دینے کا پہلا سبب نامیاتی مرکبات کی کثیر تعداد اور ان کی پیچیدگی ہے ان کی تعداد کا ذکر کیا جا چکا ہے اور اس کے مرکبات کی پیچیدگی مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔

$C_{10}H_{16}$	نارپین
$C_{12}H_{22}O_{11}$	گنے کی شکر
$C_{57}H_{110}O_{6}$	اسٹرین
$C_{1200}H_{2000}O_{1000}$	نشاستہ (حل پذیر)

دوسرا سبب یہ ہے کہ نامیاتی مرکبات کے تعاملات بہت پیچیدہ ہیں جو مرکبات کی خاصیت اور پیدا شدہ اشیاء میں فرق پر مبنی ہیں۔

فیرس سلفیٹ کے محلول کو ہلکا یا مرتکز نائٹرک ترشہ کلورین برومین پوٹیشم پرمینگنیٹ ہائڈروجن پر اکسائڈ سے تکسید۔ (Oxidise) کرنے پر بہر صورت مین تعامل اختتام پر فیرک سلفیٹ حاصل ہوتا ہے

برخلاف اس کے ان اشیا سے ایک نامیاتی مادہ مثلاً انگوری شکر پر عمل سے یہ صورت میں حاصل شدہ شے جداگانہ ہوتی ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ نامیاتی مادوں کا مطالعہ ان کی ترکیب کے علم تک بھی محدود نہیں ہے سلفیورک ترشہ کو ضابطہ H_2SO_4 سے ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ ضابطہ فقط اس ہی شئے کے لئے صحیح ہے لیکن ضابطہ C_2H_6O سے مراد دونوں ایتھل الکوحل اور ڈائی ایتھل ایتھر ہے ایسی اشیا جن کے خواص میں اختلاف ہو لیکن ضابطہ ایک ہی کیوں ہم ترکیب کہلاتے ہیں اور یہ نامیاتی مرکبات کی نمایاں خصوصیت ہے ضابطہ $C_8H_{12}O_4$ سے ٦٦ مرکبات کی تعبیر ہوتی ہے یہ ظاہر ہے کہ ہم ترکیب اشیا میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے ان کی ترکیب ہی کا جاننا کافی نہیں ہے ہم کو ان کے سالمات میں جواہر کی مختلف ترتیب سے آگاہ ہونا چاہئے جن پر کہ متعدد ہم ترکیب مرکبات کا انحصار ہے ہم کو ان کی ترکیب کا ہی تعین نہیں کرنا چاہئے بلکہ انکی بناوٹ کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ یہ الفاظ دیگر ہم کو ان کی ساخت نما اور سادہ ضابطوں سے واقف ہونا چاہئے جو نامیاتی کیمیا کا خاص مقصد ہے یہ دو طریقوں سے انجام دیا جاسکتا ہے ایک تو تحلیل یعنی سالمات کا متقابلتاً سادہ صورت میں تبدیل ہونے سے اور ترکیب یعنی سادہ صورت سے پیچیدہ صورت میں بدل جانے سے عام طور سے تحلیل ترکیب سے پہلے واقع ہوتی ہے اور جس وقت پہلے قاعدہ سے مرکب کی ساخت کا انکشاف ہوجاتا ہے تو اس کو ترکیب سے قاعدہ سے تیار کرتے ہیں وقت درکار ہوتا ہے اس طریقہ سے موجودہ زمانہ میں اکثر اشیا مجموعی طور پر تیار کی جاتی ہیں جو زمانہ قدیم میں قدرتی اشیا قرار دی گئی تھیں کڑوے بادام کا تیل الیزیرین۔ تیل انگوری شکر، کافور۔ اور متعدد اشیا کی تیاری میں صورت عمل میں آئی ممکن ہے کہ البیومین (ایک سفید شے جو حیوانی اور نباتاتی اجسام میں اکثر ملتی ہے) ترکیب کے قاعدے سے تیار کی جاسکے لیکن یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ پیچیدہ نامیاتی اشیا کی ترکیب اور سادہ جاندار خلیوں کی ترکیب کے مابین ایک الدخل خلیج کا وجود ہے اور شائد ہمیشہ رہے گا

(ترجمہ)

معین الدین حسن عثمانی (بی۔ ایس سی۔ آخری)

حیدرآباد میں صنعت شکرسازی

گنے کی شکر عام طور پر میٹھے پھلوں، بعض پھولوں اور بعض درختوں کی جڑوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے تجارتی ماخذ گنا اور چقندر ہیں۔ گنے میں تقریباً ١٩ یا ٢٠ فی صد شکر موجود ہوتی ہے۔ اور چقندر میں ۱۳ یا ۱۴ فی صد۔

چقندر میں شکر کا تناسب کم ہونے کی وجہ سے شروع میں اس کا استعمال صنعت میں کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہ ہوسکا۔ لیکن بعد میں اس کی کاشت ہونے لگی اور شکر کی تیاری میں اصلاحی تدابیر اختیار کی جانے لگی جس کی وجہ سے چقندر سے شکر کی مقدار دوگنی حاصل ہونے لگی۔ یورپ میں سالانہ تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار ٹن شکر تیار ہوتی ہے اور یہ تمام چقندر سے حاصل کی جاتی ہے۔

گنے کی شکر کے علاوہ دوسری اقسام کی شکریں، انگوری شکر (Glucose)، ثمری شکر (Fructose) وغیرہ بھی صنعتی طور پر تیار ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال نسبتاً کم ہوتا ہے۔

گذشتہ دس سال کے عرصہ میں ہندوستان نے صنعتِ شکرسازی میں بہت ترقی کر لی ہے ۱۹۲۹ء میں ہندوستان میں چوبیس ۲۴ چھوٹے کارخانے موجود تھے جو بمشکل سالانہ ستر ہزار ٹن شکر تیار کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں کارخانوں کی تعداد ١٥٠ ہو گئی اور یہ کارخانے مجموعی طور پر سالانہ بارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن شکر تیار کرتے ہیں۔ یہ مقدار سابقہ مقدار کی اٹھارہ گنی ہے۔

حیدرآباد جس کے صنعتی ذرائع دن بدن ترقی کر رہے ہیں صنعت شکرسازی میں بھی کسی طرح پیچھے نہیں۔ تین یا چار سال کا عرصہ ہوا کہ ایک بہت بڑا کارخانہ "نظام شوگر فیکٹری" نظام آباد سے سولہ میل کے فاصلہ پر تعلقہ بودہن کے قریب کھولا گیا۔ اس کا کل سرمایہ ٥١ لاکھ روپئے ہے۔ جس میں

سے ۳۵ لاکھ، حصص کے ذریعہ جمع کئے گئے ہیں اور بقیہ ۱۶ لاکھ حکومت سے ۴ فیصد شرح سود پر قرضہ لیا گیا ہے۔

نظام شگر فیکٹری کے لئے ضلع نظام آباد اس لئے منتخب کیا گیا کہ وہاں کی زمین گنّے کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہے۔ اور نظام ساگر کی نہروں سے پانی بہ اقساط مل سکتا ہے۔

اس وقت نظام شوگر فیکٹری، حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی کے زیر انتظام ہے اور اس کمپنی کے حسن انتظام کی وجہ سے حیدرآباد کی اس اہم صنعت کو دن بدن فروغ ہو رہا ہے۔ چونکہ حیدرآبادیوں کے لئے صنعت شکر سازی ایک نئی چیز تھی۔ اس لئے بعض ماہرین کو یورپ اور جاوا سے بلایا گیا ہے۔ شوگر فیکٹری کے قائم ہونے سے پہلے کچھ لوگوں نے ذاتی طور پر شکر تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ البتہ گڑھ عام طور پر تیار ہوتا ہے۔

بودھن کو اس صنعت کے قیام کے پہلے کوئی زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ لیکن اب وہ ایک صنعی مرکز تصور کیا جا رہا ہے۔ اس کی آبادی میں بھی معتد بہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور فیکٹری کے قریب ایک جدید وضع کا شہر آباد ہوگیا ہے۔ جس میں برقی روشنی اور پانی کی فراہمی کا معقول انتظام ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اس صنعت کا دار و مدار گنّے کی کثرت پیداوار پر ہے گنّے کی زیادتی سے اس میں اسی تناسب سے فائدہ ہوگا۔ آجکل سلطنت حیدرآباد میں تقریباً ۵۰ یا ۶۰ ہزار ایکڑ گنّا بویا جاتا ہے۔ جس کا دسواں حصہ نظام ساگر سے سیراب ہوتا ہے۔ لیکن یہ گنّے کی مقدار (گڑھ سازی کے علاوہ) کارخانے کی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہے کیونکہ سالانہ صرف کارخانے کی زمینات پر تخم کے لئے ۱۵،۰۰۰ ایکڑ گنّے کی ضرورت ہے۔ ۵و۵۰۰ ایکڑ زمین کارخانے کی ملکیت ہے۔ لیکن ہر سال صرف نصف حصہ پر ہی کاشت ہوتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ حیدرآباد میں ہندوستان کے اکثر مقامات سے زیادہ گنّا اُگایا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس کی زراعت پر توجہ کی جائے تو حیدرآباد اپنے ضروریات پورا کرکے گنّا بعض ایسے مقامات کو بھیج سکتا ہے۔ جہاں اسکی کم مقدار حاصل ہوتی ہے۔

شوگر فیکٹری قائم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لئے کسانوں کی سہولت کی خاطر کارخانے سے کچھ رقم بطور قرض ان کو دی جاتی ہے اور کسانوں کو اس امر کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ ماہرین کارخانہ سے گنّے کی کاشت کے بارے میں مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ اس امداد سے منتظمین شوگر فیکٹری کا منشا یہ ہے کہ کاشتکاروں کو کسی طرح کا نقصان نہ ہونے پائے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ کارخانے کے اطراف جو قابل کاشت زمین ہے اس پر کاشت کی جائے تو ۱۰ لاکھ روپئے کا نفع ہوسکتا ہے۔

نظام ساگر پراجکٹ جس پر حکومت نے ۴½ کروڑ روپیہ صرف کیا ہے۔ حکومت کے لئے زیادہ سودمند اس وقت ثابت ہوگا جبکہ شوگر فیکٹری کو ترقی ہو۔ شوگر فیکٹری کی وجہ سے حکومت کی آمدنی میں ۱۵ لاکھ سالانہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔

حیدرآباد میں جس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ سالانہ بیس ہزار ٹن شکر خرچ ہوتی ہے۔ لیکن کارخانہ سالانہ ۲۵و۰۰۰ ٹن شکر تیار کرتا ہے اور امید ہے کہ ۱۰ سال کے عرصہ میں ۴۰و۰۰۰ ٹن شکر بہ آسانی تیار کرسکے گا۔

نظام شوگر فیکٹری میں روزانہ ایک ہزار سے بارہ سو ٹن تک گنّا استعمال ہوتا ہے اور کارخانہ سال میں صرف چار مہینے کام کرکے ۸۰ لاکھ روپئے کی شکر تیار کرتا ہے شکر تیار کرنے سے پہلے گنّے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے بیلنوں (Rollers) کے ذریعہ دباکر اُن کا رس نکالا جاتا ہے اس رس میں ۱۹ یا ۲۰ فیصد شکر موجود ہوتی ہے۔ اس کو گرم کرکے اس میں دودھیا چونہ ملایا جاتا ہے جس سے نامیاتی ترشے جو بطور لوث کے موجود ہوتے ہیں کیلسیم نمکوں کی شکل میں جدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد سلفر ڈائی اکسائیڈ گیس (Sulphurdioxide) گذاری جاتی ہے۔ جس سے مزید لوث جدا ہوکر سرخی مائل رنگ دور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو (Dorr clarifier) میں منتقل کرتے ہیں جہاں مٹی کے ذرات وغیرہ تہ نشین ہو جاتے ہیں اور شفاف مایہ جدا ہو جاتا ہے۔

اس طرح سے حاصل شدہ خالص رس کو گرم کرکے شیرہ (Syrup) میں تبدیل کرتے ہیں

اور پمپ کے ذریعہ خلائی کڑھائیوں (Vaccume pans) میں منتقل ہوتے ہیں۔ ان کڑھائیوں میں یہ شیرہ پست دباؤ کے تحت جوش کھاتا ہے اور اس میں قلمیں نمودار ہونے لگتے ہیں۔ قلموں اور شیرہ کے آمیزے کو مرکز گریز آلہ تک پہنچاتے ہیں۔ جو قلموں کو راب سے جدا کردیتا ہے۔ ان قلموں کو خشک کر کے تھیلیوں میں بھر لیا جاتا ہے۔

شکر کی قلموں کو جدا کرنے کے بعد جو راب بچ رہتا ہے اس سے الکوہل تیار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں تقریباً (۵۰) پچاس فیصد شکر موجود رہتی ہے۔ اور اس شکر کو بہ آسانی جدا نہیں کیا جاسکتا نظام شوگر فیکٹری میں اب تک راب کو بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سے الکوہل تیار کرنے کے لئے "الکوہل فیکٹری" تیار ہوچکی ہے۔ پٹرول میں ۳۵ فیصد الکوہل ملا کر استعمال کیا جاسکتا ہے اس سے پٹرول کی قیمت میں کافی کمی ہوسکتی ہے۔

گنے کے چھلکے وغیرہ سے کاغذ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس وقت یہ کارخانے میں بھاپ تیار کرنے کے لئے استعمال ہورہے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صنعت شکر سازی کے ساتھ الکوہل اور کاغذ ضمنی طور پر حاصل ہوسکتے ہیں۔

سیّد انور حسین بی۔ ایس سی (آخری)

میرا مقبول شاعر

اگر یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر کمال کا لازمہ کمال یہ ہے کہ وہ ایک کامل النفس شخصیت کے ہاتھوں ایک ایسے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے کہ پھر اس میں کسی حیثیت سے ترقی کی کوئی گنجائش نکل ہی نہ سکے تو پھر یہ صاف طور پر کہا جاسکتا ہے کہ فنِ غزل گوئی کے گنۂ کمال پر پہنچانے کے باب میں میؔر کا کوئی مدمقابل نہیں میؔر نے غزل کو معراجی حیثیت دے کر اس کو اس رتبہ پر پہونچا دیا ہے کہ پھر آجتک غزل کو وہ رتبہ حاصل نہ ہوسکا۔ میؔر کا کلام فلسفہ عشق اور اجزائے حیاتیات انسانی سے لبریز ہے کہیں کہیں تصوف کی چاشنی بھی شامل ہے لیکن شعریت کے جزو سے سوا نہیں اور کیا مجال ہے کہ اُس سے حسیات شعر کو کوئی ٹھیس پہنچ سکے۔ چنانچہ کس سادگی روانی اور تعمق کے ساتھ بلاغت آمیز لہجہ میں کہتا ہے ؎

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میؔر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

انسان کا قاعدہ ہے کہ جب کسی کام میں اس کو انتہا سے زیادہ دشواری پیش آنے لگتی ہے تو وہ اپنے آپ کو پہلے تو اس کام کا اہل نہیں سمجھتا لیکن جب یہ نا اہلیت اس کی نظروں میں اور زیادہ راسخ ہوجاتی ہے تو اُس کو ایک قسم کا اطمینانی وثوق اسبات کا حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ مجبور محض ہے۔ بے بس ہے وہ کسی کام کا بھی اہل نہیں حتیٰ کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق ہاتھ پاؤں بھی ہلانے سے معذور ہے۔ چنانچہ اہل تسنّن میں ایک فرقہ جبریہ عقائد کا پابند ہے۔ میؔر نے اس کو یوں ادا کیا ہے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

محبت کو قنوطیت سے غایت درجہ تعلق ہے محبت کی بلند ارتقائی کیفیات اسی وقت ظاہر ہوتی ہیں

جب انسان کو قطعی اس بات کا یقین ہو جائے کہ میری محبت بے لوث ہے ۔ وصل کے لاطائل ارمان اور کسی بیہودہ آرزو سے قطعی مبرا ہے۔ معشوق ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو انسانی دست بُرد سے بہت بالاتر ہے ۔ ہجر دوام اور فراق مسلسل کی اُمید اُسی وقت دل میں پختہ ہو جاتی ہے ۔ ہجر دوام میں جو ابدی لطف ہے وہ وصل میں کہاں ۔ جب تک عاشق مہجور ہے اُسی وقت تک یہ ساری داستان رنج و محن درد و کرب حسرت و یاس آہ و بکاہ نالہ و فغان وغیرہ وغیرہ سے دفتر کے دفتر رنگین کئے جا سکتے ہیں اور پڑھنے والا اُن کو پڑھ پڑھ کے سر دُھنتا ہے اُن سے مکیّف ہوتا ہے اور ہر قسم کے تاثرات اس کے مطمئن یا مضطرب یا مغموم دل میں جگہ کر لیتے ہیں اور جہاں وصال ہو جائے وہاں یہ چیزیں یکلخت ختم ہو جائیں ۔ مُحب کو یہ یقین ہو جائے گا کہ محبوب کا ملنا مشکل نہیں اور جب یہ خیالات ظاہر ہوں گے تو پھر رنج کرنا گریہ و بکا سے کام لینا سرد آہیں بھرنا اپنی تکالیف کا غیروں کو بیان کرنا حتی کہ ہر شئے کو غم کی بولتی ہوئی تصویر سمجھنا سب چیزیں یکلخت بیکار اور طائل ہو جائیں گی وصل اور عشق میں ازلی دشمنی ہے ۔ غرض جدائی محبوب میں جو لطف ایک عاشق صادق کو حاصل ہو سکتا ہے وہ کسی اور شئے میں نہیں مل سکتا چنانچہ جب محبوب کی دوری کو مدتیں گذر جائیں تو انسان کے دل میں خواہ مخواہ یاس انگیز اور حسرت ناک آرزوئیں گھر کر لیتی ہیں اسی یاس انگیزی کی آخری ڈگری کا نام ہے قنوطیت چنانچہ میر کی شاعری کا تمام تر سرمایہ یہی ہے ان چند اشعار سے بخوبی اس امر کا پتہ چل سکتا ہے ۔

کاش دل دو چار ہوتے عشق میں — ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمایش سراب کی سی ہے

ہمارے آگے تراجب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

میں تو مٹی بہی گیا لے کے دریا کی میر — پر اطبا نے میرے درد کا چارا نہ کیا

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی

نسبت اس آستان سے کچھ نہ ہوئی — برسوں اُس در پہ جبہ سائی کی

مرگیا پر ملا نہ یار افسوس — ہائے افسوس صد ہزار افسوس

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے

یوں گذرتی ہے عمر پانی میں — جوں کوئی کشتی دخانی میں

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے — کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

ہزاروں شعر ایسے بھی میر کے دیوان میں موجود ہیں جن کو صنایع و بدایع اور محاکات وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن اُن میں ایک قسم کی کشش اور جاذبیت ایسی پنہاں ہوتی ہے جو دل پر مقناطیسی اثر ڈالتی ہے ۔ مثلاً یہ شعر کہ

میرے تغیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

میر کے کلام میں حالت جنوں کی خوب خوب تعبیریں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر آدمی گھنٹوں سر دھنتا ہے ۔ میر کا ہر شعر گویا ایک چلتا ہوا نشتر ہے جو تیزی کے ساتھ رگِ جان میں اتر جاتا ہے ۔ اضطرار حال و انتشار احوال کے جیسے جیسے شعر آپ کو میر کے یہاں ملیں گے ۔ شاید ہی کسی شاعر کے پاس ملیں میر کے یہاں ہر شراب سہ آتشہ ہے جس کا خمار دماغ سے اترنے ہی نہیں پاتا ۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

طبیعت نے عجب یہ کل ادا کی — کہ ساری رات وحشت سی رہا کی

سب پریشان دلی میں شب گذری — بال اُس کے بکھر گئے شائد

اب کہیں جنگلوں میں ملتے نہیں — حضرتِ خضر مر گئے شائد

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے بادبہار — چاک دامن ہو گیا شاید کسو دلگیر کا

الغرض میر کا کلام ایک سمندر ہے جس کا مد و جزر صبح سے شام تک کبھی ختم ہی نہیں ہوتا ۔ میر خود بھی اس بات کو سمجھتا ہے ۔ چنانچہ فخریہ انداز میں کس خوبی سے اس کا ذکر کیا ہے اور درحقیقت

اس کو تعلی نہ کہنا چاہئے بلکہ فی الواقعی یہ فخر فخر ہی کے قابل ہے ۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز ــــــ تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اگرچہ گوشہ نشین ہوں میں شاعروں میں میرؔ ــــــ یہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

یہ تفاخر میرؔ ہی کو زیبا ہے ۔ آج تک کسی دوسرے کی زبان سے سازگار نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص بالفرض ایسا بیجا غرور کرے بھی تو اس کے لئے فطری ذکاوت اور ذہنی جودت کہاں سے لائے۔ میرؔ جیسے سر آوردہ اور ممتاز شاعر ہونا ہر ذات پر تھوڑا ہی پھبتا ہے ۔ میرؔ میر ہی ہے کیا خوب کہا ہے ۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا ــــــ مستند ہے میرا فرمایا ہوا

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر ــــــ یہ ہماری زبان ہے پیارے

میرؔ کے کلام کی ایک وجہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ فصیح اور بلیغ ہونے کے علاوہ سہل الممتنع بھی ہے ۔ سہل الممتنع اس کلام کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں جب دیکھا جائے تو پڑھنے والے کا ذہن فوراً اس بات کی طرف منتقل ہو جائے کہ ایسا کلام کہنا کوئی دشوار نہیں لیکن جب خود کہنے بیٹھے تو ممکن ہی نہ ہو سکے گویا میرؔ کا کلام اس قدر آسان اور سہل ہے کہ اس سے زیادہ سہل اور آسان کہنا ممکن ہی نہیں یہ بات بھلا اور شاعروں میں کہاں ۔ اس پر انداز بیان اس قدر سادہ اور سلیس کہ بے اختیار زبان سے آہ نکل جاتی ہے ۔ میرؔ نے خود بھی اس بات کو سمجھا ہے

کس نے سن شعر میرؔ یہ نہ کہا ــــــ کہئے پھر ہائے کیا کہا صاحب

یہ حقیقت ہے کہ غزل میں جس قدر درد و الم اندوہ و مصیبت کی داستانیں بیان کی جائیں گی جس قدر اپنی بدقسمتی کا رونا رویا جائے گا جس قدر افلاک کو اپنی جور و جفا ظلم و ستم کا بانی اور مسبب بتایا جائے گا اسی قدر غزل میں درد و سوز اور گھلاوٹ پیدا ہو گی ۔ کیونکہ غزل اپنی ہی دردناک داستان کا ایک پیرایہ ہوتی ہے شاعر کی غرض اس سے یہ نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں کے ذہن کو کن تدبیروں سے متاثر کر سکے گا وہ آپ بیتی کہتا ہے لیکن اپنے لئے ۔ مقرر لکچرار یا خطیب کی غرض مجلس کے ضمیر کو متاثر کرنے کی تدبیر

ہمیشہ سوچتی رہتی ہے لیکن ایک بلند پایہ سخن گو کو پبلک سے کوئی واسطہ نہیں ہاں اگر پبلک معاً ان باتوں کو سن لے تو ضرور مغموم یا مسرور ہو جائے ۔ اسی لئے شاعری کا درجہ علی العموم افسانہ ۔ خطبہ ۔ لکچر ۔ فنون لطیفہ یا اور اسی قسم کے جتنے فنون طبیعت کو اپنی طرف راغب کرنے والے ہیں ان سب سے بلند اور برتر ہے ۔ میرؔ کا انداز بیان اپنے مخصوص وجوہات کی بنا پر انہی اطوار کا مرقع ہے میرؔ کی غرض شاعری سے کبھی یہ نہیں رہی کہ وہ درویش منش شاعروں کی طرح درباروں میں رسائی حاصل کرے یا دریوزہ گری کرے اور غیروں کی بیجا مدح و توصیف سے اپنی زبان آلودہ کرے ۔ میرؔ اقلیم سخن کا تاجدار ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیوی حکومتیں اور غرضی محبتیں بہت جلد فنا ہو جانے والی ہیں لیکن ملک سخن کبھی فنا نہ ہوگا ۔ اس کی یادگار جاوید ہے ۔ دیکھو کتنے غرض کے بندے ایسے ہیں یا کتنے ممدوح ایسے باقی ہیں جن کی مدحت کرنے والے صفحہ ہستی پر اپنی نیک نامی کا سکہ جما گئے ہیں ۔ فردوسی نے محمود غزنوی کے عہد میں شاہنامہ لکھا اس کی تعریف کے پل باندھ دئے لیکن اُس سے بجز حسرت و یاس کے کیا حاصل ہوا ۔ ذوق نے ظفر کی ستایش میں ہمیشہ دست و قلم آلودہ کئے لیکن کیا پایا ۔ پھر یہی نہیں کہ ایسی لاحاصل مدحتوں سے کسی قطعی فائدے کی امید نہ ہو بلکہ ایسے شعرا اکثر بدنام اور رسوا بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمیشہ لالچی بنے رہتے ہیں ۔ میرؔ نے انہی چیزوں کو سمجھتے ہوئے کہا ہے ۔

اک وقت خاص میں مرے حق میں دعا کرو ــــــ تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو

مرتے دم تک کسو کنے نہ گیا ــــــ میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

چونکہ مضمون کسی قدر طویل ہو گیا ہے لہذا اسی پر ہم اکتفا کرتے ہیں ورنہ خصوصیات کلام میرؔ کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں ۔ یہ ایسا سمندر نہیں جو ایک کوزے میں سما سکے ۔ دنیا کے ہر صاحبِ کمال کے جہاں چند دوست ہوتے ہیں کچھ مخالف اور دشمن بھی ساتھ ہی لگے رہتے ہیں ۔ لیکن میرؔ کی ذات اور اُس کے کمال کا کوئی مخالف ہے نہ دشمن بلکہ ہر شخص مدح خواں ہے ۔ ہر شاعر نے یہی کوشش کی ہے کہ وہ میرؔ کے کلام کی تتبع کرے اور اسی کو اپنا فخر سمجھے یہ خصوصیت

جو تمام خصوصیات میں سب سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ میرؔ کے سوا کسی کو نصیب نہیں اس سے زیادہ دلیل کسی کے کمال کے تسلیم کر لینے کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مخالفین بھی موافقین کے زمرے میں شامل ہو جائیں اور بے اختیار سبحان اللہ کہہ اٹھیں چنانچہ غالب جیسا شخص بھی میرؔ کے بارے میں کہتا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ناسخؔ کہتے ہیں

میں ہی اے ناسخ نہیں کچھ طالب دیوان میرؔ
کون ہے جس کو کلام میرؔ کی حاجت نہیں

احمد علی (عثمانیہ) متعلم سال دوم

"نور و ظلمت"

آسمان پر سیاہ بادل گھرے تھے۔ ان میں سے کبھی کبھی چاند اس طرح چمکتا تھا جس طرح کسی "مہجور" کی دنیائے یاس میں شعاع امید مسکراتی ہے۔ میں نے اپنی برساتی اوڑھ لی اور چہل قدمی کے لئے، نکل گئی۔ سامنے کی کوٹھی میں چہل پہل نظر آرہی تھی قریب جانے پر معلوم ہوا کہ اس میں کرایہ دار آگئے ہیں۔ برآمدہ میں ایک پندرہ سولہ سالہ دوشیزہ کھڑی تھی جس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی شاید کسی مشہور ہستی کی سوانح عمری ہو۔ وہ کتاب پڑھتے پڑھتے یکایک بحر خیال میں غوطہ زن ہو جاتی اور کچھ دیر لبوں کی جنبش کے بعد از سر نو پڑھنے لگتی۔ میں نے اس کی یہ کیفیت دیکھی اور آگے بڑھ گئی اتنا ضرور محسوس ہوا کہ اس لڑکی پر اس کتاب کا خاص اثر ہو رہا ہے۔ میں سوچنے لگی کتابیں کس قدر بے پناہ قوت کی حامل ہیں۔ یہ کردار کی تعمیر بھی کرتی ہیں اور تخریب بھی، اور اخلاق کے حق میں مسیحا بھی مار ضحاک بھی۔ مطالعہ تو گویا خیالات کے ڈھالنے کا ایک سانچہ ہے۔

میں گھر واپس ہوئی تو میرے بھیا کیپٹن فخری بھی آتش دان کے قریب محو مطالعہ تھے ان کے ہاتھ میں سوانح مشاہیر ہند تھی The great men of India وہ مجھ سے کہنے لگے "ہمارے سماج کی کتنی بڑی بڑی شخصیتیں اولاً معمولی حیثیت کی مالک تھیں اور کس طرح انہوں نے بتدریج اعلیٰ مدارج طے کئے اب بھی نہ جانے ہم میں کتنی ایسی ہستیاں ہونگی جن میں ترقی پانے والے رجحانات ہوں گے جن کو صیقل ہو تو درخشاں ہو کر سماج کی ظلمت کو نور میں تبدیل کریں گے۔ میں اب تک تقدیر کا قائل تھا لیکن تقدیر کچھ نہیں جو کچھ ہے در اصل "عمل ہے" جس کا دوسرا نام تدبیر ہے۔

"لیکن حالات کے مساعد ہونے ہی کا نام تقدیر ہے کتنی ایسی ہستیاں بھی ہوں گی جو نامساعد حالات

میں پنپ نہ سکی ہوں گی اور ان کی "تمنا، حسرت گورِ غریباں" میں تبدیل ہو گئی ہو گی — کتنے ایسے درِ بے بہا ہوں گے جو سمندر کی تہہ ہی میں پڑے ہوں گے اور کتنے ایسے پتھر ہوں گے جن کو سورج کی روشنی نے چمکایا نہ ہوگا۔ عمل کی اہمیت میں کلام نہیں مگر سوسائٹی اس کی اجازت بھی تو دے۔

بھائی جان! ہمارا سماج روایت پسند ہے۔ اور ہم رسم و رواج کی زنجیروں میں متقید ہیں"

"غلط! اس دنیا میں پیدا ہونے والا انسان ہمیشہ آزاد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ماحول کا اثر قبول کرتا ہے۔ ماحول کے گرداب میں بہ جانا کمزور سیرتوں کی عادت ہے محکم سیرت اپنا ماحول الگ بنا لیتے ہیں۔ بلحاظ نوعیت فطرتِ انسانی کی تین اقسام ہیں۔

(۱) ایسا ہونا چاہیئے (۲) کاش کہ ایسا ہوتا (۳) جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ ہم ہندوستانی دوسری قسم کے انسانوں میں ہیں لیکن ہمیں چاہیئے کہ گروہ اول بننے کی کوشش کریں"! مگر مشیت ایزدی کے بغیر یہ ناممکن ہے بھیا" — "یہ تم نے تقدیر تدبیر کا مسئلہ چھیڑ دیا مگر کبھی تم سے اس پر بحث کرونگا آؤ ہم گرم گرم چائے پی لیں"۔ ہم نے چائے پی اور اپنی اپنی خوابگاہ میں چلے گئے میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی آج کی گفتگو پر غور کرنے لگی۔ میرے سامنے آج کی دوشیزہ کی تصویر پھر گئی — دراصل بھیا سچ کہتے تھے بھی لڑکی کو دیکھئے اس کے دل میں ایک مشہور شخصیت بننے کی تمنا ہے۔ مگر ہو گا کیا۔ اگر یہ کچھ زبان نہ ہلائے تو عام لڑکیوں کی طرح اس کے والدین جلد ہی اس کی "جیون گتھی" سلجھا دیں گے — جیون گتھی سلجھانا ہندوستانی والدین کے نزدیک گڑیا گڈے کا کھیل ہے۔ "دولت ہے" خاندان اچھا ہے" آجکل کی فضا میں لڑکیوں کے لئے تعلیم کا سوال بھی اٹھنے لگا ہے۔ لڑکی کے والدین خوشحال تو ہیں آسانی سے اسے بھی ایک "آب و آتش خاک و باد کا گڈا" مل سکتا ہے — جس کے ساتھ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن کے مقولے پر عمل کر کے وہ اپنا جیون بتا دے گی۔ اور فرض کے طور پر اس فاقہ کش غلام ملک کی آبادی میں دو چار کا اضافہ کر دے گی۔ اس کے بعد اسکی زندگی ختم، گویا اس کا دنیا میں آنے کا مقصد یہی تھا — اسے کیا پرواہ ہو سکتی ہے اگر ہزاروں اس کے ہم جنس بھوک کی لعنت میں گرفتار ہیں — اسے کیا خبر کہ اس کی لاکھوں دکھیاری بہنیں رشتہ حیات کے

قطع ہونے کی منتظر سسک رہی ہیں — ان گنت "حاملان نفس" ایسے بھی ہیں جن کے قہقہوں میں فغاں کی آواز جھلکیاں لیتی ہے۔ اس نے تو اپنی زندگی سماج کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق ختم کر لی۔ پیدا ہوئی۔ شادی کی۔ شوہر کی خدمت کی۔ چند بچے پیدا کئے — اب اور کیا چاہیئے؟

ان ہی خیالات نے مجھے سلا دیا۔ دوسرے دن مس کملا سروپ ہماری نئی ہمسائی سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے مطالعہ کتب کا بہت شوق ہے۔ اور اس کی تمنا ہے کہ وہ خود ایک معروف ادیبہ بنے۔ اسے قومی خدمت کا بھی بہت شوق تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ ایک مشہور معروف ہستی بنے جائز شہرت انسانی زندگی کی سب سے دلفریب تمنا ہے۔ رسکن کہتا ہے

"Fame is the last infirmity of the noble mind"

اس کے میرے خیالات کی یکسانیت نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا اس کا پتا ایک متوسط الحال شخص تھا نہ حد سے زیادہ تاریک خیال نہ ضرورت سے زیادہ روشن خیال۔ اسکی والدہ ایک خواندہ سمجھ دار خاتون تھیں — انہیں اپنی لڑکی پر اعتماد تھا۔ جب انہوں نے اس کا علمی شغف اور اس میں ابھرنے والی صلاحتیں دیکھیں تو اس کے حال پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ کملا کے خیالات سے والدین باخبر تھے اور وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی لڑکی کی تمنا پوری ہو۔ وہ چاہتے تھے کم از کم اس کے سنِ شعور کو پہونچنے اور قوی کی پوری نشو و نما پانے تک اسے دنیاوی جھگڑوں میں نہ پھنسایا جائے — وہ میٹرک میں پڑھ رہی تھی جس وقت میری اس سے دوستی ہوئی اکثر وہ میرے پاس آیا کرتی اور میں اس کے پاس جایا کرتی۔ وہ مجھے اپنے مضامین دکھاتی ہم دونوں مل کر ہوائی قلعے بنایا کرتے۔ ایک دن کملا نے ایک افسانہ لکھا بڑا دلکش میں نے بھیا کو بتایا کہ دیکھئے اس لڑکی کی تحریریں کتنی پختگی اور دلکشی ہے۔ بھیا نے پڑھ کر کہا کہ اس لڑکی میں ترقی پانے والی قوتیں ہیں اگر ان کی صحیح راہنمائی کی جائے تو وہ ایک کامیاب مضمون نگار ثابت ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس میں کچھ اصلاح بھی کر دی۔ اس اصلاح نے اس افسانہ کے حق میں وہی اثر کیا جو پارس کا پتھر لوہے کے ٹکڑے کے حق میں کرتا ہے۔ کملا پڑھ کر بہت خوش ہو گئی۔ افسانہ شائع ہوا ملک کے طول و عرض میں دھوم مچ گئی۔ اب کملا کی

خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کی دیرینہ آرزوئیں برآرہی تھیں اسے بھیا کے اس کام کی وجہ سے ان سے ایک عقیدت سی ہوگئی۔ بھیا نے جب دیکھا کہ ان کی ذراسی توجہ سے ایک ناتراشیدہ پتھر ہیرا ثابت ہوسکتا ہے تو انہوں نے خاص دلچسپی لینی شروع کردی۔ دن گذرتے گئے اور کملا اور بھیا فخری کا معصوم قلمی واسطہ روحانی رابطہ بنتا گیا۔ کملا سے میری دوستی بدستور تھی۔ کملا بحیثیت ایک مضمون نگار ادبی علمی حلقوں میں کافی حد تک ممتاز ہوچکی تھی اس کے والدین مطمئن تھے کہ ان کی لڑکی کی تمنا پوری ہورہی ہے اب اس کے گریجویٹ بننے میں قلیل عرصہ رہ گیا تھا۔ پھر وہ اس کی شادی کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ کملا ترقی اور شہرت کے میدان میں داخل ہوگئی تھی قریب تھا کہ وہ منزل مقصود پر پہونچ جائے کہ ایک انقلاب ہوگیا۔ لوگوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں ایک ہندو لڑکی اتنی اچھی اردو نہیں لکھ سکتی۔ بڑے بڑے پنڈت جوارد و تحریر کے شوق میں بوڑھے ہوچلے تھے۔ عینکیں لگا لگا کر اس کے مضامین پڑھتے پھر یہ کہتے ہوئے ایک طرف ڈال دیتے کہ" اونہہ ضرور کسی مسلم تعلیم یافتہ کا نتیجہ فکر ہے" ان بیوقوفوں کو کیا خبر کہ" اردو مسلمانوں کی واحد ملک نہیں ہندو مسلم دونوں کی میراث ہے" کملا اب گریجوایٹ بن چکی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ قومی خدمت شروع کردے تاکہ اس کا نام ملکی لیڈروں کی فہرست میں شامل ہوجائے۔

اس تک بھی یہ تمام خیالات جو عام طور پر پبلک میں اس کے متعلق پھیلے ہوئے تھے پہونچے لیکن اس نے اس کان سنا اور دوسرے کان اڑادیا اسے بھیا کی ہدایت اور قیمتی مشوروں کے مقابلے میں یہ ہیچ نظر آتے۔ جب حاسدوں نے دیکھا کہ کوئی حربہ اس کو راہ ترقی سے نہیں ہٹا سکتا تو انہوں نے ایک دوسرا حربہ استعمال کرنا شروع کیا یعنی انگشت نمائی۔ انگشت نمائی ہمارے سماج کا بڑا موثر حربہ ہے اس کے سامنے بڑی بڑی الوالعزم اور اٹل ارادہ رکھنے والی شخصیتیں بے دست وپا ہوجاتی ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ محض باطل اور بے بنیاد ہو کوئی شخص اپنے کردار و اخلاق پر حرف گیری نہیں برداشت کرسکتا۔ کملا بھی اس کے سامنے بے دست وپا بن کر رہ گئی۔ اس کا " سکون" اضطراب میں بدلتا گیا۔ زندگی میں "پژمردگی" نے مسرت کی جگہ لے لی۔ اب اس کی علمی ادبی سرگرمیاں سرد

پڑتی نظر آتی تھیں۔ گویا وہ ترقی کے میدان میں تیز دوڑتے دوڑتے یکدم رک سی گئی تھی۔ والدین نے بھی اس کی تبدیلی دیکھی اور سماج کے احکام کے آگے سر جھکا نا قبول کیا۔ تاکہ سماج کے طعن و تشنوں سے جو کملا کے دل کو چھلنی کررہے تھے۔ محفوظ کردیں انہوں نے اس کے بیاہ کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ لوگوں کی زبان پر کملا کے ساتھ بھیا فخری کا نام بھی تھا۔ ہمارے مجبور کرنے پر بھیا نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کلکتہ چلے گئے۔ اب کملا کی حالت اور ردی ہوتی گئی۔ وہ مجھ سے کہتی " مجھے زندگی ایک لق ودق ریگستان نظر آرہی ہے۔ جس میں میری روح کو تنہا بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے" میں نے اسے شادی کی ترغیب دلائی کہ جیون گاڑی ایک پہیے سے نہیں چل سکتی ـــ وہ زہر خند مسکراہٹ سے جواب دیتی " شادی نام ہے دو روحوں کے سنجوگ کا' باجوں اور روپیوں کی جھنکاریں دو مادی اجسام کی یکجائی کا نام شادی نہیں"۔ اس کے والدین یہ حالت دیکھ کر خاموش بیٹھ رہے۔ کملا نے پھر قومی خدمت شروع کردی وہ کہتی یہی ایک چیز ہے جس میں مجھے روحانی سکون ملتا ہے۔ جس طرح چراغ بجھنے سے پہلے زیادہ زور و شور سے بھڑک اٹھتا ہے اسی طرح سماج کے طعن و تشنیع بھی جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے والے تھے زور و شور سے شروع ہوگئے۔ لوگوں نے کملا کے اخلاق پر حرف زنی شروع کردی تھی۔ ہندو سماج ایک جوان کنیا کو" کنواری " نہیں دیکھ سکتا۔ ایک معصوم ناکردہ گناہ کے لئے اس سے بڑھ کر عذاب اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ کڑھتی جلتی اس نے قومی خدمت کا مقدس کام بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ مضامین دیمک کھانے کے لئے رکھ دئے اور خانہ نشین ہوگئی مجھے اس کی حالت دیکھ کر عبرت ہوتی تھی۔ آہ زندہ دل خوشی کا مجسمہ ایک چلتی پھرتی مشین تھی بے روح۔ ترقی کی خواہشیں سیماب کی تابش اور سراب کی نمود بن کر رہ گئی ـــ آخر ایک منحوس گھڑی مجھے اطلاع ملی کہ معصوم کملا اپنی تمنا کو سینہ میں دفن کئے اس دنیا سے چل بسی۔ اس نے ایک تحریر بھی چھوڑی تھی جس میں وضاحت کی تھی کہ اس کی اس قبل از وقت موت کا سبب سماج کے طعن و تشنیع اور انگشت نمائی ہے۔ اس نے اپنے خون سے سماج کی نئی تعمیر کرنی چاہی لیکن خود اس کی عفریت پر بھینٹ چڑھ گئی۔ اس نے اصلاح سماج کا عظیم الشان مشن ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے ظلمت کو نور میں تبدیل کرنا چاہا مگر لاحاصل۔ میں نے

بھیا کو اطلاع دی جوان دنوں بھابی کے ساتھ کشمیر گئے تھے ۔ اور روح کے زخم کا اندمال دولت سے کر رہے تھے ۔ آہ چاندی کے چند حقیر سکے انسان کے زاویہ نگاہ پر کتنے اثر انداز ہو جاتے ہیں ۔ مجھے لکھا تھا ۔

" طلوع ہونے والے آفتاب کی کرنیں اگر کمزور ہیں تو وہ گہر کی چادر میں شگاف پیدا نہیں کر سکتیں ۔ اور اس لئے ہماری ظلمت کے پنجرے کی گہری تاریکی میں کوئی معمولی نورانی عکس اپنا راستہ نہیں پاتا "

میری کملا کے مضامین شائع کرنے اور اس کی یادگار قائم کرنے کی استدعا کے جواب میں لکھا ۔

؎ سر میں سودا نہ رہا دل میں تمنا نہ رہی　　یعنی وہ میں نہ رہا وہ میری دنیا نہ رہی

میں نے کملا کے مضامین کا مجموعہ "طور" کے نام سے شائع کیا اور اس کی آمدنی سے ایک انجمن بنائی جو کلیتہً نسوانی حقوق و اغراض کے تحفظ کی ذمہ دار ہے ۔

میں کبھی کبھی بھیا کی اور میری اُس دن والی گفتگو پر غور کرتی ہوں جو کملا کی ملاقات سے ایک دن پہلے ہوئی تھی ۔ کملا بھیا کے نقطہ خیال کی رو سے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی میں کامیاب ہو گئی تھی یعنی شہرت حاصل کر لی تھی لیکن میرے نقطہ نظر سے وہ نامساعد حالات کے گرداب میں بہ گئی ۔

رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ) متعلم سال دوم

ٹیگور کی شاعری اور اُس کے محرکات

بنگال کے ٹیگور خاندان کا یہ چشم و چراغ رابندرناتھ ایک ایسے اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوا جو اگر ایک طرف دنیائے علم پر چھایا ہوا تھا تو دوسری طرف سیاست اور معاشرت میں بھی ممتاز تھا ۔ شہر سے دور اپنے آبا و اجداد کے ایک دیہاتی گھرانے میں اس کا بچپن گذرا ۔ (تا وقتیکہ نوجوانی نے اس کے زمانۂ طفلی کو خواب و خیال کی طرح مٹا نہ دیا) وہ اُس معصوم دیہاتی فضا میں ہی آرام چین سے نشو و نما پاتا رہا ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے" شاید یہی وجہ تھی کہ بچپن ہی میں اُسے نصابی تعلیم سے سخت نفرت رہی ۔ زمانۂ طفلی تو اپنے باپ کے ساتھ سیر و سیاحت اور دیہاتی معصوم بچوں کے ساتھ کھیل میں گذر گیا لیکن شباب کی آمد نے اس نوجوان پر جو شاعر بن کر دنیا میں آیا تھا ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا ـــ شہر کی کثیف گندی فضا سے گھبرا جانا ۔ خودغرض لوگوں سے دور رہنا اور دردمندوں کا غم کھانا ـــ یہ وہ چیزیں تھیں جو اُس کی نوجوان فطرت نے اپنے لئے پسند کر لی تھا ۔

آغاز جوانی کے ساتھ اُس کا تعلیمی انہماک سونے پر سہاگہ تھا ۔ فطرت کی گوناگوں دلچسپیوں میں کھیل کود کر وہ خود بھی ایک فطرت پسند نوجوان بن گیا تھا ـــ وہ دل جو دوسرے کے دُکھ پر رو پڑے ـــ وہ زندگی جو دوسرے کے لئے قربان ہو جانا چاہے ـــ وہ جذبہ جو اسے سیماب کی طرح تڑپا دے ـــ وہ اچھوتے خیالات جو گھنٹوں اُس کے دنیائے تصور پر چھائے رہیں ـــ اور حُسن پرستی کا وہ جذبہ جو محبت بن کر اُس کی آنکھوں سے چھلکتا رہے ـــ اُس کی شاعرانہ فطرت اور طبیعت کے آئینہ دار ہیں ۔

گلشن زندگی کی اُس نو آغاز کلی نے سب سے پہلے جس کتاب کی ابتدا کی وہ رامائنا تھی ۔

بھیا کو اطلاع دی جو ان دنوں بھابی کے ساتھ کشمیر گئے تھے۔ اور روح کے زخم کا اندمال دولت سے کر رہے تھے۔ آہ چاندی کے چند حقیر سکے انسان کے زاویہ نگاہ پر کتنے اثرانداز ہو جاتے ہیں۔ مجھے لکھا تھا۔

"طلوع ہونے والے آفتاب کی کرنیں اگر کمزور ہیں تو وہ گہر کی چادر میں شگاف پیدا نہیں کر سکتیں۔ اور اس لئے ہماری ظلمت کے پنجرے کی گہری تاریکی میں کوئی معمولی نورانی عکس اپنا راستہ نہیں پاتا"

میری کملا کے مضامین شائع کرنے اور اس کی یادگار قائم کرنے کی استدعا کے جواب میں لکھا۔

سر میں سودا نہ رہا دل میں تمنا نہ رہی
یعنی وہ میں نہ رہا وہ میری دنیا نہ رہی

میں نے کملا کے مضامین کا مجموعہ "طور" کے نام سے شائع کیا اور اس کی آمدنی سے ایک انجمن بنائی جو کلیتہً نسوانی حقوق و اغراض کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔

میں کبھی کبھی بھیا کی اور میری اُس دن والی گفتگو پر غور کرتی ہوں جو کملا کی ملاقات سے ایک دن پہلے ہوئی تھی۔ کملا بھیا کے نقطہ خیال کی رو سے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی میں کامیاب ہو گئی تھی یعنی شہرت حاصل کر لی تھی لیکن میرے نقطہ نظر سے وہ نامساعد حالات کے گرداب میں بہہ گئی۔

رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ) متعلم سال دوم

ٹیگور کی شاعری اور اس کے محرکات

بنگال کے ٹیگور خاندان کا یہ چشم و چراغ رابندرناتھ ایک ایسے اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوا جو اگر ایک طرف دنیائے علم پر چھایا ہوا تھا تو دوسری طرف سیاست اور معاشرت میں بھی ممتاز تھا۔ شہر سے دور اپنے آبا و اجداد کے ایک دیہاتی گھرانے میں اس کا بچپن گذرا۔ (تاوقتیکہ نوجوانی نے اس کے زمانۂ طفلی کو خواب و خیال کی طرح مٹا نہ دیا) وہ اُس معصوم دیہاتی فضا میں ہی آرام و چین سے نشو و نما پاتا رہا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ "شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے" شاید یہی وجہ تھی کہ بچپن ہی میں اُسے نصابی تعلیم سے سخت نفرت رہی۔ زمانۂ طفلی تو اپنے باپ کے ساتھ سیر و سیاحت اور دیہاتی معصوم بچوں کے ساتھ کھیل میں گذر گیا لیکن شباب کی آمد نے اس نوجوان پر جو شاعر بن کر دنیا میں آیا تھا ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا — شہر کی کثیف گندی فضا سے گھبرا جانا۔ خود غرض لوگوں سے دور رہنا اور دردمندوں کا غم کھانا — یہ وہ چیزیں تھیں جو اُس کی نوجوان فطرت نے اپنے لئے پسند کر لی تھا۔

آغاز جوانی کے ساتھ اُس کا تعلیمی انہماک سونے پر سہاگہ تھا۔ فطرت کی گوناگوں دلچسپیوں میں کھیل کود کر وہ خود بھی ایک فطرت پسند نوجوان بن گیا تھا — وہ دل جو دوسرے کے دُکھ پر رو پڑے — وہ زندگی جو دوسرے کے لئے قربان ہو جانا چاہے — وہ جذبہ جو اسے سیماب کی طرح تڑپا دے — وہ اچھوتے خیالات جو گھنٹوں اُس کے دنیائے تصور پر چھائے رہیں — اور حُسن پرستی کا وہ جذبہ جو محبت بن کر اُس کی آنکھوں سے چھلکتا رہے — اُس کی شاعرانہ فطرت اور طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔

گلشن زندگی کی اُس نو آغاز کلی نے سب سے پہلے جس کتاب کی ابتدا کی وہ رامائنا تھی۔

پرانی عظمت وشوکت کا خاموش فسانہ ــــ تختِ اجودھیا کا رنگین دور۔ رام اور سیتا کی داستانِ محبت رام کی جلاوطنی اور بن باس میں سیتا کی جدائی یہ وہ دل تڑپا دینے والے مناظر ہیں جو ہر انسانی زندگی پر اپنا دوامی نقش چھوڑ جاتے اور جو ہر دردمند دل کو رُلائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ٹیگور کو بھی آخر کار متاثر کر گئے۔

بندھیاچل کی پرخطر گھاٹیوں نے اور دکن کے سنسان جنگلوں کے ہیبت ناک مناظر نے اسے رونا سکھایا ــــ رام کی ماں کی دل ہلا دینے والی آہ وزاری اور بیٹے کی جدائی پر مجبور ماںمتا کی پکار نے اسے دوسروں کے دُکھ کو اپنا سمجھنا سکھایا اور پھر سیتا کا رام سے بچھڑ جانا اور اس گرفتارِ محبت کا سیتا کے لئے سارے دشت وبیاباں کا ایک کر دینا اسے بتلا دیا کہ دو دل ایک کیسے ہوتے ہیں۔

شائد یہی وجہ ہے کہ اسے قدرت کی ہر معصوم چیز سے محبت ہے۔ رامائن کے مطالعہ کے بعد ہی اس نے حُسن پرستی سیکھی نہ صرف حسن پُرستی سیکھی بلکہ اپنی امنگوں اور آرزوں کو حسین چیزوں میں تحلیل کر لینا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

دوسرے اثرات جنھوں نے اس پرستارِ حسن کی زندگی میں ایک اور انقلاب پیدا کیا وہ بنگال کے "ویشناو" شعراء کے کارنامے تھے۔ ٹیگور نے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کا نہ صرف گہری نظر سے مطالعہ کیا بلکہ اُس روح کو جو اُس نغمہ سرائی کی محرک تھی اپنے میں تحلیل کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے کلام میں ان بنگالی شعراء کا رنگ نمایاں ہے۔ اور ان کی شیریں بیانی سے متاثر ہو کر اُس نے وہ کتاب لکھی جو "وانو سنگھ کے گیت" کہلاتی ہے۔ یہی بنگالی شعراء تھے جن کا رنگ کیف بن کر اس شاعرِ فطرت ٹیگور کی رگ رگ میں سما گیا۔ اس چشمۂ علم کی فیاضیوں کو وہ آتنا پی گیا کہ اس کی ہر پھٹتی ہوئی رگ سے اسی سرچشمہ کا پانی بہتا ہے۔ اور اس کے تخیل میں چاہے وہ محبت کا ہو کہ حُسن کا ــــ ایثار کا ہو کہ قربانی کا ــــ درد کا ہو کہ مسرت کا ــــ انہی بنگالی شعراء کی دھندلی تصویر رقص کرتی نظر آتی ہے۔ انہیں شاعروں کے کارناموں نے اس کی نظر میں محبت کے تخیل کو محبت سے بالاتر بنا دیا۔

انہی کی جادو بیانی نے اُسے محبت کی شراب پلائی جس سے مخمور ہو کر وہ جس چیز کو دیکھتا ہے اس میں محبت کرنے کی صلاحیت پاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری بجائے خود ایک خاموش محبت کا سرچشمہ ہے۔

ایک تیسری چیز جس سے شاعر کی زندگی متاثر ہوئی وہ اُستاد بہاری لال کا سایہ تھا۔ اگر "ویشناو" شعراء نے اسے محبت کرنا سکھایا تو بہاری لال نے حُسن پرستی کا راز سمجھایا کہتے ہیں کہ ٹیگور کا پہلا اُستاد بہاری لال ہی تھا۔ ٹیگور کے ہر جذبۂ حسن پرستی سے بہاری لال کا رنگ جھلکتا ہے اس کی وہ نظمیں جو اپنی جوانی کے زمانے میں اس نے لکھی ہیں جن میں "سنہری بنیا" بھی شامل ہے ان سب میں بہاری لال کی "سروامنگل" اور "بنگا سندری" کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔

شاعر نے کالیداس کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اگر ایک طرف کالیداس نے اپنی شکنتلا کی دنیا بھر میں دھوم مچا دی تو دوسری طرف ٹیگور نے "گیتان جلی" لکھ کر اپنی شاعری کا سکہ بٹھا دیا۔

ہندوستان کے خشک اور بے لطف موسموں کو رنگین بنا کر ان میں حُسن اور محبت پیدا کرنا رابندرناتھ ہی کا حصہ تھا۔ یورپ کی روماں انگیز فضاؤں میں کتنے ایسے دل ہوں گے جو ہندوستان کے سبزہ زاروں میں محبت کرنے کی تمنا رکھتے ہوں۔ اور کتنے ایسے عشاق ہوں گے جو اپنی محبوبہ کو بغل میں لئے ہندوستان کی برساتوں کو یاد کرتے ہوں گے۔

اگر کالیداس نے عورت کے حسن کی تعریف کی ہے تو ٹیگور نے حُسن کی پرستش کی ہے کالیداس اگر حُسنِ فطرت سے متاثر ہو کر اپنے کلام کو حسین بناتا تھا تو ٹیگور اپنے کلام کو سراپا حسن بنا دیتا ہے۔ ٹیگور کا "تحفۂ عاشق" (Lover's gift) بجائے خود حُسن کا ایک مکمل مرقع ہے۔

پانچویں چیز جو ٹیگور کی شاعری پر اثر انداز ہے وہ دیہاتی بچوں کے معصوم گیت ہیں۔ قومیت اور ایثار میں ڈوبے ہوئے نوجوانوں کے ترانے۔ اُن کی معصومیت اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی ٹیگور کے لئے نشہ کا کام کر گئیں اور انہیں کے کیف و سرور سے

مست ہو کر وہ مادر وطن کے ہر سپوت کو شراب محبت سے مخمور پاتا ہے۔

— کتنا بلند تخیل ہے وطن کی آزادی کا؟

رابندرناتھ شاعر پیدا ہوا اور شاعر ہی رہا

ہندوستان کے کوہساروں میں کتنے دن اس نے ایسے گذارے جب صبح کی زرین شعائیں شبنم کے آنسو پونچھتے ہوئے پہلی بار اس شاعر محبت سے ہمکلام ہوتی اور نسیم خوشگوار جنوبی سمندروں کی نمی سے اس کے من کی آگ کو ٹھنڈا کرتی۔ حسین کلیاں چٹک کر پھول بن جاتیں اور ہنستے ہوئے پھول اُسے ورود صبح کی مبارکباد دیتے — پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اس کے دماغ کو معطر کرتی نیلے آسمان پر بادلوں کے کاروان اس کے لئے وطن والوں کا سندیسہ لاتے تو دور آبشاروں کے سُریلے راگ میں شاعر اپنے نغموں کو مرتعش کر دیتا اور وہ نغمے وطن والوں تک محبت، حسن، زندگی اور آزادی بن کر پہنچتے۔

کتنی ایسی تاریک راتیں ہوں گی جو شاعر کو لوری دے دے کر سلانے کی کوشش کرتیں لیکن وہ وطن والوں کا خیال کر کے بے قرار ہو جاتا۔ کتنی ہی ایسی سہانی راتیں ہوں گی جب مادر وطن، حسن اور محبت کی دیوی بن کر اس کے دنیائے تخیل میں رقص کرتی لیکن جب وہ اپنی اس ماں کے گلے میں بجائے پھولوں کے ہار کے غلامی کی زنجیریں پڑی دیکھتا ہوگا تو اس کے دل کو کتنی ٹھیس لگتی ہو گی۔ اُس کا مسرور دل تڑپ جاتا ہوگا — روتا ہوگا — اور ہر آنسو جو اس کی آنکھوں سے اُمنڈ آتا ہے دنیا کے سامنے "گیتان جلی" "موسم بہار کا چکر" "نبیدا" گیتابی وغیرہ کی شکل میں آتا ہے۔

— اور ابھی شاعر کے کتنے ہی ایسے آنسوؤں کی ہندوستان کو ضرورت ہے —

سید احمد حسین (عثمانیہ) متعلم سال اول

اُردو ڈرامہ

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ڈرامے کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی۔ انسان کی زندگی خود ایک دلچسپ ڈرامہ ہے جس میں نت نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

جب کسی چیز کی ابتدا ہوتی ہے تو اس کا علم کسی کو نہیں ہوتا کہ انجام کیا ہونے والا ہے۔ ڈرامہ بھی بالکل غیر منظم طریقہ پر شروع ہوا۔ شائد اس کی ابتدا کے وقت یہ وہم و گمان بھی نہ ہو کہ ادب میں ڈرامہ کو خاص درجہ حاصل ہوگا۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسان ابتداء آفرینش سے بہت عرصہ بعد تک فطرت کی خاص خاص قوتوں کی پوجا کیا کرتا تھا۔ کبھی تو پانی کی عظمت کے آگے سر نیاز خم کر دیتا اور کبھی خاور مشرق کی آب و تاب سے متاثر ہو کر اس کو اپنا معبود سمجھتا تھا۔ ان قوتوں کی پرستش ہی کو اپنا مقصد حیات اور ذریعہ نجات تصور کرتا تھا۔ جب کبھی اس کی پر امن زندگی میں تلاطم برپا ہوتا اور امن و آشتی درہم و برہم ہو جاتی تو اس کو دیوتاؤں کی خفگی پر محمول کرتا اور ان کے منانے کی خاطر مختلف قسم کی قربانیاں دیتا قربانیوں کی رسمیں کبھی تو انفرادی طور پر اور اکثر مشترکہ منائی جاتی تھیں اور ساری قوم اس میں شریک رہتی تھی۔ ان قربانیوں کے علاوہ بعض ایسی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی جشن منعقد ہوتے تھے جن سے قومی بہادری اور جوانمردی کا اظہار ہوتا۔ تاریخ عالم میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ فاتح قبائل میدان کارزار کی نقل پیش کر کے شکست خوردہ قوم کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہی ڈرامے کی ابتدائی شکل تھی۔

ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدا سے متعلق محققین مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے

ہے جس کے خیال میں ہندوستانی ڈرامہ دراصل یونانی ڈرامہ کا رہین منت ہے اور دوسری جماعت کا دعوی ہے کہ ہندوستانی ڈرامہ خالص ملکی پیداوار ہے۔

حال کی تحقیقات آثار قدیمہ نے یہ ثابت کردیا کہ آریاؤں سے بہت پہلے سرزمین سندھ پر ایک ایسی قوم آباد تھی جس کی تہذیب آریاؤں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ چنانچہ سر جون مارشل نے اپنی کتاب (   ) میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "آریاؤں سے پہلے ہندوستان کے دوسرے اقطاع میں نہیں تو کم از کم پنجاب و سندھ میں ان ہی ذلیل و حقیر دریسیوں کا ایک ترقی یافتہ اور یکساں تمدن موجود تھا جو عراق اور مصر کے ہمعصر تمدن سے بہت قریبی تعلق رکھتا تھا" آثار قدیمہ کی کھدائی کے سلسلے میں بہت سی ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن سے ان کے مذاق فنون لطیفہ کا خاصہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو قوم تہذیب و تمدن میں اتنی ترقی یافتہ ہو اس کے متعلق یہ امر بھی قرین قیاس ہے کہ ڈرامے سے بھی خواہ وہ کسی شکل و صورت میں ہو ضرور واقف رہی ہو۔

ہندوستانی ڈرامہ ابتدا میں حمد یا مکالمہ کی صورت میں ہوا کرتا تھا جس کے ماخذ وید ہوتی تھیں۔ "کالیداس" کے ناٹک "وکرم اور اروس" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامہ کس طرح عالم وجود میں آیا۔ جب دیوتاؤں کی درخواست پر مہاراجہ اندر نے برھما کے دربار میں ڈرامے کی خواہش ظاہر کی تو برھما نے اس کی اجازت دیدی اور اس کی تدوین کے لیے مختلف افراد منتخب ہوئے۔ کسی نے کردار آموزی کا بیڑہ اُٹھایا اور کوئی موسیقی کے لئے مقرر کیا گیا۔

اُردو ڈرامے کی ابتدا: ڈرامے سے پہلے اُردو زبان میں مثنویاں لکھی جا چکی ہیں جن میں بلا کا اثر موجود تھا۔ اور آج بھی انھیں تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مکالمہ کی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس طرح ڈرامائی ضروریات کے لئے بھی بہت سی سہولتیں ان ہی مثنویوں کی وجہ سے بہم پہنچیں۔ چنانچہ اندر سبھا کا مصنف امانت میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان کے اشعار اس طرح نقل کرتا ہے۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ امانت نے ضرور اس مثنوی سے خوشہ چینی کی ہے۔

عجب رات تھی وہ بقول حسن — ہر ایک شئے پہ تھا ماہ پرتو فگن

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا — وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرِ افلاک اور مہ کا ظہور — لگا شام سے صبح تک وقت لوز

(اندر سبھا مطبوعہ رسالہ اُردو۔ ماہ اپریل ۲۸ء ۱۹)

اُردو سے پہلے دوسری ہندوستانی زبانوں میں ڈرامے موجود تھے۔ اور لکھنو کا رنگیلے حاکم یعنی واجد علیشاہ نے کئی رہس تیار کئے تھے ان کی کتاب (بنی) میں اس کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔ اس ماحول سے متاثر ہو کر ہی امانت نے "اندر سبھا" تصنیف کی۔ ناٹک ساگر کے مصنفین (محمد عمر و نور آلہی صاحبان) کا خیال ہے کہ اندر سبھا ایک فرانسیسی کے مشورے اور حاکم وقت کی فرمائش پر لکھی گئی لیکن ان کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ خود مصنف نے سبب تالیف یوں بیان کیا ہے۔

بندہ خاکسار سیدآغا حسین متخلص بہ امانت شعر و سخن کا ہمیشہ سے ذوق رکھتا ہے دلگیر کا شاگرد تھا — (اس کے بعد امانت کی خانہ نشینی کا ذکر ہے) زبان کی وابستگی میں گھر بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ رفیق شفیق مونس و غمخوار قدیمی جان نثار شاگرد اول نے ازراہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسہ ناٹک کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہئے کہ دو چار گھڑی دلگی کی صورت ہوے اور خلق میں شہرت ہوئے آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا دم بدم شوق زیادہ ہوا چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا مگر اپنے نزدیک معیوب تھا اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں اُستاد کیا۔

مندرجہ بالا عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ امانت نے 'اندر سبھا' واجد علی شاہ کے حکم سے نہیں لکھی بلکہ اپنے دوست عبادت کی فرمائش پر تصنیف کی ہے۔ آج تک یہ بھی نہیں ثابت ہوا کہ امانت دربار واجد علیؒ شاہ کا شاعر تھا۔ البتہ بالواسطہ واجد علی شاہ کی محفل آرائیوں سے متاثر ضرور رہا۔

مرزا عابد علی عبادت نے اندر سبھا کے چھپنے کی تاریخ بھی کہی ہے۔

کہی خوب تاریخ تو نے عبادت   مرقع امانت کی اندر سبھا ہے

اسٹیج کی وجہ سے یہ بھی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ اندر سبھا میں پردے ہی استعمال کئے گئے تھے۔ اس لئے یہ ضرور فرانسیسی ماہر کے مشورے کی بنا پر تیار ہوئی ہو گی۔ اوّل تو ہندوستان میں پہلے ہی سنسکرت ڈرامہ کا رواج تھا اور دوسرے "اندر سبھا" میں پردے بالکل سادے استعمال کئے گئے تھے۔ آمد کے وقت ایک سادہ پردہ تان دیا جاتا تھا اور اداکار پردہ کے پیچھے تیار رہتے تھے۔ سب سے پہلے آمد گائی جاتی تھی اور پھر اس کے بعد مہتاب چھوٹتی اور پردہ اٹھایا جاتا تھا سر کے اشارے سے اداکار تماشائیوں کو سلام کرتا اور اپنے حسب حال غزل گاتا تھا۔ ان تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ڈرامہ فرانسیسی ماہر فن کا رہین منت نہیں ہے۔ بلکہ اردو ادب کے پرستاروں کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ غلط فہمی بھی قابل تردید ہے کہ اندر سبھا قیصر باغ میں کھیلی گئی تھی اور بادشاہ اور بیگموں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ پہلے تو یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ اندر سبھا بادشاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی اور دوسرے بادشاہ نے خود اپنے لکھے ہوئے رہس میں بھی بہ حیثیت اداکار کبھی شرکت نہیں کی ورنہ وہ اپنی کتاب (بنی) میں جہاں اور بہت سی تفصیلات لکھی ہوئی ہیں اس کا ضرور تذکرہ کرتا۔

قدیم اُردو ڈرامے اندر سبھا کے بعد بھی متعدد ڈرامے لکھے گئے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کہ تجارتی اصول پیش نظر رکھ کر لکھے تھے۔ ان میں کسی قسم کی اگر جدت ہوئی تو صرف اس قدر کہ ڈراموں کی زبان بدل دی گئی۔ مولوی بادشاہ حسین صاحب نے اپنی کتاب "اُردو میں ڈرامہ نگاری" میں ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ انھوں نے ڈراموں کو ان کے ناموں کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے تو وہ ڈرامے جن کے نام ہیرو ہیروین کے ناموں سے مشترک ہوتے تھے۔ مثلاً "لیلیٰ مجنوں" "شیریں وفرہاد"۔ "نل دمن" "ہیر رانجھا" وغیرہ

ان ڈراموں کا مقصد حسن و عشق کی داستان دھرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوسرے وہ ڈرامے ہیں جن کی تصنیف کی غرض وغایت دنیا کی نیرنگی اور زمانے کی ناسازگاری ثابت کرنی تھی۔ اس قسم کے ڈراموں میں دورنگی دنیا"۔ "کایا پلٹ" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تیسرے وہ ڈرامے جن کے نام

عوام کے پسندیدہ ہوا کرتے تھے۔ مثلاً "باپ کا گناہ" "گناہ کی دیوار"۔ "باپ کا قتل"۔

ان ڈراموں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پلاٹ یا قصّے غیر ملکی ہوا کرتے تھے۔ اور یہ ڈرامے فنّی اعتبار سے بالکل ناقص تھے۔ ان کے مصنفین اکثر شعرا تھے۔ جس کے باعث ان کے مکالمے نظم میں ہوتے تھے یا مقفیٰ و مسجع عبارت میں۔ غرض ایسے ہی بہت سے نقائص قدیم اُردو ڈراموں میں موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مصنفین معمولی تعلیمیافتہ اور کمپنیوں کے اداکار ہوتے تھے۔ بادشاہ حسین صاحب نے ڈرامانگاروں کو تین دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے تو وہ ڈرامہ نگار ہیں جو کہ طرز قدیم کے علم بردار تھے۔ اور دوسرے وہ جنھوں نے بلحاظ زبان لکیر پیٹنا چھوڑ دیا تھا۔ اور تیسرے وہ ہیں جنھوں نے اُردو ڈراموں میں انقلاب پیدا کیا اور طرز جدید کے علمبردار کہلائے۔ ان ہی میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا ڈرامہ "زود پشیمان" شامل ہے اس ضمن میں کیفی اور تاج وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ جناب تاج کا ڈرامہ انارکلی ان سب میں سرآمد ہے۔ ڈرامہ عموماً دو مقاصد کے تحت لکھا جاتا ہے ایک تو ڈرامہ جس کی تصنیف کا مقصد حصول زر ہے۔ ایسے ڈرامے بالعموم تھیٹریکل کمپنیوں یا فلموں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ ڈرامے ہیں جو شوقیہ اداروں کی جانب سے تفریح طبع کی خاطر پیش کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ بعض ایسے ڈرامے بھی ہوتے ہیں جو کہ محض کتابی اشاعت کی حد تک محدود ہوتے ہیں۔ انہیں آجکل کوئی اہمیت نہیں دی جاتی بعض مغربی مبصرین کا خیال ہے کہ ڈرامہ صرف اسٹیج کے لئے لکھا جانا چاہیے حتیٰ کہ وہ ڈراموں کی اشاعت کے بھی سخت مخالف ہیں۔ متذکرہ بالا ڈرامے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ جو ڈرامے تجارتی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہوں وہ سنجیدہ حضرات کے لئے تفریح طبع کا باعث نہیں بن سکتے اور جو ڈرامے شوقیہ مصنفین کی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں وہ عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے ونیز تھیٹریکل کمپنیوں کے ڈرامے پردۂ سیمین پر بغیر کسی تبدیلی کے پیش نہیں کئے جا سکتے چنانچہ آغا حشر کے متعدد ڈرامے اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ جو کہ بہت سی ترمیموں کے بعد بھی پردۂ سیمین پر پیش کئے گئے لیکن زمانے کے رجحانات کا ساتھ نہ دے سکے۔ قدیم ڈراموں میں

ایک بھی ایسا نہیں جو کہ فنی اعتبار سے قابل قدر ہو البتہ اُردو ڈرامے کا دور جدید سب سے کامیاب دور کہلایا جاسکتا ہے۔ اُردو کی خوش قسمتی ہے کہ علمی اداروں نے بھی اس کی طرف کافی توجہ کی ہے ان اداروں میں جامعہ ملیہ سب سے آگے ہے اس کے علاوہ ادارہ ” ادبیات اُردو “ حیدرآباد دکن اور اُردو اکاڈیمی قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر جس سرعت سے ترقی کر رہا ہے اس سے اُردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے۔ آخر الذکر ادارہ کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ اور ایک عرصہ سے ڈرامہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ جامعہ ملیہ کی غیر معمولی کامیابی دراصل اس کے مخلص کارکنوں کی رہین منت ہے جامعہ ملیہ نے جو ڈرامے شائع کئے ہیں ان میں بچوں کے ڈرامے بھی شریک ہیں اس میں ان ڈراموں کو شائع کر کے ایک قابل انکار کمی کی تلافی کی ہے۔ یہ ڈرامے بچوں کی نفسیات کے نقطۂ نظر سے کماحقہٗ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن یہ صنف ڈرامہ میں بچوں کے ادب کی تعمیر کا سنگ بنیاد ثابت ہوں گے۔

حیدرآباد اور ڈرامہ جس طرح شمالی ہند ڈرامہ نگاری میں سرگرم ہے حیدرآباد بھی پورے جوش کے ساتھ مصروف عمل ہے نہ صرف آج بلکہ ابتدائی زمانے میں بھی حیدرآباد کو یہ فخر حاصل رہا ہے چنانچہ پرانے ڈرامہ نگاروں میں اہل حیدرآباد کے نام بھی نمایاں ہیں۔

حیدرآبادی نوجوان جامعہ عثمانیہ کی علمی فضاؤں میں نشو و نما پا کر اس قابل ہو گئے ہیں۔ کہ ڈرامہ نگاری پر بھی بے لاگ قدم اٹھائیں انہوں نے اردو ادب میں ڈرامے کی کمی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کمی کو پورا کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے یوم جامعہ میں ہر سال ڈرامہ پیش کر کے سنت دیرینہ کو دہرایا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں ڈرامہ کی مختلف انجمنیں بھی قائم ہیں۔ ان میں ” بزم احباب “ ” بزم تمثیل “ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان انجمنوں کے پیش نظر نہ صرف ڈراموں کو منظر عام پر پیش کرنا ہے۔ بلکہ اسے دنیا کی دوسری علمی زبانوں کے معیار پر پہونچانا بھی منظور ہے۔ حیدرآباد کے نوجوان نقادوں اور ڈرامہ نگاروں میں اکبر وفاقانی صاحب، بادشاہ حسین صاحب، فضل الرحمن صاحب، ظفر الحسن صاحب، مخدوم محی الدین صاحب، میر حسن صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نوجوانوں کے علاوہ دوسرے ان بزرگوں میں جنھوں نے کہ حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور ان کے عزیز عصمت اللہ بیگ صاحبان شامل ہیں ان کی سلاست زبان کے شکوہ میں۔ ڈرامے کے سارے عیوب پر پردہ پڑ گیا ہے۔ ظفر الحسن صاحب نہ صرف ڈرامہ نگار ہیں۔ بلکہ ایک کامیاب اداکار بھی ہیں۔ میکش صاحب اور قریشی صاحب نے نثری ڈراموں سے اردو ادب کے تہی دامن کو بھرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ان دنوں حیدرآباد جس سرگرمی سے ڈرامہ نگاری میں مصروف عمل ہیں وہ سرزمین ہند کے کسی اور قطعہ پر نظر نہیں آتی بادشاہ حسین صاحب نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ اس موضوع پر اردو میں ایک کتاب ” اُردو میں ڈرامہ نگاری “ لکھ کر اپنے ذوق سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ اور مخدوم وفاقانی نے متعدد مضامین سے ڈرامے کی ضروری اور اہم متعلقات پر روشنی ڈال کر اہل ذوق کی دعوت طبع کا سامان بہم پہنچایا ہے فضل الرحمن صاحب کے ڈرامے بھی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں پلاٹ اور زبان دونوں سامعین پر اثر کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ایک دو ڈراموں میں بعض کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی کامیاب ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اوروں کی طرح پلاٹ غیر زبان سے لے کر اپنا لیا ہے۔ اور حتی الامکان مقامی حالات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مخدوم محی الدین صاحب اور میر حسن صاحب کا ڈرامہ ہوش کے ناخن . . . بھی خوب ہے۔ بالخصوص دہقانی زبان جس خاص انداز میں موزونیت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ وہ ان کا ہی کام ہے۔ لیکن ان کا دوسرا ڈرامہ بھول بھلیں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری تو مکالموں کی طوالت ہے۔ اس کا ہر جملہ بجائے خود ایک نظریہ اور قول ہے۔ جس کی وجہ سے اسٹیج پر دلچسپی کا باعث نہ ہو سکا۔ یہ ڈرامہ اسی صورت میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ جبکہ مخصوص تعلیمیافتہ طبقہ کے سامنے پیش کیا جائے اور مکالموں میں اختصار سے کام لیا جائے۔ مؤلف کو بڑی حد تک غیر زبان کے ڈرامے کو اپنانے میں ناکامی ہوئی ہے۔ موسم اور مقام میں کوئی مناسبت نہیں رکھی گئی اور سردی کا اس شدت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یورپ کے کسی مقام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کی سردی اتنی شدید نہیں ہوتی غیر زبان کے ڈراموں کو اپنانے میں سب سے زیادہ احتیاط تہذیب معاشرت اور

موسم وغیرہ کی تبدیلی اور رنگ آمیزی میں ملحوظ رکھنی چاہئے۔

اصناف درامہ ڈرامہ انسانی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کی زندگی کے دو پہلو تاریک و روشن ہوتے ہیں اسی طرح ڈرامے بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ ڈرامہ ہوتا ہے۔ جو غم والم کی ترجمانی کرے اور دوسرا وہ جو مسرت و انبساط کا علمبردار ہو۔ پہلا حزنیہ (Tragedy) اور دوسرا طربیہ (Comedy) کہلاتا ہے۔ بعض نقادان فن نے حزنیہ ڈراموں کو قابل ترجیح سمجھا ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک طربیۂ قابل ستایش ہے۔ پہلے گروہ کا خیال ہے کہ دنیا میں غم کی مقدار خوشی سے بہت زیادہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر "جہاں منزل درد و جائے غم است" اس لئے انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ حزنیہ ڈراموں کو دیکھ کر جذبات میں طلاطم پیدا کرے اور اس میں اپنی زندگی کا مقصد تلاش کرے و نیز اس لئے بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کہ غم والم کے اثرات انسانی قلوب پر نقش بر آب نہیں بلکہ نقش فی الحجر ہوتے ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان کو زندگی میں غم اور خوشی ہر دو سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ہم اس لئے نہیں پیدا ہوئے کہ شاخ زندگی پر بیٹھ کر اُڑ جائیں بلکہ اس لئے کہ خوشنوائی کریں سمندر زیست میں شناوری کرنا اور ساحل سے بے نیاز رہنا ہمارا مقصدِ حیات ہونا چاہئے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے قنوطیوں کے مقابل میں بہانگ دہل یہ اعلان کیا ہے کہ ـــــ

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل　　چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

(دیگر)

موج ساحل کہ در آغوشِ ساحل　　تپید یک دم و مرگِ دوام است

انسان فطرتاً غم اور خوشی سے متاثر ہونے کا عادی ہے اور جبکہ خود اس کی زندگی میں ان دونوں کا وجود ہے (خواہ کسی کی بھی مقدار زیادہ ہو) تو کیا وجہ ہے کہ ہم قنوطیت کا ہی راگ الاپیں۔ دوسری دلیل یہ کہ جب انسان تھکا ماندہ تفریح کی تلاش کرتا ہے تو ایسے موقعوں پر حزنیہ سے زیادہ طربیہ ڈرامے مفید ہیں۔

ہمارے نزدیک ان دونوں کا اشتراک و ارتباط نہایت ضروری ہے۔ چونکہ زندگی ان میں سے کسی ایک سے یکسر خالی نہیں ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار" کالیداس" اور مغرب کے ڈرامہ نگار شکسپیر دونوں کے ڈراموں کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

وہی ڈرامہ نگار کامیاب ہو سکتا ہے جو کہ ڈرامے کو زندگی کے مرقع کی صورت میں پیش کرے ڈرامے کی دلچسپی پلاٹ یا قصہ اور مکالمہ پر منحصر ہے۔ بعض ڈراموں کی کامیابی کا دار و مدار اگر اچھوتے پلاٹ پر ہوتا ہے۔ تو بعض کی مقبولیت مکالموں کی رہین منت ہوتی ہے اور جو ڈرامہ ان دونوں خصوصیتوں کا حامل ہو اس کا کہنا ہی کیا۔

ڈرامہ ناظرین کو اپنی دنیا میں گم کرلے۔ اور دعوت فکر بھی دے۔ بعض ڈرامہ نگار فطرتاً ابتداء میں عقدہائے حل شدنی پیش کر کے ناظرین کے لئے غور و فکر کا سامان مہیا کرتے ہیں اور خود اس کا حل بعد میں پیش کرتے ہیں اس سے ناظرین اپنے اخذ کئے ہوئے نتیجے اور پیش کئے ہوئے حل کے مقابلہ سے دماغی تفریح محسوس کرتے ہیں و نیز اس کے اثرات بھی بہت دیرپا ہوتے ہیں۔

مکالمہ، ڈرامے کے اہم ترین عناصر میں شمار کیا جاتا ہے۔ مکالمہ کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ کردار کے حسب حال ہو۔ یہ ایسی کٹھن منزل ہے جہاں کہنہ مشق ڈرامہ نگاروں کے قدم بھی لڑکھڑاتے ہیں۔ صرف مکالمے ہی کے ذریعے کردار کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اب یہ وہ زمانہ نہیں رہا کہ کردار کی آمد سے پہلے اس کے تعارف کے لئے "آمد"　　۔ اس کے ساتھ ہی اداکار اور اسٹیج کو بھی ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے تاکہ اس کے ادا کرنے میں نہ تو اداکار ہی کو تکلف ہو اور نہ اسٹیج پر مکالمہ مضحکہ خیز ثابت ہو۔ کسی ڈرامے کے مصنف نے اسٹیج کو نظر انداز کر کے ایسے موقع پر بہاریہ گفتگو پیش کی تھی۔ جب کہ اسٹیج پر خزاں کے آثار ہویدا تھے۔ جب پھولوں کا ذکر کرتے ہوئے اسٹیج کی طرف اداکار نے اشارہ کیا تو قہقہوں سے سارا اسٹیج گونج اٹھا۔

ایک تعلیمیافتہ شخص کی گفتگو اور انداز بیان غیر تعلیمیافتہ سے مختلف ہوتا ہے اور بوڑھے نوجوان سے جداگانہ پیرایہ بیان اختیار کئے ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے مخصوص محاورے استعمال کرنے کی

مشکلیں دونوں ڈرامہ نگار کے پیش نظر ہونی چاہئے۔ ایک اجنبی کبھی بھی غیر ملک میں ہلا گھلا نہیں پھرتا۔ اس کے حرکات و سکنات سے اجنبیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور گفتگو میں تکلف روا رکھا جاتا ہے۔ تجارت پیشہ اور کاروباری لوگوں کی گفتگو کا انداز مخصوص ہوتا ہے۔ ایک کالج کا پروفیسر جب گفتگو کرتا ہے تو اس کے ہر لفظ سے علمیت کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تمام مشکلیں صرف اس صورت میں آسان ہوسکتی ہیں۔ کہ خود ڈرامہ نگار ان کا قریب سے مطالعہ کرے ہر حصہ ملک کی زبان میں کچھ نہ کچھ ضروری اختلافات پائے جاتے ہیں۔ خواہ وہ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے ہوں یا تلفظ کے اعتبار سے۔ اگر ڈرامہ نگار چاہے تو ایسے مقام پر اپنی شخصیت کا اظہار کرسکتا ہے مثلاً اگر ڈرامہ نگار حیدرآباد کا باشندہ ہے۔ اور کردار دہلی کا تو ایسے وقت یہ ممکن ہے کہ حیدرآبادی ڈرامہ نگار اپنی زبان ہی پیش کرے لیکن بہتر تو یہی ہے کہ زبان بھی کردار کے ساتھ دہلی ہی کی ہو۔ اور ڈرامہ نگار اپنی شخصیت کے اثرات مرتسم کرنے سے باز رہے۔

ڈرامے میں ظرافت مختلف طریقوں سے پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن سب سے ادنی درجے کی ظرافت وہ ہے جو جسمانی حرکات و سکنات کے ذریعہ پیش کی جائے۔ اس کی مثال اس ظرافت کی ہے۔ جو بھانڈ، نقال اور سرکس کے مسخرے پیش کیا کرتے ہیں۔ پرانے ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی حصول زر کی خاطر ایسے عامیانہ مذاق کا جز ڈرامے کے ساتھ شریک کردیا کرتی تھی۔ جن کا ڈرامے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ راقم الحروف نے ایسے متعدد ڈرامہ دیکھے ہیں۔ مار آستین میں ایک ایسا جز شریک کردیا گیا ہے۔ اور وہ عوام کے مذاق کے اتنا حسب حال ہے کہ لوگ اسے جمیلہ کی ناٹک کے نام سے موسوم کیا کرتے ہیں۔ آغا حشر ہندوستان کے شکسپیر کے نام سے ملقب ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ڈرامے کی بڑی حد تک خدمت انجام دی لیکن ان کے بہت کم ڈرامے ایسے تھے جو بغیر کسی تبدیلی کے منظر عام پر پیش کئے گئے ہوں۔ چونکہ کمپنیاں حصول معاش کی خاطر ایسا کرنے پر مجبور تھیں چنانچہ آغا حشر کو خود اس امر کا اعتراف ہے۔ انھوں نے اس سوال پر کہ ان کے ڈراموں میں عامیانہ مذاق کیوں جھلکیاں دکھاتا ہے۔ جواب دیا تھا۔ کہ اگر انھیں

کسب معاش کی فکر نہ ہوتی تو اس کمزوری کو دور کرنا ممکن تھا۔ سنجیدہ مذاق الفاظ موقع و مقام کی وجہ سے بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جب مختلف طبیعتوں کا تصادم ہوجاتا ہے تو مذاق میں بلندی پیدا ہوجاتی ہے۔

اسٹیج اور ڈرامے میں جسم اور روح کا سا تعلق ہے۔ جس طرح انسان کی کامیابی اس کے جسم اور روح کی ہم آہنگی کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس طرح اسٹیج اور ڈرامے کے ارتباط پر ڈرامے کی کامیابی کا انحصار ہے۔ ہندوستان میں پہلے مختلف رنگ کے پردے تان کر ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے۔ اندر سبھا کے مصنف نے اس کی پوری تفصیلات لکھی ہیں۔ یہ اسٹیج سارے تکلفات سے مبرا تھا۔ لیکن اس کے بعد ایک وہ دور آیا جس میں اسٹیج کی تیاری پر غیر معمولی عرق ریزی کرنی پڑتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسٹیج پر ایسی ہستیوں کو بھی لایا جاتا تھا۔ جن کے وجود کا تعلق اس دنیائے آب و گل سے نہ ہوتا تھا۔ اور یہ دیوی دیوتاؤں کو آسمان پر سے اترتے اور برگزیدہ ہستیوں کو دامن عافیت میں لیتے ہوئے پیش کیا جاتا تھا۔ پرانے ڈراموں کے مطالعہ سے یہ ساری حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اسٹیج پر دوسری منزل کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ اور جھولوں وغیرہ کے ذریعہ دیوں اور دیوتاؤں کو اتارا کرتے تھے۔

موجودہ دور میں ایسی دشواریاں تو نہیں ہیں لیکن بعد ارتقائی دور ہے اس لئے اسٹیج کی تیاری میں بہت سی باریکیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ان مشکلات کا وہی حضرات اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جنھیں آئے دن ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر اداکار اسٹیج میں ہم آہنگی بھی ڈرامے کی کامیابی کے لئے لازمی شرط ہے۔ بعض مغربی ماہران فن کا خیال ہے کہ اسٹیج کئی منزلہ ہو اور ناظرین کی نشستوں کا انتظام اس کے ہر سہ جانب کیا جائے۔ غرض جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا۔ اس کے ساتھ فن ڈرامہ میں بھی ترقی ہوتی رہے گی اردو ڈرامہ ابھی بہت پیچھے ہے فقط

"عجیب اتفاق"

صبح کی حسین دیوی انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو رہی تھی۔ فلک کی لاانتہائی وسعتوں میں جگمگانے والے ستارے دنیا اور دنیا والوں پر حسرت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے یکے بعد دیگرے رخصت ہو رہے تھے۔ نسیم سحری کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکے پھولوں کی خوشبو سے آمیز شام جان کو معطر بنا رہے تھے۔ ایسے فرحت بخش موسم میں جبکہ فطرت اپنے نکھار پر ہو گھر کی چار دیواری میں اکیلے پڑا رہنا کسی دل والے آدمی کا کام نہیں۔

خسرو شاعر تھا۔ بے حد حساس تھا۔ وہ باہر نکل پڑا۔ قدرت کی رنگینیوں اور لطافتوں میں کھو جانے کے لئے .... دور تک جنگل کا سلسلہ تھا۔ جنگلی درخت والہانہ انداز سے جھوم رہے تھے۔ اور کبھی کبھی جنگل کے حسین پھولوں کے ساتھ سرگوشیاں بھی کرتے جاتے تھے ٹبک اور خوش رنگ پرندے اونچے اونچے درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے پرسوز آواز میں چلا رہے تھے... قریب کی چھوٹی سی ندی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف برابر بہی چلی جا رہی تھی۔

خسرو ایک طرف بیٹھ گیا ...... ماہی گیر لکڑی کے تختوں پر سوار دور دور تک اپنے شکار کی تلاش میں چلے جا رہے تھے آبی پرند پانی پر منڈلا رہے تھے۔ بعض چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے مانند پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ دیہاتی لڑکیاں آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ ان کے پرشور قہقہوں سے جنگل کی فضا مرتعش تھی۔ خسرو کو یہ منظر بہت پسند آیا۔ دو سال کی طویل مدت کے بعد وہ اپنے گاؤں کو واپس آیا تھا۔ وہ شہر کے ایک کالج میں الیف۔ اے کی آخری جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس کا باپ گاؤں کا معمولی سا زمیندار تھا۔ شہر کی زندگی کا وہ اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ گاؤں کو واپس جانے

کے خیال سے ہی افسردہ خاطر ہو جاتا تھا۔ .... وہ سوچتا۔ گاؤں میں میرے لئے کیا دلچسپی ہے۔ زندگی کی ہماہمی جو شہر میں نظر آتی ہے وہ دیہات میں کہاں نصیب ہو سکتی ہے ...... آج اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اس کا خیال کس قدر بے بنیاد تھا ــــ اسی خیال میں گم وہ قدرت کی بے پناہ لطافتوں کا جامع مطالعہ کر رہا تھا .... یکایک وہ چونک پڑا۔ اور پھر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا .... کوئی گا رہا تھا۔

" بالم روٹھ گیو کیوں مو سے "

راگ ہوا کے دوش پر سوار اس کے سماعت کے پردوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ۔ آواز میں بلا کا لوچ اور ترنم تھا۔ خسرو بیخود سا ہو گیا اور خود بھی وہی شعر گنگنانے لگا۔

وہ اٹھا اور آواز کی جانب کھنچتا چلا گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ رک گیا۔ اس کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا۔ اس کے قریب ہی ایک حسین دوشیزہ پانی میں پاؤں لٹکائے ایک پتھر پر بیٹھی موجوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ موجیں اس کے پاؤں کو گدگداتی۔ اس کے گرد تصدق ہوتی ہوئی اور اپنی قسمت پر نازاں چلی جا رہی تھیں۔ ٹھیر ٹھیر کر اس کے لبوں سے کیف اور راگ کے چشمے پھوٹے پڑتے تھے۔ اور جنگل کی لامحدود فضا میں گم ہو جاتے وہ گا رہی تھی لیکن دنیا اور اس کی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اس سے کچھ ہی دور ایک مرد اور ایک عورت ...... شاید اس کے ماں باپ ..... چہل قدمی کر رہے تھے۔ گاڑی قریب ہی ایک طرف کھڑی تھی۔ گاڑی بان ایک طرف بیٹھا مزے سے چلم کے کش اڑا رہا تھا۔ خسرو اور آگے بڑھا اس کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس دوشیزہ کی نگاہیں تھوڑی دیر کے لئے خسرو کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ اب نغمے تھم چکے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور جانے لگی۔ "حسین دوشیزہ" بے ساختہ خسرو کی زبان سے نکلا۔ وہ پلٹی۔ ایک بار پھر اس کی نگاہیں خسرو کی نگاہوں سے ملیں۔ وہ شرماتی ہوئی اس کے دل کی دنیا کو تباہ و برباد کرتی چلی گئی۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگی ــــ آہ! کس قدر حسین تھی وہ اور پیار کرنے کے قابل ــــ وہ

بہت دیر تک خیال انگیز محویت میں وہیں بیٹھا رہا۔ جس وقت یہ طلسم ٹوٹا۔ آفتاب نکل چکا تھا اور دنیا کو اپنے نور سے منور کر رہا تھا۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ خسرو بھی اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

خسرو اداس رہنے لگا۔ اکثر راتوں میں وہ سوچتا" وہ لوگ کون تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے۔ یہاں کے باشندے تو معلوم نہیں ہوتے۔ شاید کسی اور شہر سے تفریح کی خاطر یہاں آ گئے ہوں۔ کیا وہ لڑکی کے ماں باپ تھے۔ وہ لڑکی۔ وہ ہاں ..... مگر ہے بہت خوبصورت۔ اُس کی آنکھیں کس قدر رسیلی۔ دلوں کو برباد کرنے والی تھیں۔ اس کے مسکرانے میں کتنی قیامتیں تھیں! غرض اس کا دماغ انھیں خیالات کا آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ وہ اکثر رات کا بڑا حصہ اسی سوچ بچار میں گزار دیتا۔

وہ متعدد بار ندی پر گیا۔ لیکن نہ تو وہ نازنین ہی نظر آئی اور نہ اُس کا کچھ پتہ ہی معلوم ہو سکا۔

ایک دن شام کے تقریباً ۶ بجے آفتاب غروب ہو رہا تھا اور جب کہ درختوں کے سایے دراز ہو رہے تھے خسرو اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں وہ ایک مکان کے سامنے ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہی نازنین اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ خسرو سے نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک وہیں مبہوت بنا کھڑا رہا ـــــ اور یہ کہتا ہوا "آہ ظالم تجھے تڑپانے میں مزا آتا ہے۔" اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اب روزانہ کسی نہ کسی وقت دونوں کی ملاقات ہوتی۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی ہوتی اور خسرو اُس کے سامنے آ جاتا ـــــ کچھ دنوں کے بعد خسرو کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کے بغیر اُس کی ہستی میں ایک خلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس سے ہٹ کر جب اپنی زندگی پر نظر ڈالتا تو اسے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی ـــــ خود وہ نازنین بھی اس کی محبت سے متاثر معلوم ہوتی تھی۔ دونوں کے پیام محبت اب تک آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو بھیجے جاتے تھے۔ اظہار کی جرائت دونوں طرف سے کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ آخر خسرو نے ارادہ کر لیا کہ وہ اُس سے اپنی محبت کا اظہار کر کے رہے گا۔ اُسے اس بات کا یقین دلا دے گا کہ وہ اُس سے بہت محبت کرتا ہے۔ پھر اس سے التجا کرے گا کہ وہ بھی اس کی محبت کا جواب محبت ہی سے دے ـــــ دوسرے روز وہ صبح اٹھا۔

اُوس پڑ رہی تھی۔ ساری دنیا پر ہلکا سا دھندھلکا چھایا ہوا تھا۔ ہوا شور کرتی چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ خسرو ان مناظر سے بے خبر اس غارتگر دل کے خیال میں مست اُس کے مکان پر پہنچا ـــــ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اُس سے نہ مل سکے گی۔ لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد اُس نے اُسے پا لیا۔ وہ اپنے پائیں باغ میں اکیلی بیٹھی ہوئی صبح کے نظارہ میں محو تھی ہلکے کاسنی رنگ کی ساڑی میں وہ پریوں سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کی طرف (للچائی ہوئی نظروں سے) دیکھتا رہا۔ پھر اسے مخاطب کرنے کے لئے گنگنانے لگا۔

شعر۔ اظہار کی جرائت کرتا ہوں — میں ہائے محبت کرتا ہوں

اُس نے خسرو کی طرف دیکھا۔ اور پھر اشارے سے پوچھا "کیا ہے؟" "کچھ نہیں" کہتا ہوا خسرو باغ کی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر اس تک پہنچ گیا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی "جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ نہیں تو کوئی دیکھ لے گا۔"

لیکن خسرو اُسی کے پیروں میں جھک گیا۔ اس کے جذبات برانگیختہ ہو گئے وہ حالت اضطراری میں کہنے لگا "حسین نازنین .... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ بغیر تمھارے میری زندگی بیکار ہے ... میں اپنی محبت کا جواب محبت سے چاہتا ہوں۔ صرف اتنا کہہ دو کہ "مجھے بھی تم سے محبت ہے"

"اب جاؤ" اُس نے خسرو کو اپنے ہاتھوں کے سہارے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی محبت کی قدر کرتی ہوں لیکن خدا کے لئے اب جلد چلے جاؤ۔ اگر کوئی دیکھ لے تو بڑی مصیبت ہو جائے گی ـــــ بڑی بدنامی کی بات ہے۔ اب کبھی ایسی جرائت نہ کرنا" وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ خسرو بھی دیوار پھاند کر اپنے گھر کی طرف اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہوا چلا گیا۔ اس کے چہرے سے فتح کی جھلک نمایاں تھی۔

خسرو کی زندگی کے یہ چند لمحے مزے کے ساتھ گزر رہے تھے۔ وہ اسی میں خوش تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی اس کی محبت کا دم بھر رہی ہے۔ وہ سب کے ساتھ مہربانی سے

بہت دیر تک خیال انگیز محویت میں وہیں بیٹھا رہا۔ جس وقت یہ طلسم ٹوٹا۔ آفتاب نکل چکا تھا اور دنیا کو اپنے نور سے منور کر رہا تھا۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ خسرو بھی اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

خسرو اداس رہنے لگا۔ اکثر راتوں میں وہ سوچتا "وہ لوگ کون تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے۔ یہاں کے باشندے تو معلوم نہیں ہوتے۔ شاید کسی اور شہر سے تفریح کی خاطر یہاں آگئے ہوں۔ کیا وہ لڑکی کے ماں باپ تھے۔ وہ لڑکی۔ وہ ہاں ..... مگر ہے بہت خوبصورت۔ اُس کی آنکھیں کس قدر رسیلی۔ دلوں کو برباد کرنے والی تھیں۔ اس کے مسکرانے میں کتنی قیامتیں تھیں! غرض اس کا دماغ انھیں خیالات کا آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ وہ اکثر رات کا بڑا حصہ اسی سوچ بچار میں گزار دیتا۔

وہ متعدد بار ندی پر گیا۔ لیکن نہ تو وہ نازنین ہی نظر آئی اور نہ اُس کا کچھ پتہ ہی معلوم ہو سکا۔

ایک دن شام کے تقریباً ۶ بجے آفتاب غروب ہو رہا تھا اور جب کہ درختوں کے سایے دراز ہو رہے تھے خسرو اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں وہ ایک مکان کے سامنے ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہی نازنین اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ خسرو سے نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک وہیں مبہوت بنا کھڑا رہا ـــ اور یہ کہتا ہوا "آہ ظالم تجھے تڑپانے میں مزا آتا ہے۔" اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اب روزانہ کسی نہ کسی وقت دونوں کی ملاقات ہوتی۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی ہوتی اور خسرو اُس کے سامنے آجاتا ـــ کچھ دنوں کے بعد خسرو کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کے بغیر اس کی ہستی میں ایک خلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس سے ہٹ کر جب اپنی زندگی پر نظر ڈالتا تو اسے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی ـــ خود وہ نازنین بھی اس کی محبت سے متاثر معلوم ہوتی تھی۔ دونوں کے پیام محبت اب تک آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو بھیجے جاتے تھے۔ اظہار کی جرات دونوں طرف سے کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ آخر خسرو نے ارادہ کر لیا کہ وہ اُس سے اپنی محبت کا اظہار کر کے رہے گا۔ اُسے اس بات کا یقین دلا دے گا کہ وہ اُس سے بہت محبت کرتا ہے۔ پھر اس سے التجا کرے گا کہ وہ بھی اس کی محبت کا جواب محبت ہی سے دے ـــ دوسرے روز وہ صبح اٹھا۔

اُوس پڑ رہی تھی۔ ساری دنیا پر ہلکا سا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ ہوا شور کرتی چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ خسرو ان مناظر سے بے خبر اس غارتگر دل کے خیال میں مست اُس کے مکان پر پہنچا ـــ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اُس سے نہ مل سکے گی۔ لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد اُس نے اُسے پا لیا۔ وہ اپنے پائیں باغ میں اکیلی بیٹھی ہوئی صبح کے نظارہ میں محو تھی ہلکے کاسنی رنگ کی ساڑی میں وہ پریوں سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کی طرف (للچائی ہوئی نظروں سے) دیکھتا رہا۔ پھر اسے مخاطب کرنے کے لئے گنگنانے لگا۔

شعر۔ اظہار کی جرات کرتا ہوں
میں ہائے محبت کرتا ہوں

اُس نے خسرو کی طرف دیکھا۔ اور پھر اشارے سے پوچھا "کیا ہے؟" "کچھ نہیں" کہتا ہوا خسرو باغ کی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر اس تک پہنچ گیا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی "جاؤ ـــ جاؤ ـــ نہیں تو کوئی دیکھ لے گا۔"

لیکن خسرو اُسی کے پیروں میں جھک گیا۔ اس کے جذبات برانگیختہ ہو گئے وہ حالت اضطراری میں کہنے لگا "حسین نازنین ..... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ بغیر تمہارے میری زندگی بیکار ہے ... میں اپنی محبت کا جواب محبت سے چاہتا ہوں۔ صرف اتنا کہہ دو کہ "مجھے بھی تم سے محبت ہے"

"اب جاؤ" اُس نے خسرو کو اپنے ہاتھوں کے سہارے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی محبت کی قدر کرتی ہوں لیکن خدا کے لئے اب جلد چلے جاؤ۔ اگر کوئی دیکھ لے تو بڑی مصیبت ہو جائے گی ـــ بڑی بدنامی کی بات ہے۔ اب کبھی ایسی جرات نہ کرنا" وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ خسرو بھی دیوار پھاند کر اپنے گھر کی طرف اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہوا چلا گیا۔ اس کے چہرے سے فتح کی جھلک نمایاں تھی۔

خسرو کی زندگی کے یہ چند لمحے مزے کے ساتھ گذر رہے تھے۔ وہ اسی میں خوش تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی اس کی محبت کا دم بھر رہی ہے۔ وہ سب کے ساتھ مہربانی سے

پیش آتا۔ گھر والے اس کی طبیعت کے انقلاب کی وجہ سمجھ نہ سکے۔ لیکن بہت جلد یہ طلسم رنگ و بو ٹوٹا۔ وہ نازنین چلی گئی۔ خسرو کو فراق کی مسموم فضا میں اکیلا چھوڑ کر۔ وہ اُس کو یاد کرتا اور تڑپتا۔ وہ تو چلی گئی تھی لیکن خسرو کے تصورات کی دنیا اب تک اس سے آباد تھی۔ وہ اکثر یہ شعر گنگناتا۔

شعر تصور کا کرم ہے میں کبھی خالی نہیں رہتا نہیں آتا اگر کافر تو اُس کی یاد آتی ہے

اس کو ایک عرصہ گذر گیا۔ بادل اُمڈ اُمڈ کر آتے، برستے اور پھر کُھل جاتے تھے۔ چاند اور سورج اپنے محور کے گرد گھومتے اور پھر اپنے مقام پر چلے جاتے لیکن وہ نہ آنا تھی نہ آئی۔ لوگ زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے واقعات کو بھولتے گئے۔ شاید حال نام ہی ہے گذشتہ واقعات کو بھول جانے کا لیکن وہ نازنین اب تک خسرو کے دل میں آباد تھی۔

اس عرصہ میں خسرو بی۔ اے کامیاب ہو چکا تھا۔ اور اسے اچھی ملازمت بھی مل گئی تھی۔ اس کے ماں باپ غریب تھے۔ اب ایکبارگی اتنی دولت دیکھی۔ وہ بے حد خوش تھے اور اپنے لڑکے کی شادی کی تیاریاں کرنے لگے۔ خسرو نے جب سنا کہ اُس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بات چیت بھی طے پا گئی ہے۔ تو وہ بہت سٹ پٹایا۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر سوچنے لگا "اب کیا کیا جائے" کس طرح اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اب اُسے وہ نازنین یاد آ رہی تھی۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ وہ مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خسرو تڑپ جاتا تھا — اپنی بے بسی پر آنسو بہا کر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کی ناراضگی کا کوئی اثر ماں باپ پر نہ ہو سکا۔ وہ کہتے کہتے تھک گیا کہ "ابھی میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ آخر آپ لوگوں کو میری شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ لیکن سب ترکیبیں بیکار ثابت ہوئیں۔

خسرو کو یہ سن کر کہ اس کی ہونے والی بیوی حسین ہے تعلیم یافتہ ہے۔ یک گونہ خوشی تو ہوئی لیکن جب اس نازنین کا خیال آتا تو شرمندگی سے اُس کا سر جھک جاتا۔ وہ خیالات کے ہجوم میں گھبرا کر کہتا "آہ میرے دل کی ملکہ — میں تیرا شرمندہ ہوں۔ میرا عہد ٹوٹ گیا لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے معاف کر"

خسرو کی شادی کا دن آ گیا ہر طرف سے مبارکبادیاں دی گئیں۔ ہر شخص خوش خوش تھا۔ لیکن خسرو کا چہرہ اداس تھا۔ شاید وہ خوش نہ تھا۔

برات دھوم دھام سے نکلی۔ خسرو اپنے مکان پر پہنچا۔ رات اپنی تمام دلچسپیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ آئی۔ لیکن کس قدر بھیانک اور خوفناک تھی وہ خسرو کے لئے — وہ حجلۂ عروسی میں پہنچا۔ پیشانی عرق آلود تھی۔ طائر دل قفس سینہ میں پھڑپھڑا رہا تھا ———

وہ بے چین تھا اپنی ہونے والی کو دیکھنے کے لئے — کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے اپنی بیوی کے منہ پر سے آنچل اٹھایا۔ خوشی سے اُس کے چیخ نکل گئی — وہی نازنین جو اُس کی تصورات کی دنیا میں آباد تھی — جس کے لئے وہ دن رات تڑپتا تھا۔ اب ہمیشہ کے لئے اس کی تھی۔

"عجیب اتفاق" دفعتاً خسرو کے منہ سے نکلا اور اپنی بیوی اور محبوبہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔"

شیخ امیر الدین حسین سال اوّل

"بت تراش"

بت تراش ؟ —— میں اور بت تراشی ؟ یہ کون کہہ رہا ہے —— یہاں تو کوئی
نہیں۔ خیر میں بتائے دیتا ہوں — اپنے دل کا راز۔ میں بت تراش ہوں اور آج بھی ایک ایسا
ہی بت تراشوں گا جو میری پرستش کے قابل ہو۔

ہاں پرستش ! اپنے تراشیدہ بت کی آپ ہی پرستش

میری نگاہیں۔ میرا تخیل یہی دو چیزیں مجھ میں افضل ہیں انہی میں میرے بت کی شکل ڈھالی جائیگی۔

اُف یہ پھول کتنا خوبصورت ہے ۔ اے بت تو اس سے بھی زیادہ حسین اور خوبصورت
بن جا —— اس سے بھی زیادہ حسین تاکہ مجھے اس کی پرستش نہ کرنی پڑے ۔

تیرا جسم —— اے بت ترا جسم ؟ ایک حسین عورت کے جسم کی طرح —— نہیں نہیں یہ ہرگز
نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس گل بدن کی بھی پرستش کرنی پڑے گی۔ پھر —— پھر تو اس سے
بھی زیادہ حسین بن جا تاکہ میں اس کی پرستش نہ کر سکوں۔

دیکھ ! میرے تخیل میں دیکھ —— تیرا اپنا جسم دیکھ ۔ کتنا حسین ہے تیرا جسم۔ تیرا حسن و جمال ؟
ادھر دیکھ ۔ قوس قزح کو —— اس کے پورے رنگ لے لے اور اس سے بھی زیادہ خوبصورت
بن جا۔ تاکہ جب کبھی میں اس کو دیکھوں تو تو یاد آجائے۔

تو ہر حسین شئے سے —— ہاں ہاں ہر حسین شئے سے زیادہ حسین بن جا۔ دیکھ مجھے
کبھی کبھی چاند اور سورج کی بھی پرستش کا خیال ہوتا ہے کیونکہ وہ بہت روشن ہیں —— بہت روشن
لیکن تو —— اے میرے پیارے بت تو ان سے بھی زیادہ روشن بن جا۔

تیری صفات ؟ —— میں تجھے کن صفات کا حامل بناؤں ؟
دیکھ مجھ کو خود پر ناز ہے ۔ ہاں اپنے آپ پر —— تو میری پوری صفات لے لے اور مجھ سے
بھی افضل بن جا۔

سچائی —— لے لے ۔

نیکی —— لے لے، اور انصاف بھی لے لے یہ بھی تیرے لئے ضروری ہے ۔

لے لیا —— سب کچھ لے لیا۔ بدی اور جھوٹ بھی ؟ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ بدی اور
جھوٹ کا تو خود میرے پاس ہی وجود نہیں۔ یہ کوئی صفات ہی نہیں ہیں۔ میں نے نیکی کا غلط استعمال
کیا اور یہی میری بدی تھی ۔ میں نے سچ سے انحراف کیا اور یہی میری جھوٹ —— میں نے
تجھے نیکی اور سچ دونوں دے دئے پھر بتا کہ اور کیا دوں —— بدی اور جھوٹ تو خود میرے
پاس ہی نہیں ہیں پھر میں تجھے کیسے دے سکتا ہوں ۔

اُف آسمان ! —— بلند آسمان ! ۔ بے شک مجھے اس کی پرستش کرنی چاہئے
لیکن میں ! —— ہاں میں تو تیری پرستش کرنی چاہتا ہوں ۔ پھر کیا کروں ؟ ہاں ہاں اے
میرے پیارے بت تو اس سے بھی زیادہ بلند ہو جا۔ تاکہ اس کی بلندی مجھے تیری یاد دلاتی رہے
اور میں اس کی پرستش کی جانب مائل نہ ہو سکوں۔

دیکھ تیرے رہنے کے لئے کتنا بلند مقام ہے ۔ لیکن کیا تو مجھ سے دور ہو جائے گا ؟
—— نہیں نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ دیکھ میرے تخیل اور میری نگاہوں میں دیکھ ——
تیری اپنی تصویر دیکھ تو ان سے ہرگز نہیں چھپ سکتا ۔

کیا کہا ؟ —— دیکھوں ۔ تیری طرف دیکھوں ؟ تجھ کو دیکھوں ؟ تو کہاں ہے دیکھوں ؟
—— کیوں ۔ کیا میں تجھے نہیں دیکھ سکتا ؟ —— اب نہیں دیکھ سکتا ! کیونکہ تو بہت
حسین و جمیل ہو گیا ہے ۔ میری آنکھیں ! کیا میری آنکھیں اس قابل نہیں ؟ —— لیکن میں
تجھے ان آنکھوں سے کب دیکھوں گا جن سے کہ میں دنیاوی چیزوں کو دیکھتا ہوں۔ میں تو تجھے

ان آنکھوں سے یا ان نظروں سے دیکھوں گا جن میں کہ میں نے تجھے بنایا ہے۔

سن ۔ میں ایک پھول کو دیکھتا ہوں ۔ کتنا حسین پھول ہے ۔ لیکن میں نے تجھ کو اس کا حسن چھین لینے کے لئے کہا تھا۔ پھر تو تو اس سے بھی زیادہ حسین ہوگا ۔ تو نے کہا تھا کہ میں تجھے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دیکھ میں نے ایک پھول کو دیکھ کر تیرے حسن کا اندازہ لگا لیا ——— ہاں ایک چھوٹے سے پھول کو دیکھ کر تجھ جیسی زبردست ہستی کا اندازہ اسی طرح سورج تیری روشنی، آسمان تیری بلندی اور چاند تیرے حسن کا پتہ دے رہا ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ میں تجھے اپنے تخیل اور نظروں میں دیکھتا ہوں ۔ اس تخیل اور نظروں میں جن میں کہ تیری شکل ڈھالی گئی ہے ۔ میں اندھیرے میں اکیلا بیٹھ کر بھی تیری بزرگی ——— روشنی اور خوبصورتی کو دیکھ سکتا ہوں ۔ تو میرے تخیل اور نظروں سے ——— اس تخیل اور نظروں سے ہرگز نہیں چھپ سکتا جن میں کہ میں نے تجھے بنایا ہے ۔ پھر تو نے یہ کیسے کہا کہ میں تجھے نہیں دیکھ سکتا ؟ ۔

آرزو ! ——— تجھے دیکھنے کی آرزو ! میں نے تجھے دیکھنے کی آرزو کب کی ؟ ——— ہاں ہاں کی تھی۔ میں نے ایسی آرزو کی تھی ۔ لیکن وہ تو ان آنکھوں سے دیکھنے کی آرزو تھی جن سے کہ میں تیری قدرت کو دیکھتا ہوں ۔ میں نے ان نظروں اور اس تخیل سے دیکھنے کی آرزو کب کی جن میں کہ میں نے تجھے بنایا ہے ؟

بے شک ——— ہاں ہاں ۔ بے شک میں گر پڑا ۔ کیونکہ میں نے دنیاوی چیزوں کو دیکھتے ہوئے تجھے دیکھنے کی کوشش کی اور تو ان سب سے زیادہ حسین، جمیل، اور روشن ہے ۔ میری نظریں جب تیری قدرت کو دیکھتے ہوئے تیری طرف اُٹھیں تو وہ تیری روشنی اور چمک کی تاب نہ لا سکیں ۔ اگر میں اس وقت آنکھیں بن کر لیتا تو یقیناً تجھے دیکھ سکتا ۔ کیونکہ میں اس وقت ان نظروں کا مالک ہوتا جن میں کہ تو بنا ہے ۔

کیا میں تجھے اب نہیں دیکھ رہا ہوں ؟ ——— اب بھی تو میں تجھ ہی کو دیکھ رہا ہوں ۔ پھر کیوں میں غش نہیں کھاتا ؟

تو میرا خدا ہے ——— یعنی تو نے مجھے بنایا ہے ۔ پھر میں بھی تو تیرا خدا ہوں کیونکہ میں نے بھی تجھے بنایا ہے۔ دیکھ میرے تخیل اور میری نظروں کو دیکھ یہ اب بھی تجھ میں رنگ آمیزی کر رہے ہیں ۔

سید نعیم الدین احمد متعلم سال اوّل (عثمانیہ)

ابھاگن ۔ ؟

کشور گاؤں کے زمیندار کا اکلوتا لڑکا، شہر کی مسموم فضاؤں میں پل کر اور بی ۔ اے کی ڈگری لیکر آیا تو اچھا خاصہ نوجوان تھا ۔ اُس کے مضبوط بازو اور چوڑے چکلے سینہ میں ایک خاص کشش تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ دیہاتی اُبلائیں اُس کو پُرشوق نظروں سے دیکھا کرتیں اور اپنی سہیلیوں سے چپکے چپکے کہتیں " دیکھا کشور بابو کو شہر سے انگریزی پڑھ کر آئے ہیں ۔ بڑا نام پیدا کیا ہے "۔

ان میں سے ایک لاجونتی زمیندار کے منشی کی لڑکی تھی جس کی ماں مر چکی تھی اور باپ بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا ۔ ان دیہاتوں سے الگ، وہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی اور کشور کی دل سے معتقد بھی ۔ وہ دور ہی سے کشور کو دیکھ کر مسکراتی اور من ہی من میں اُس کی پوجا کیا کرتی ۔

کشور نے جب گاؤں کی الھڑ اور صاف دل حسینوں کا میلان اپنی طرف دیکھا تو کسی سے محبت کے وعدے کئے اور کسی کو یہ وچن دیا کہ وہ اُس کو جلد ہی سماجی بندھن میں اپنے ساتھ جکڑ لے گا ۔ اسی طرح سبز باغ دکھاتے ہوئے اُس نے وہ سب کچھ کرنا شروع کیا جو اعلیٰ تعلیم کے اخلاقی مقاصد کے بالکل منافی تھا ۔ اُس کی ہوس اُن کے بھولے پن سے کھیلنے لگی، کئی عورتیں اُس کی حیوانیت کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں، کئی گھر تباہ و برباد ہو چکے تھے ۔ لوگ دیکھتے اور خاموش ہو جاتے ۔ بیچارے کر بھی کیا سکتے تھے ۔ زمینداری کی دھاک بُری ہوتی ہے ۔ کہاں رائی اور کہاں پربت ؟ کہیں بلبل بھی عقاب پر فتح پا سکی ہے ——— ؟

لاجونتی کا باپ بیمار پڑا ۔ بوڑھا آدمی تھا، سردی لگ گئی ۔ لیکن زمیندار کا حکم تھ

"کل ذرا سویرے آنا" ــــ گھر آنے تک بخار زیادہ ہوگیا تھا۔ بڈھا ایسی حالت میں کیا کرسکتا۔ پریشان ہوگیا اور لاجو کو زمیندار کے پاس بھیجا تاکہ وہ زمیندار سے معافی چاہے۔ لاجو واپس ہونے لگی تو اُس نے کشور کو اور کشور نے اُس کو دیکھا، آنکھوں آنکھوں ہی میں کچھ عہد و پیمان ہوئے۔ کشور نے دیکھا کہ تیر ٹھیک نشانہ پر لگا ہے، اُس نے لاجو کو آنے کا اشارہ کیا۔ وہ محبت کی بھوکی تو تھی ہی دونوں کمرہ میں داخل ہوئے۔ صرف ان دونوں کی تیز سانسوں اور دھڑکتے دلوں کی آواز ہی کمرہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرہ سے ایک ہلکے سے نقرئی قہقہہ کی آواز بلند ہوئی ــــ باہر کوئی خوش فکرا "کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ" گاتا ہوا چلا جارہا تھا۔

جب تک پھول میں تازگی اور رس رہتا ہے بھونرے منڈلاتے رہتے ہیں تازگی غائب اور رس ختم ہوجائے تو مکھیاں بھی نہیں بھنبھناتیں ــــ!

یہی حال لاجو کا بھی ہوا، وہ ایک کھلونا تھی مٹی کا، اور ایک ٹکڑا تھی برف کا، جوں ہی دل سیر ہوا کھلونا ٹوٹا، اور جیسے ہی پیاس بجھی برف کی لذت تلخی سے بدل گئی۔

لاجو اب پہلی سی لاجو نہ تھی بلکہ ایک بچہ کی ماں بننے والی تھی۔ لاجو اور کشور کے تعلقات کا چرچہ عام ہوچکا تھا اور شدہ شدہ اُس کے باپ کے کانوں تک بھی پہنچ گیا۔ بڈھا پہلے سے نیم مردہ تھا یہ سنتے ہی اُس کی غرت نے آخری سانس لے کر اپنے آپ کو بے شرم کہلوانے سے محفوظ کرلیا۔ اب لاجو دنیا میں اکیلی تھی وہ جس طرف بھی جاتی لوگ اُس پر آوازیں اور فقرے کستے۔

یعقوب کو اس بارے میں یقین نہ آتا تھا کہ سریش کی شادی ہوچکی ہے لیکن سریش یہ کہتا ہوا آگے بڑھا "تمھیں معلوم ہے یعقوب میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کالج کی صوفیانہ زندگی سے گھبرا گیا تھا اور گاؤں محض اس لئے چلا گیا تھا کہ وہاں کی آزاد اور دیہاتی فضاء میں رہ کر اپنی زندگی گذار دوں ــــ ہاں تو ایک مرتبہ میں حسب معمول سیر کرتا ہوا جنگل میں چل نکلا اور اُس کے گھنے حصہ کو

پار کیا ہی چاہتا تھا کہ مجھے ایک عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ متعجب ہوا کہ ایسے سنسان جنگل میں یہ آواز کیسی۔ آواز کے رخ چلا، مجھے ڈھونڈھنے کی زیادہ زحمت بھی نہ پڑی، میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے کوئی گٹھری سی پڑی ہوئی ہے۔ میں قریب گیا، خط و خال جواب کچھ دھندلے ہورہے تھے، کافی دل کش اور حسین تھے، ــــ وہ عورت تھی، ٹھیٹ عورت، لیکن زمانہ کے ہاتھوں ستائی ہوئی، بے ہوش۔ اُس کی آغوش میں ایک نوزائیدہ بچہ پڑا بلک رہا تھا میں نے بچہ کو اٹھا لیا اور عورت کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگا۔ شکر ہے کہ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ وہ فوراً ہوش میں آئی اور مجھے خوف زدہ نظروں سے گھور گھور کے دیکھنے لگی۔ گویا کہ وہ مرد سے نہ صرف ڈرتی بلکہ اُس کے سایہ سے بھی نفرت کرتی ہے۔ اس لئے میں نے کوشش کی کہ اس کے اس جذبہ کو دور کروں اور شائد اُس کو بھی یقین آگیا کہ میں ان لوگوں سے مختلف ہوں، جیسے وہ سمجھتی ہے۔ میں نے بچہ اُس کو دے دیا اور واپس لوٹا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نگاہوں میں میرے لئے کچھ ترحم بھی ہے۔

میں ہر روز وہاں جاتا اور کچھ نہ کچھ کھانے کی چیزیں اُسے دے آتا۔ وہ شکریہ کے ساتھ قبول کرلیتی۔ اس طرح ایک مہینہ گذر گیا۔ اور اب میں اُسے اُس کی جھونپڑی سے اپنے گھر لایا اور اُس کی کافی دل جوئی کرنے لگا۔

ایک سوال ہوسکتا ہے کہ یہ سب میں کیوں کر رہا تھا، یہ ایک فطری اور معقول سوال ہے لیکن اس کا جواب خود میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا اور نہ شاید لاجو کی سمجھ میں آیا ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہلے تو صرف دیکھتے رہے، پھر شاید مانوس بھی ہونے لگے۔ اس اثنا میں میں اُس سے کافی بے تکلف ہوچکا تھا اور وہ بھی میری کافی ہمدرد۔ چنانچہ میری خواہش پر اُس نے اپنا سارا حال بیان کیا اور رونے لگی۔

بجائے اس کے کہ مجھے اُس سے کچھ بے تعلقی سی ہوتی، ان حالات سے میلان اور

بڑھنے لگا۔ اور شاید یہ ایسا جذبہ تھا، جو کسی لوث پر مبنی نہ تھا، اس لئے لاجو کے دل پر بھی اس کا کافی اثر تھا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی اُس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی البتہ جب میں نے اپنی صداقت کا کافی یقین دلایا، اور غالباً اُس نے مردوں کی فطرت اور اپنی توقع کے خلاف میری زبان سے شادی کا لفظ سُنا تو وہ پہلے یک دم مبہوت سی ہوگئی، لیکن جب اس نے میری آنکھوں میں نظریں گاڑ کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی، اور خود بخود اُس کی گردن جھک گئی ——— ہاں یعقوب ہم خوش بھی ہیں —— !"

" ہماری اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کی موت بالعموم کشور جیسے ہی زردار نوجوانوں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ جو تعلیم کو اپنی جہالت پر پردہ ڈال کر رنگین بنانے کی ضامن سمجھ کر حاصل کرتے ہیں ——— ہمارے ملک کو معاشی مساوات کس دن نصیب ہوگی —— کاش !! —— یعقوب نے مُرلش کو مخاطب کر کے کہا۔

خاموشی چھاگئی۔ دور سے کسی فقیر کی صدا آرہی تھی۔

" عجب زندگی ہے، عجب زندگی ہے "۔

ایس۔ وائی۔ نسیم (عثمانیہ) متعلم سال اوّل

خطبۂ صدارت

عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ کی صدارت میں کرسی نشینی بزم قانون کے موقع پر منتخب صدر بزم قانون ابو المکارم محمد فہیم الدین صاحب بی ایس سی متعلم ال ال بی آخری نے پڑھا۔

اس میں قانون کے طیلسانی کو دوران تعلیم اور بعد ختم تعلیم جو مشکلات پیش آتے ہیں ان پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

" ادارہ "

عالی جناب نواب معین امیر جامعہ پروفیسر حضرات و عزیز بھائیو۔

طلبائے قانون نے مجھ ناچیز کو اپنی انجمن کا صدر منتخب کر کے جو عزت افزائی فرمائی میں اس کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میرا یہ شکریہ محض رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی عزت ہے جو میرے ساتھی اپنے ایک بھائی کو عطا کر سکتے ہیں۔

صدر محترم۔ خطبہ ہائے صدارت سُننے کا مجھے اکثر موقع ملا ہے۔ ایک چیز جو اس قسم کے خطبوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ وعدوں کی بہتات ہے میں نے اس عام اصول سے کسی قدر ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے اور بجائے اس کے کہ آپ کو کبھی پورے نہ ہونے والے وعدوں کی ایک طویل فہرست سنا دیتا میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ سب حضرات کے لئے سنجیدہ غور و فکر کا کچھ سامان پیدا کر دوں۔

آج کل تعلیم یافتہ بیروزگاری کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو چکا ہے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سب سے نازک اور پریشان کن مسئلہ اپنی روٹی خود کمانے کا ہے۔ ملک کے عام حالات

بڑھنے لگا۔ اور شاید یہ ایسا جذبہ تھا، جو کسی لوث پر مبنی نہ تھا، اس لئے لاجو کے دل پر بھی اس کا کافی اثر تھا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی اُس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی البتہ جب میں نے اپنی صداقت کا کافی یقین دلایا، اور غالباً اُس نے مردوں کی فطرت اور اپنی توقع کے خلاف میری زبان سے شادی کا لفظ سُنا تو وہ پہلے یک دم مبہوت سی ہو گئی، لیکن جب اس نے میری آنکھوں میں نظریں گاڑ کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی، اور خود بخود اُس کی گردن جھک گئی —— ہاں یعقوب ہم خوش بھی ہیں —— !"

"ہماری اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کی موت بالعموم کشور جیسے ہی زردار نوجوانوں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ جو تعلیم کو اپنی جہالت پر پردہ ڈال کر زنگین بنانے کی ضامن سمجھ کر حاصل کرتے ہیں —— ہمارے ملک کو معاشی مساوات کس دن نصیب ہوگی —— کاش !! —— یعقوب نے سُریش کو مخاطب کر کے کہا۔

خاموشی چھاگئی۔ دور سے کسی فقیر کی صدا آرہی تھی۔

"عجب زندگی ہے، عجب زندگی ہے"۔

ایس۔ وائی۔ نسیم (عثمانیہ) متعلم سال اوّل

خطبۂ صدارت

عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ کی صدارت میں کرسی نشینی بزم قانون کے موقع پر منتخب صدر بزم قانون ابو المکارم محمد فہیم الدین صاحب بی ایس سی متعلم ال ال بی آخری نے پڑھا۔

اس میں قانون کے طیلسانی کو دوران تعلیم اور بعد ختم تعلیم جو مشکلات پیش آتے ہیں ان پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

"ادارہ"

عالی جناب نواب معین امیر جامعہ پروفیسر حضرات و عزیز بھائیو۔

طلبائے قانون نے مجھ ناچیز کو اپنی انجمن کا صدر منتخب کر کے جو عزت افزائی فرمائی میں اس کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میرا یہ شکر یہ محض رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی عزت ہے جو میرے ساتھی اپنے ایک بھائی کو عطا کر سکتے ہیں۔

صدر محترم۔ خطبہ ہائے صدارت سُننے کا مجھے اکثر موقع ملا ہے۔ ایک چیز جو اس قسم کے خطبوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ وعدوں کی بہتات ہے میں نے اس عام اصول سے کسی قدر ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے اور بجائے اس کے کہ آپ کو کبھی پورے نہ ہونے والے وعدوں کی ایک طویل فہرست سنا دیتا میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ سب حضرات کے لئے سنجیدہ غور و فکر کا کچھ سامان پیدا کر دوں۔

آج کل تعلیم یافتہ بیروزگاری کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو چکا ہے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سب سے نازک اور پریشان کن مسئلہ اپنی روٹی خود کمانے کا ہے۔ ملک کے عام حالات

بڑھنے لگا۔ اور شاید یہ ایسا جذبہ تھا، جو کسی لوث پر مبنی نہ تھا، اس لئے للّٰجو کے دل پر بھی اس کا کافی اثر تھا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی اُس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی البتہ جب میں نے اپنی صداقت کا کافی یقین دلایا، اور غالباً اُس نے مردوں کی فطرت اور اپنی توقع کے خلاف میری زبان سے شادی کا لفظ سُنا تو وہ پہلے یک دم مبہوت سی ہوگئی، لیکن جب اس نے میری آنکھوں میں نظریں گاڑ کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی، اور خود بخود اُس کی گردن جھک گئی ——— ہاں یعقوب ہم خوش بھی ہیں —— !"

"ہماری اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کی موت بالعموم کشور جیسے ہی زردار نوجوانوں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ جو تعلیم کو اپنی جہالت پر پردہ ڈال کر رنگین بنانے کی ضامن سمجھ کر حاصل کرتے ہیں ——— ہمارے ملک کو معاشی مساوات کس دن نصیب ہوگی —— کاش !! —— یعقوب نے سُریش کو مخاطب کر کے کہا۔

خاموشی چھاگئی۔ دور سے کسی فقیر کی صدا آرہی تھی۔

"عجب زندگی ہے، عجب زندگی ہے"۔

ایس۔ وائی۔ نسیم (عثمانیہ) متعلم سال اوّل

خطبۂ صدارت

عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ کی صدارت میں کرسی نشینی بزم قانون کے موقع پر منتخب صدر بزم قانون ابو المکارم محمد فہیم الدین صاحب بی یس سی متعلم ال ال بی آخری نے پڑھا۔

اس میں قانون کے طیلسانی کو دوران تعلیم اور بعد ختم تعلیم جو مشکلات پیش آتے ہیں ان پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

"ادارہ"

عالی جناب نواب معین امیر جامعہ پروفیسر حضرات و عزیز بھائیو۔

طلبائے قانون نے مجھ ناچیز کو اپنی انجمن کا صدر منتخب کر کے جو عزت افزائی فرمائی میں اس کا تہ دل سے شکرگذار ہوں۔ میرا یہ شکریہ محض رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی عزت ہے جو میرے ساتھی اپنے ایک بھائی کو عطا کر سکتے ہیں۔

صدر محترم۔ خطبہ ہائے صدارت سُننے کا مجھے اکثر موقع ملا ہے۔ ایک چیز جو اس قسم کے خطبوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ وعدوں کی بہتات ہے میں نے اس عام اصول سے کسی قدر ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے اور بجائے اس کے کہ آپ کو کبھی پورے نہ ہونے والے وعدوں کی ایک طویل فہرست سنا دیتا میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ سب حضرات کے لئے سنجیدہ غور و فکر کا کچھ سامان پیدا کردوں۔

آج کل تعلیم یافتہ بیروزگاری کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو چکا ہے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سب سے نازک اور پریشان کن مسئلہ اپنی روٹی خود کمانے کا ہے۔ ملک کے عام حالات

بڑھنے لگا۔ اور شاید یہ ایسا جذبہ تھا، جو کسی لوث پر مبنی نہ تھا، اس لئے للّاجو کے دل پر بھی اس کا کافی اثر تھا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی اُس نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی البتہ جب میں نے اپنی صداقت کا کافی یقین دلایا، اور غالباً اُس نے مردوں کی فطرت اور اپنی توقع کے خلاف میری زبان سے شادی کا لفظ سُنا تو وہ پہلے یک دم مبہوت سی ہو گئی، لیکن جب اس نے میری آنکھوں میں نظریں گاڑ کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی، اور خود بخود اُس کی گردن جھک گئی —— ہاں یعقوب ہم خوش بھی ہیں —— !"

"ہماری اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کی موت بالعموم کشور جیسے ہی زر دار نوجوانوں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ جو تعلیم کو اپنی جہالت پر پردہ ڈال کر رنگین بنانے کی ضامن سمجھ کر حاصل کرتے ہیں —— ہمارے ملک کو معاشی مساوات کس دن نصیب ہوگی —— کاش !! —— یعقوب نے سُریش کو مخاطب کر کے کہا۔

خاموشی چھا گئی۔ دور سے کسی فقیر کی صدا آرہی تھی۔

"عجب زندگی ہے، عجب زندگی ہے"۔

ایس۔ وائی۔ نسیم (عثمانیہ) متعلم سال اوّل

خطبۂ صدارت

عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ کی صدارت میں کرسی نشینی بزم قانون کے موقع پر منتخب صدر بزم قانون ابوالمکارم محمد فہیم الدین صاحب بی ایس سی متعلم ال ال بی آخری نے پڑھا۔

اس میں قانون کے طیلسانی کو دوران تعلیم اور بعد ختم تعلیم جو مشکلات پیش آتے ہیں ان پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

"ادارہ"

عالی جناب نواب معین امیر جامعہ پروفیسر حضرات و عزیز بھائیو۔

طلبائے قانون نے مجھ ناچیز کو اپنی انجمن کا صدر منتخب کر کے جو عزت افزائی فرمائی میں اس کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میرا یہ شکریہ محض رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی عزت ہے جو میرے ساتھی اپنے ایک بھائی کو عطا کر سکتے ہیں۔

صدر محترم۔ خطبہ ہائے صدارت سُننے کا مجھے اکثر موقع ملا ہے۔ ایک چیز جو اس قسم کے خطبوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ وعدوں کی بہتات ہے میں نے اس عام اصول سے کسی قدر ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے اور بجائے اس کے کہ آپ کو کبھی پورے نہ ہونے والے وعدوں کی ایک طویل فہرست سنا دیتا میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ سب حضرات کے لئے سنجیدہ غور و فکر کا کچھ سامان پیدا کر دوں۔

آج کل تعلیم یافتہ بیروزگاری کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو چکا ہے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سب سے نازک اور پریشان کن مسئلہ اپنی روٹی خود کمانے کا ہے۔ ملک کے عام حالات

ایسے ہیں کہ تقریباً تمام کے تمام فارغ التحصیل اشخاص ملازمتوں کی طرف جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ادبی ڈگریاں رکھنے والے بھی اتنے لاچار ہیں جتنے کہ فنی ڈگری رکھنے والے صرف ال ال بی کی تعلیم حاصل کرنے والے ہی ایسے ہو سکتے ہیں جو حکومت کو ملازمت کے لئے پریشان نہ کریں لیکن عام کساد بازاری اکثر سینیر وکلا کی سرد مہری اور حیدرآباد کے بعض مخصوص حالات ان چند کو بھی اتنا پریشان کر دیتے ہیں کہ ہمت نہ ہارنا واقعی بڑے دل گردہ کا کام ہے ۔

حضرات ۔ ایک زمانہ تھا جب ہماری جامعہ تجربہ کے دور سے گذر رہی تھی ۔ عرصہ ہوا وہ زمانہ ختم ہو گیا اب ہم دوسروں کے لئے ایک مثال ہیں لیکن وہ لوگ جو ذہنی غلامی میں اب بھی مبتلا ہیں ہماری ڈگریوں کو مسلمہ ڈگریاں قرار نہیں دیتے باوجودیکہ ہر سال بیرونی ممتحن صاحبان عمدہ سے عمدہ رائے ظاہر کرتے ہیں بدقسمتی سے ہماری ال ۔ ال بی کی ڈگری بیرون حیدرآباد مسلمہ نہیں ہے ۔ باوجود ایسی صورت میں ہمارے ال ال بی کے لئے بجز اس کے کہ صرف حیدرآباد میں وکالت کرے کوئی اور وسیع تر میدان باقی نہیں رہتا اور جو کچھ میدان میسر ہو سکتا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے کسی کے لئے کوئی روک نہیں ۔ غیر کے پاس تو ہم دھتکارے جائیں اور اپنوں کے پاس اتنا ہمارا خیال ہو جتنا کہ کوئی ٹمبکٹو کے پاس شدہ شخص کا نہ صرف ہماری کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہمارے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا جاتا ہمارے لئے کوئی مراعات نہیں بلکہ آپ کو سن کر شائد افسوس اور تعجب ہوگا کہ ہمارا ملک بھی ہماری بے عزتی کرتا ہے ۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس طرح ہمیں بیرون حیدرآباد وکالت کا حق حاصل نہیں اس طرح دوسروں کو حیدرآباد میں وکالت کرنے کا حق حاصل نہ ہوتا یہ تو بڑی دور کی بات ہے ہمارے ہی ملک میں ہماری توہین یوں کی جاتی ہے کہ عدالت العالیہ میں غیر عثمانی کے لئے اجازت نامہ وکالت کی فیس ۵۰ ہو تو ایک عثمانی کے لئے ۵۵۰ قرار پاتی ہے گویا یہ تاوان ہے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پانے کا جو ہم ادا کرتے ہیں ۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل کے لئے عدالت میں اردو دانی کا صداقت نامہ پیش کرنا لازم ہے اس ستم ظریفی پر ہم صرف مسکرا دینے پر اکتفا کرتے ہیں

یہ تو ال ال بی کی تعلیم سے فراغت کے بعد کا ذکر ہے اب ذرا قبل فراغت کی حالت سن لیجئے یہاں بھی ہم اچھوت ہیں اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا جرم کر رہے ہیں ہماری فیس معاف نہیں ہو سکتی ہمیں وظائف نہیں مل سکتے دوسرے فنی امتحانات مثلاً انجینرنگ اور ڈاکٹری میں کامیاب ہونے پر ملازمتیں مل جاتی ہیں یہاں سب کچھ تو کجا امتیازات سے کامیاب ہونے والوں کو بھی کوئی پلٹ کر دیکھتے نہیں خطا صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ قانون کے طالب علم ہیں ۔ صدر محترم مجھے یقین ہے کہ بہ حیثیت معین امیر جامعہ جناب والا ان امور پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے سنا ہے کہ اب سے بہت قبل ان امور پر غور ہو کر ہمارے موافق فیصلہ ہو چکا ہے ۔ لیکن عمل در آمد کیوں نہیں ہوتا اور یہ منظوری کہاں دب کر رہ گئی یہ گویا ایک راز ہے میں ایک مرتبہ اور شدت سے جناب والا کی توجہ ان امور پر منعطف کرانے کی جرائت کرتا ہوں ۔

صدر محترم اس سلسلے میں درسوں کے اوقات کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے ۔ ایک طرف تو جامعہ میں ہمیں کوئی سہولت اور مراعات حاصل نہیں ۔ اور دوسری طرف دس تا ایک کی حاضری ہم پر لازم ہے اس طرح ہمیں اس قابل بھی نہیں رکھا جاتا کہ ہم کوئی دوسرے ذرائع سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر سکیں چند سال قبل تک قانون کی جماعتوں کے اوقات ساڑھے سات ساعت صبح تا دس ساعت صبح تھے ۔ دس کے بعد طالب علموں کو فرصت رہتی اور وہ یا تو عدالتوں میں اس نظری تعلیم کو عملی طور پر صورت گیر ہوتا دیکھ سکتے یا کسی اور طور پر مشغول رہتے چند نامعلوم اسباب کی بنا پر دس تا ایک کی حاضری کو لازم کر دیا گیا ۔ یقیناً یہ اچھا سمجھ کر کیا گیا ہوگا شائد یہ تصور کیا گیا ہوگا کہ طالب علموں کو علمی ماحول نصیب ہونا چاہئے لیکن ہمارے بزرگ ارباب جامعہ نے ایک نہایت ہی اہم نقطہ بھلا دیا اور وہ یہ کہ فنی تعلیم حاصل کرنے والوں کو علمی سے زیادہ عملی ماحول کی ضرورت ہے ال ال بی کے طالب علم کتب خانوں میں ضخیم سے ضخیم کتابیں پڑھ کر اتنا ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جتنا کہ وہ اس علم کو عدالتوں میں عملی طور پر استعمال ہوتا دیکھ کر حاصل کر سکتے ہیں ۔

صدر محترم آپ سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں کہ ہندوستان کی اکثر جامعات میں ایم ۔ اے اور

ایسے ہیں کہ تقریباً تمام کے تمام فارغ التحصیل اشخاص ملازمتوں کی طرف جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ادبی ڈگریاں رکھنے والے بھی اتنے لاچار ہیں جتنے کہ فنی ڈگری رکھنے والے صرف ال ال بی کی تعلیم حاصل کرنے والے ہی ایسے ہو سکتے ہیں جو حکومت کو ملازمت کے لئے پریشان نہ کریں لیکن عام کساد بازاری اکثر سینیر وکلا کی سرد مہری اور حیدرآباد کے بعض مخصوص حالات ان چند کو بھی اتنا پریشان کر دیتے ہیں کہ ہمت نہ ہارنا واقعی بڑے دل گردہ کا کام ہے ۔

حضرات ۔ ایک زمانہ تھا جب ہماری جامعہ تجربہ کے دور سے گذر رہی تھی ۔ عرصہ ہوا وہ زمانہ ختم ہو گیا اب ہم دوسروں کے لئے ایک مثال ہیں لیکن وہ لوگ جو ذہنی غلامی میں اب بھی مبتلا ہیں ہماری ڈگریوں کو مسلمہ ڈگریاں قرار نہیں دیتے باوجودیکہ ہر سال بیرونی ممتحن صاحبان عمدہ سے عمدہ رائے ظاہر کرتے ہیں بد قسمتی سے ہماری ال ۔ ال بی کی ڈگری بیرون حیدرآباد مسلمہ نہیں ہے ۔ باوجود ایسی صورت میں ہمارے ال ال بی کے لئے بجز اس کے کہ صرف حیدرآباد میں وکالت کرلے کوئی اور وسیع تر میدان باقی نہیں رہتا اور جو کچھ میدان میسر ہو سکتا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے کسی کے لئے کوئی روک نہیں ۔ غیر کے پاس تو ہم دھتکارے جائیں اور اپنوں کے پاس اتنا ہمارا خیال ہو جتنا کہ کوئی ٹمبکٹو کے پاس شدہ شخص کا نہ صرف ہماری کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہمارے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا جاتا ہمارے لئے کوئی مراعات نہیں بلکہ آپ کو سن کر شائد افسوس اور تعجب ہوگا کہ ہمارا ملک بھی ہماری بے عزتی کرتا ہے ۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس طرح ہمیں بیرون حیدرآباد وکالت کا حق حاصل نہیں اس طرح دوسروں کو حیدرآباد میں وکالت کرنے کا حق حاصل نہ ہوتا یہ تو بڑی دور کی بات ہے ہمارے ہی ملک میں ہماری توہین یوں کی جاتی ہے کہ عدالت العالیہ میں غیر عثمانی کے لئے اجازت نامہ وکالت کی فیس ۵۰ ہو تو ایک عثمانی کے لئے ۵۵۰ قرار پاتی ہے گویا یہ تاوان ہے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پانے کا جو ہم ادا کرتے ہیں ۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل کے لئے عدالت میں اردو دانی کا صداقت نامہ پیش کرنا لازم ہے اس ستم ظریفی پر ہم صرف مسکرا دینے پر اکتفا کرتے ہیں

یہ تو ال ال بی کی تعلیم سے فراغت کے بعد کا ذکر ہے اب ذرا قبل فراغت کی حالت سن لیجئے یہاں بھی ہم اچھوت ہیں اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا جرم کر رہے ہیں ہماری فیس معاف نہیں ہو سکتی ہمیں وظائف نہیں مل سکتے دوسرے فنی امتحانات مثلاً انجینرنگ اور ڈاکٹری میں کامیاب ہونے پر ملازمتیں مل جاتی ہیں یہاں سب کچھ تو کجا امتیازات سے کامیاب ہونے والوں کو بھی کوئی پلیٹ کر دیکھتے نہیں خطا صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ قانون کے طالب علم ہیں ۔ صدر محترم مجھے یقین ہے کہ بہ حیثیت معین امیر جامعہ جناب والا ان امور پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے سنا ہے کہ اب سے بہت قبل ان امور پر غور ہو کر ہمارے موافق فیصلہ ہو چکا ہے ۔ لیکن عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا اور یہ منظوری کہاں دب کر رہ گئی یہ گویا ایک راز ہے میں ایک مرتبہ اور شدت سے جناب والا کی توجہ ان امور پر منعطف کرانے کی جرائت کرتا ہوں ۔

صدر محترم اس سلسلے میں درسوں کے اوقات کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے ۔ ایک طرف تو جامعہ میں ہمیں کوئی سہولت اور مراعات حاصل نہیں ۔ اور دوسری طرف دس تا ایک کی حاضری ہم پر لازم ہے اس طرح ہمیں اس قابل بھی نہیں رکھا جاتا کہ ہم کوئی دوسرے ذرائع سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر سکیں چند سال قبل تک قانون کی جماعتوں کے اوقات ساڑھے سات ساعت صبح تا دس ساعت صبح تھے ۔ دس کے بعد طالب علموں کو فرصت رہتی اور وہ یا تو عدالتوں میں اس نظری تعلیم کو عملی طور پر صورت گیر ہوتا دیکھ سکتے یا کسی اور طور پر مشغول رہتے چند نا معلوم اسباب کی بنا پر دس تا ایک کی حاضری کو لازم کر دیا گیا ۔ یقیناً یہ اچھا سمجھ کر کیا گیا ہوگا شائد یہ تصور کیا گیا ہوگا کہ طالب علموں کو علمی ماحول نصیب ہونا چاہئے لیکن ہمارے بزرگ ارباب جامعہ نے ایک نہایت ہی اہم نقطہ بھلا دیا اور وہ یہ کہ فنی تعلیم حاصل کرنے والوں کو علمی سے زیادہ عملی ماحول کی ضرورت ہے ال ال بی کے طالب علم کتب خانوں میں ضخیم سے ضخیم کتابیں پڑھ کر اتنا ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جتنا کہ وہ اس علم کو عدالتوں میں عملی طور پر استعمال ہوتا دیکھ کر حاصل کر سکتے ہیں ۔

صدر محترم آپ سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں کہ ہندوستان کی اکثر جامعات میں ایم ۔ اے اور

ال ال بی کی تعلیم ساتھ ساتھ حاصل کی جاسکتی ہے سنا ہے کہ یہ طریقہ یہاں بھی رائج تھا لیکن بعد میں چند نامعلوم اسباب کی بنا پر اس سہولت کو بھی ختم کردیا گیا ۔ کیا غضب ہے بجلی گرتی ہے تو بیچارے ہم قانون کے طالب علموں پر ضرورت تو اس بات کی ہے کہ قانون کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور کوئی شہری بھی اس سے محروم نہ رہے یہاں معاملہ ذرا برعکس نظر آتا ہے ۔ معافی فیس اور وظائف کی عدم اجرائی اوقات درس کی غیر مناسبت ۔ ایم ۔ اے اور ال ال بی کی تعلیم کا ساتھ نہ ہونا اس تعلیم پر ایک زبردست تحدید عائد کردیتا ہے جو محسوس تو ہوتی ہے لیکن ظاہر نہیں ہوسکتی ۔

حضرات ۔ حال میں یونیورسٹی سینٹ میں ایک تحریک پیش ہوئی تھی کہ قانون کی تعلیم ڈگری کلاس کے بعد شروع ہونے کے بجائے انٹرمیڈیٹ کے بعد سے شروع ہوجائے اور کورس بجائے دو سال کے سہ سالہ ہو تحریک کئی طرح سے بہت موزوں ہے ۔

اکثر فنی تعلیم انٹرمیڈیٹ کے بعد شروع ہوجاتی ہے اور موجودہ ال ال بی کی جماعتوں میں بہت بڑا نقص یہ ہے کہ طالب علموں کو عملی تجربہ حاصل نہیں ہوسکتا یوں بھی اگر طالب علم قانون دو سال کے بجائے تین سال پڑھتے تو ان کو اپنے فن کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتیں یہ تحریک اس قابل ہے کہ اس کو دوبارہ پیش کیا جائے ۔

حضرات ۔ آخر میں مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ شعبۂ قانون کے تمام اساتذہ اور بالخصوص شفیق صدر شعبہ طلبار کے ہمدرد اور ان سے اس قدر نزدیک ہیں کہ آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں اور سب ایک ہی خاندان کے سرور اراکین معلوم ہوتے ہیں ہمارے دلوں میں انکی شفقتوں کا احساس ہے کسی قسم کا شکریہ ادا کرنا یقیناً ان کے خلوص کی توہین ہوگی اس لئے بہتر ہے کہ زبان شکر خاموش ہی رہے ۔

حضرات ۔ میں اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارا واحد مطمح نظر ملک کی بے غرض خدمت تعمیری کام کیلئے پیہم کوشش ہے انشاءاللہ ہم اپنے کو اس کامل اعتماد کا مستحق ثابت کردکھائیں گے جو عثمانیہ کے نام کے ساتھ وابستہ ہے ۔

حضرات ۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایسے بیدار مغز رعایا پرور روشن تدبیر بادشاہ ذیجاہ کے سایہ عاطفت میں ہیں جنکی حکمت و سیاست اور علم و فضل ضرب المثل ہے دعا ہے کہ خداوند قدوس جلالۃ الملک اعلیحضرت سلطان العلوم اور خانوادۂ آصفیہ کا سایہ ہما پایا ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے ۔ آمین یا رب ۔

خطبۂ صدارت

کرسی نشینی بزم دینیات کے موقع پر عالیجناب آنریبل سید عبدالعزیز صدر المہام بہادر عدالت و امور مذہبی کی صدارت میں بزم دینیات کے منتخب صدر مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفری بی۔ اے متعلم ام۔ اے (آخری) نے پڑھا جس میں علاوہ دیگر امور کے شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کی اہمیت پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ادارہ)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسّلام علیٰ سیّد الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

صدر والاقدر عالی جناب صدر المہام بہادر عدالت و مذہبی، جناب نائب معین امیر جامعہ، معزز مہمان، حضرات اساتذہ کرام و برادران جامعہ!

قبل اس کے کہ اپنے خطبہ کو شروع کروں میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ جمیع برادران شعبہ کا بصمیم قلب شکریہ ادا کروں جنھوں نے گذشتہ سنین میں مجھ کو بحیثیت معتمد، و نائب صدر، بزم کی خدمت کرنے کا موقع دیا اور سال حال بالاتفاق صدارت کی عظیم ترین ذمہ داری مجھ پر عائد کرکے بزم کی خدمت کا ایک اور موقع عطا فرمایا۔

حضرات! عموماً ہر صدر اپنے خطبۂ صدارت میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتا ہے اور ایک طویل فہرست اپنے پروگرام کی بھی سنا دیتا ہے تاکہ اس موقع پر سب حضرات اس کے نیک اور بلند عزائم سے مطلع ہو جائیں لیکن آپ معاف فرمائیں میں اس سال اس روایت کی عمداً خلاف ورزی کرنا چاہتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ میں یہ کروں گا وہ کروں گا اس قسم کے بلند و بالا دعوی کرکے آپ کا عزیز وقت ضائع کروں اگر خدا توفیق اور موقعہ عطا فرمائے تو انشاء اللہ آئندہ سال یہ کہنے کے قابل ہوں گا کہ حق تعالیٰ کی تائید اور اپنے رفقاء کار کی معاونت سے میں نے یہ یہ امور انجام دئے۔

حضرات! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر شعبۂ دینیات کی اہمیت اور طلبہ شعبہ دینیات کی

Mr. FAHEEMUDDIN, B. Sc. (Osmania)
President, Law Union.
Last year had a unique honour of being awarded a gold watch by H. H. the Prince of Berar, for his managing capacity.

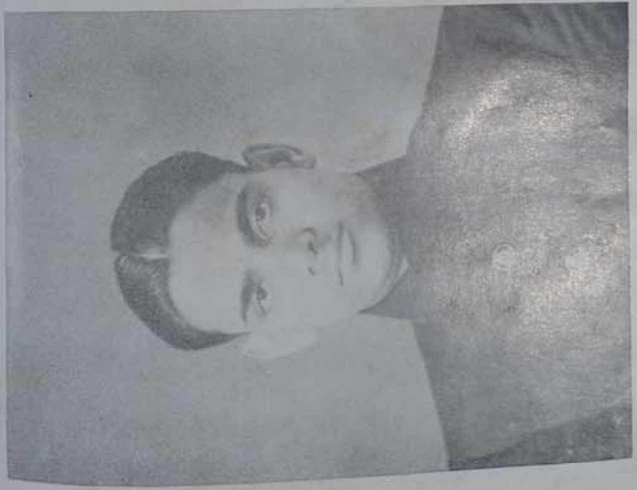

Mr. SYED ABDUR RAZZAQ QADRI
B. A. (Osmania)
Vice President, Students Union.
President Theology Association.

AZAM STEAM PRESS.

ہمہ جہتی مناسبتوں وقابلیتوں کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔

جامعہ عثمانیہ میں طلبۂ دینیات کی یہ مختصر جماعت ان طلبہ کے مقابلہ میں ہے جو دوسرے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت اب قابل اظہار نہیں رہی ہے کہ قلت اور کثرت کے سوال کو اسلام نے قطعی طور پر ناقابل لحاظ قرار دیا ہے بلکہ بعض اوقات کثرت کو مضر تبلایا ہے چنانچہ جنگ حنین کی شکست کو قرآن مجید میں اذا عجبتکم کثرتکم کے الفاظ میں اسی کثرت کے ناز کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ یوں بھی بفضلہ شعبۂ فنون کے بعض شعبہ جات کے طلبہ سے ہماری تعداد کسی طرح کم نہیں ہے اور گذشتہ چند سالوں سے تو مسلسل اضافہ ہو رہا ہے البتہ سال حال اقامت خانہ کے لزوم کی وجہ سے مالی مشکلات کی مجبوریوں نے جونیر انٹرمیڈیٹ میں کافی طلبہ کے شریک ہونے سے گونہ محروم رکھا۔

بزم دینیات کے متعلق صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ بجز انجمن اتحاد کے بزم دینیات جامعہ کی سب سے قدیم انجمن ہے اور اس شعبہ کے طلبہ متعدد مواقع پر اپنی بے نظیر قابلیتوں کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرتے چلے آرہے ہیں مثلاً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جو ہمارے شعبہ کے ایک مایۂ ناز فرزند ہیں اس وقت جامعہ کے ممتاز اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حال ہی میں آپ کو کیمبرج اور پیرس کی جامعات نے توسیعی لکچر دینے کے لئے مدعو کیا تھا اور آپ نے ان جامعات کی دعوت پر یورپ تشریف لے جاکر اُن کو اپنے زرین خیالات سے مستفید فرمایا۔ جناب قاری قطب الدین صاحب جو اس وقت ہماری جامعہ کے ریڈر ہیں شعبہ دینیات ہی کے طالب علم تھے آپ نے نہ صرف اس جامعہ ہی میں ممتاز کامیابیاں حاصل کی بلکہ جامعہ مصر میں بھی اول رہے۔

مولوی عبدالقادر صاحب ام۔ اے اس وقت علم کلام کے لکچرار ہیں جن کا علمی شغف اور علوم اسلامیہ سے دلچسپی محتاج ذکر نہیں ہے یہ ہستیاں شعبۂ دینیات کے لئے باعث فخر ہیں۔

اس شعبہ کے طلبہ نہ صرف اعلیٰ قابلیت کے اساتذہ ثابت ہوئے بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کامیاب رہے چنانچہ یحییٰ صاحب چند سال قبل حیدرآباد سیول سرویس کے لئے منتخب کئے گئے۔ بعض عدالت کی ذمہ دار خدمت منصفی پر کارگزار ہیں۔ بعض نہایت کامیابی کے ساتھ پیشہ وکالت

انجام دے رہے ہیں۔

اب میں بطور خاص برادران شعبہ دینیات کی خدمت میں چند جملے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

برادران عزیز! اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اپنی بنیاد " اقراء باسم ربک الذی خلق" پر رکھی اقراء (پڑھو) کی آواز سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے بعد درس وتدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ بحمد اللہ اب تک باقی ہے اسلام سے قبل ہر ملک وقوم میں ایک مخصوص طبقہ ہوتا تو تھا جو تعلیم حاصل کرتا تھا۔ جس مذہب نے اپنی بنیاد قرأت ہی پر رکھی ہو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس میں تعلیم کی کس قدر اہمیت ہے اس اہمیت کی ایک مثال یہ ہے کہ جنگ بدر میں جو ۲ ہجری میں ہوئی قریش کے جنگی قیدی جب حضور کی خدمت میں پیش کئے گئے تو ان قیدیوں کو جہاں دوسری چیزوں کا فدیہ لے کر رہا کیا گیا تھا ان میں فدیہ کی غالباً جنگ کی تاریخ میں یہ پہلی نظیر تھی کہ حضور نے حکم صادر فرمایا کہ ان میں کا ہر شخص دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے حضرت زید بن ثابت جو کاتب وحی تھے اسی طرح تعلیم حاصل کئے۔ اس وقت قرآن کے ہزارہا جو نسخے دنیا میں پائے جاتے ہیں ان ہی کے قلم کے رہین منت ہیں کہ عہد صدیقی میں حکومت کے حکم سے انہوں نے قرآن کا کامل نسخہ تیار کیا اور عہد عثمانی میں اشاعت قرآن کا وہ سررشتہ ان ہی کی نگرانی میں قائم ہوا تھا جس کے تمام صوبوں میں قرآن کے نسخے تقسیم کئے گئے۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی تعلیم ہے جو انسان کو انسانیت کے بلند مراتب تک پہنچادے اور اُس کی زندگی کے ہر شعبہ میں مشعل راہ ثابت ہو۔ اگر غور کیا جائے تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان علوم وفنون کے مقابلہ میں جو خود انسان سے نہیں بلکہ انسانوں کی ضرورتوں سے بحث کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں جس علم نے اپنا براہ راست موضوع خود انسان کو بنایا ہے، اور انسانیت کی بلندی وپستی سے بحث کرتا ہے وہ صرف دین ہی کا علم ہے اسی لئے اس کا حصول انسانیت کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے مثال کے طور پر اگر آپ غور کریں کہ (۱) مالک حقیقی یعنی خدا تعالیٰ کے منشا کی تکمیل کے لئے کونسی تعلیم کی ضرورت ہے (۲) مالک مجازی یعنی بادشاہ اسلام اور ان کی رعایا کے درمیان وفاداری خیر سگالی کے صادق جذبات جو کسی یقین کی بنا پر قائم ہوں کون پیدا کر سکتا ہے۔

(۳) کون ملک کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے (۴) کون عالم انسانیت کی خدمت کر سکتا ہے فانی ہونے سے بچا کر ان کی بقائے دوام کی صورتیں نکالتا ہے ظاہر ہے کہ مذہب اور مذہبی علوم کے سوا اس کا جواب اور کیا دیا جا سکتا ہے علاوہ اس کے چونکہ تمام اسلامی ائمہ و مفکرین کے نظریات و افکار کی تعلیم آپ عربی زبان میں حاصل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ بی۔ اے تک عربی ادب کی تعلیم بھی شعبۂ فنون کے عربی کے طلبہ کے ساتھ آپ کو دی جاتی ہے اس لئے مشرقی علوم کا دروازہ آپ کے لئے کھل جاتا ہے ۔ اور ہزار بارہ سو سال کا وہ علمی اندوختہ جو بغداد، دمشق، کوفہ، بصرہ، غرناطہ، قرطبہ، قاہرہ، ایشیا، اور افریقہ بلکہ یورپ کے مختلف شہروں میں بے شمار دماغوں کے غور و فکر نے بطور ترکہ کے آپ کے لئے چھوڑا ہے ۔ ان سب پر آپ کا قبضہ ہو جاتا ہے ۔ پھر یوں ہی بی۔ اے تک چونکہ انگریزی بھی شعبۂ فنون کے طلبہ کے ساتھ ہی ان ماہر اساتذہ سے پڑھتے ہیں جن کا میسر آنا ہر تعلیم گاہ میں ممکن نہیں اس لئے مغربی علوم و فنون کے مطالعہ کی راہیں آپ پر وا ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حیرت انگیز عدیم النظیر جامعیت کی بنیادوں پر علم کی جو خدمت آپ انجام دے سکتے ہیں اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عالم اسلام اور اپنے وطن کی سیاسی خدمت گذاریوں کے مواقع مختلف وجوہ کی بنا پر آپ کو حاصل ہیں دوسروں سے اس کی توقع بآسانی نہیں کی جا سکتی۔ ملک کے عام باشندوں کا جتنا اعتماد آپ حاصل کر سکتے ہیں خود ہی اندازہ کیجئے کہ اس قسم کے امکانات دوسروں کے لئے کیا ممکن ہیں۔ اس شعبہ کے طلبہ میں بظاہر احساس کمتری کے جذبات کی جو شکایت کی جاتی ہے اُس کی وجہ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ اُن کو خود اُن کی حقیقی قدر و قیمت سے واقف نہیں کیا گیا ہے ۔ عام طور پر کچھ ایسی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اس شعبہ کے طلبہ بھی گویا اُن عام عربی مدارس کے طلبہ کی طرح ہیں جن کو پُرانے طریقہ سے پُرانی فضا میں بغیر انگریزی زبان کے اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ آپ خود اپنی قدر و قیمت کو نہیں جانتے اپنے مقام کو نہیں پہچانتے آپ کو اپنے نصب العین کو درست کرنا چاہئے ۔ علم و عمل کے کھلے میدان آپ کے سامنے ہیں۔ جس تعلیم کا سنگم آپ کے لئے حضرت اقدس و اعلیٰ کی علم پروری کی وجہ جامعہ عثمانیہ میں قائم کیا گیا ہے دنیا اس کی نظیر مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہے ۔ صرف ہندوستان نہیں بلکہ

دوسرے اسلامی ممالک افغانستان، ایران، ترکی حتیٰ کے مصر تک میں بھی اتنی اعلیٰ انگریزی کے ساتھ اسلامی علوم کی تعلیم کا کہیں نظم نہیں پایا جاتا۔ آپ کو اپنی قلت سے کم حوصلہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ سب سے الگ ساری دنیا سے جدا ہو کر آپ کے بادشاہ معارف پناہ خلد اللہ ملکہٗ نے آپ کو ایک ایسے راستہ پر چلنے کا حکم دیا ہے جس پر اب تک نہ کوئی چلا ہے اور نہ ہر ہوسناک اس پر چلنے کی ہمت کر سکتا ہے آخر آپ کو خود سوچنا چاہئے کہ ع

ع وَمَنِ الّھمدلیفُ اذا رکبتُ غضنفلاً (میرا ساتھی کون ہو سکتا ہے جب میں شیر پر سوار ہو گیا ہوں)

ہمارا فرض ہے کہ وفاداری اور قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اپنے تعلیمی نصب العین کو پوری روشنی میں اپنے سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں اور رفقار سفر کی قلت تعداد سے نہ گھبرائیں کیونکہ ہمیں اُنھیں کی ضرورت ہے جو استقامت پر قائم ہیں۔

وَکَم مِن فئۃٍ قلیلۃٍ غلبتْ فئۃً کثیرۃً بِاذنِ اللہ وَاللہُ مَعَ الصابرین ٥

آجکل جو یہ کہا جاتا ہے کہ اہل یورپ نے جب سے مذہب کو چھوڑ دیا ترقی کے منازل طے کرنے لگے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس سے گویا ایک طرح سے مشرق کو بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہم بھی یہی سلوک اپنے مذہب سے کریں یہ ایک صریحی مغالطہ ہے ۔ اس لئے کہ اہل یورپ اگر مذہب کو نہ چھوڑتے تو اور کیا کرتے ۔ اُن کے پاس مذہب تھا کب ؟ اُن کے پاس ایک کتاب تھی جو در اصل کتاب الٰہی نہ تھی بلکہ صرف کتاب الٰہی کی ہمنام تھی۔ اُن کے پاس ایک تعلیم تھی جسے تعلیم الٰہی باور کرایا گیا تھا لیکن وہ الٰہی تعلیم ہی نہ تھی خود ان ہی کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کتاب خدا کی ہے نہ اس کی تعلیم وہ ہے جو کسی رسول نے دی ہو۔ وہ مطلق مذہب سے بیزار نہیں بلکہ وہ اُس مذہب سے بیزار ہیں جو اُن کے آبا و اجداد اُن کے لئے چھوڑ گئے ہیں علاوہ اس کے آپ میں سے جن لوگوں نے کلیسا کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور رومن کیتھولک و پروٹسٹنٹ فرقوں کی ہولناک خانہ جنگیوں کے حالات پڑھے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں جس ملک میں مذہب کے نام سے معصوم انسانوں کا خون لاکھوں کی تعداد میں بہایا گیا ہو بے گناہوں کو زندہ جلایا

گیا ہو وہ جان سکتے ہیں کہ اگر کسی ایسے ملک میں سرے سے مذہب ہی سے لوگوں میں نفرت پیدا ہو گئی تو اس کے سوا اور ہونا کیا۔ چونکہ یورپ میں مذہب اپنا وقار کھو چکا ہے جیسا کہ اُس کو کھونا چاہئے تھا اُسی پر قیاس کر کے سمجھا جاتا ہے کہ وہی حال اس مذہب کا بھی ہو گا جس کا تعلق ہمارے شعبہ سے ہے حالانکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یورپ میں مذہب موجود ہی نہ تھا اور خیر یہ تو ایک حد تک مذہبی بحث سمجھی جا سکتی ہے لیکن اس کے سوا ایک اور دوسرے امر کا بھی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں انگریزی ادب اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ جن علوم کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا تعلق مذہب اسلام سے ہے، لیکن ان مذہبی علوم کی تعلیم کا ایک مقصد وہ ہے جو عام عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد ہے، لیکن ان اسلامی علوم و فنون کو ہم جو جامعہ میں پڑھ رہے ہیں، میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے ان علوم کی تعلیم کا بڑا اہم نصب العین وہ ہے جس کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے ہاں وہ کتاب پڑھائی جاتی ہے جس پر آج دنیا کے چالیس کروڑ انسانوں کی دستوری و امنی حیات وابستہ ہے۔ وہ ایک ایسے اصول قانون کا مطالعہ ہے جس نے صدیوں بڑے بڑے امپائرز کے آرڈر کو قائم رکھا ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے لیکن کس کی اور دنیا کے کس عہد کی؟ جدید دنیا کو قدیم دنیا سے تاریخ کی جو سنہری کڑی ملاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حیرت انگیز انقلابی وجود اقدس ہے جس کا اثر موجودہ دنیا کے ہر شعبہ پر پڑا ہے اور پڑتا جا رہا ہے۔ اس فن کا اصطلاحی نام علم حدیث ہے۔

مسلمانوں نے ہزارہا مشکلات کا سامنا کر کے اس فن کی حفاظت کی ہے اور اس کے رواۃ کی تنقیح کے سلسلہ میں ایک اور فن پیدا ہو گیا جس کو رجال کا فن کہا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ جرمنی کے مشہور عربی دان فاضل ڈاکٹر اسپرنگر کے اس قول سے ہوتا ہے جو انھوں نے اصابہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے" اس کی روشنی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلوت اور جلوت کے حالات پڑھائے جاتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے

باہم ملنے سے چند کلیات پیدا ہوئے جو قیامت تک آنے والوں کے جملہ شعبہ جات حیات پر حاوی ہیں۔ اُن کلیات سے پھر قوانین پیدا ہوئے یہ بھی مسلمانوں کا خاص فن ہے جس کو قانون اسلام یا فقہ اسلامی کہا جاتا ہے۔ دنیا کے بہترین دماغوں نے مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام حنبلؒ وغیرہم اور ان کے بعد ہزارہا ارباب فکر و نظر نے اس پر مسلسل کام کیا ہے ان کے علاوہ ہمارے ہاں ایک اور فن کی بھی تعلیم ہوتی ہے جس کے ذریعہ دلائل عقلیہ کی سپر سے اعدائے دین و مذہب کے وار کو روکا جاتا ہے اور براہین قاطعہ کی شمشیر سے دشمنانِ خدا اور رسول کے شبہات و شکوک کا خاتمہ کیا جاتا ہے اس فن کا اصطلاحی نام علم کلام ہے اور یہ مسلمانوں کا فلسفہ ہے اس سے بھی زیادہ نظام کائنات کی جو توجیہہ ہمارے صوفیائے کرام مثلاً شیخ غزالی شیخ ابن عربی ان جیسے بزرگوں نے فرمائی ہے ان کے علوم کا قیمتی ذخیرہ جسے اصطلاحاً تصوف کہتے ہیں اسی شعبہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ابتداءً عرب کی سرزمین سے طلوع ہوا۔ گو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ملک عرب میں ہوا لیکن آپ کا نشانہ تمام دنیا کی طرف تھا۔ جب کسی تمدن میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے مقابلہ کے لئے پیغمبر کی بعثت ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے عرب کی خصوصاً اور تمام عالم کی عموماً جو حالت تھی وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ ایسے تاریک زمانہ میں حضورؐ کی بعثت اور (۲۳) سال کے قلیل زمانہ نبوت میں تین براعظموں میں جو انقلاب عظیم برپا ہو گیا بذات خود ایک معجزہ ہے۔

بقول مولانا سلیمان ندوی کے جو انہوں نے اسلامی انجمن مدراس کے ایک جلسہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "دنیا کے اسٹیج پر بڑے بڑے بادشاہ اور حکمراں پیدا ہوئے جنھوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکومت کی قوموں کی جان و مال پر فرمانروائی کی ایک ملک کو اُجاڑا دوسرے کو بسایا ایک سے چھینا اور دوسرے کو دیا مگر اُن کا نقشہ وہی رہا جس کو قرآن نے ایک آیت میں ملکہ سبا کی زبان سے ادا کیا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اذا دخلوا قریۃً افسدوھا وجعلوا اعزۃَ اھلِھا اذلۃ۔ ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا لیکن تنہائیوں اور خلوت خانوں کے روپوش مجرموں کو وہ روک نہ سکی۔ انہوں نے بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کیا لیکن دلوں کی

بستی میں وہ امن وامان پیدا نہ کر سکے ۔ انھوں نے ملک کا نظم ونسق کیا لیکن روحوں کی مملکت میں اُن سے نظم ونسق نہ ہوسکا بلکہ ہر قسم کی روحانی بربادی انھیں کے درباروں سے نکل کر ہر جگہ پھیلتی رہتی ہے ۔ کیا سکندر اور سینہ رجیسے ملوکِ اعظم بھی ہمارے لئے کچھ چھوڑ گئے ۔ مکہ کے ابوجہل ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کی حکومتیں مٹ گئیں مگر شہنشاہ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمان روائی بدستور جاری ہے "۔

مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخی واقعات کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کا ایک ایک واقعہ بچپن کا ہو یا جوانی کا جلوت کا ہو یا خلوت کا جنگ کا ہو یا امن کا علم ویقین کے ان تمام ذرائع کے ساتھ کیا بنی آدم کے ہاتھ میں موجود نہیں ہے جن کے ذریعہ سے ہم کسی تاریخی واقعہ کا علم حاصل کرتے ہیں ۔ یہی چیز تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض صحابہؓ نے ایک یہودی کے سوال پر فرمایا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سب کچھ سکھاتے ہیں حتیٰ کہ استنجا کرنے کا طریقہ بھی اور یہی میرا مقصد ہے کہ ایک زندہ نبی کی زندہ کتاب، زندہ تعلیمات اور ان سے پیدا کئے ہوئے زندہ افکار ونظریات آئین وقوانین کی تعلیم بہترین اساتذہ اور ماہرین کے ذریعہ سے ہمارے شعبہ میں دی جاتی ہے اور اس لئے دی جاتی ہے کہ ہم پہلے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اُس میں تبحر وکمال پیدا کریں اور پھر انگریزی ادب جس کی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کا موقعہ بھی جامعہ عثمانیہ میں حضرت ظل اللہ خلد اللہ ملکہ کے مراحم خسروانہ سے مل گیا ہے ۔ خام مواد کے اس ذخیرہ کو عصری تعبیروں میں دنیا کے آگے پیش کریں اگر اس کو بیجا فخر نہ سمجھا جائے تو میں شعبۂ فنون وسائنس میں تعلیم پانے والے بھائیوں سے معافی چاہتے ہوئے اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو تو انگریزی اس لئے سکھائی جاتی ہے کہ آپ یورپ کے اچھے رشید سعید شاگرد بن سکیں اور اگر آپ نے یہ کر لیا تو آپ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے لیکن کیا کیجئے کہ ہم جس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر جامعہ میں تعلیم حاصل کرتے اور انگریزی ادب سیکھتے ہیں اس کے ذریعہ سے شاگرد بننے کا نہیں بلکہ ہمارے ذمہ یورپ کے استاد اور معلم ہونے کا فریضہ سپرد کیا گیا ہے یعنی اسلامی علوم وفنون کو یورپ کی جدید تعبیروں میں ان تک پہونچا کر اپنے اسلاف کے ان بہترین

علمی سرمایوں کا وہی وقار دنیا کی علمی صفوں میں قائم کر دیں جن کے وہ واقعی طور پر مستحق ہیں ۔ اور یہی ہمارے شعبہ کا اہم ترین نصب العین ہے ۔

حضرات ! آپ ہمارے محترم صدر شعبہ، امیر شعبہ، اور صدر جلسہ نواب صدر المہام بہادر عدالت ومذہبی کی تقریروں کے سُننے کے مشتاق ہوں گے اس لئے میں آپ برادران شعبہ دینیات سے صرف تعاون عمل کی درخواست کرتا ہوں اگر آپ پوری دلدہی کے ساتھ تعاون عمل کریں تو ہم انشاء اللہ مشکل سے مشکل کام کو آسان کر دکھائیں گے ۔

مشکلے نیست کہ آسان نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کیا اور ہمارا کام کیا ۔ میرا یہ کامل ایقان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم جس طرح اب تک شامل حال رہا ہے اگر اسی طرح آئندہ بھی شامل حال رہے تو انشاء اللہ جملہ امور بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام پاتے چلے جائیں گے کسی نے خوب کہا ہے ؎

کیا فائدہ فکر بیش وکم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

میں اپنے اس خطبہ صدارت کو اعلیٰحضرت سلطان العلوم شمس الملۃ والدین شہزادگان والا شان وشاہزادیان فرخندہ فال کی سلامتی اور ترقی عمر واقبال کی دعا پر ختم کرتا ہوں ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم وفن را در دکن
زندہ باد اے حضرتِ عثمان علیخان زندہ باد

آمین

کلیسا

آ رہی ہے دور سے گرجا کے گھنٹوں کی صدا ٹھہر جا اے ہم نفس اس رہگذر پر ٹھہر جا
آہ یہ قاتل ترنم آہ یہ کافر سرود ہر نفس محو عبادت ہر نظر صرفِ سجود
مرکزِ تثلیث پر حسن و جوانی جلوہ تاب ایک ہی طوفان میں بہتا ہوا ہر شیخ و شاب
سینکڑوں دل اک ہجومِ شوق میں کھوئے ہوئے سینکڑوں طوفاں کنارِ بحر میں سوئے ہوئے
سینکڑوں معصوم بچے سینکڑوں پیر و جواں صف بہ صف پہلو بہ پہلو کارواں در کارواں
نازنینوں کی دعائیں مہ جبینوں کے نیاز ایک آہنگِ مقدس میں بلا کا سوز و ساز
ایک جا سمٹا ہوا سا ایک جہانِ رنگ و بو اک جگہ ٹھہرا ہوا سا کاروانِ رنگ و بو
ہاتھ میں انجیل سینوں میں مسلسل اضطراب بہکی بہکی سی نگاہیں کھویا کھویا سا شباب
ایک ہی جا سینکڑوں دوشیزگانِ نازنیں ایک مرکز پر ہزاروں سیم تن زہرہ جبیں
ایک کلیسا میں ہزاروں آتشیں رخ بے نقاب ایک آغوشِ تجلی میں ہزاروں آفتاب
سینکڑوں دوشیزہ سینوں پر صلیبوں کے نشاں ایک فضائے نور میں لاکھوں فرشتے پرفشاں

چار سو دہکا ہوا سا نور کا آتشکدہ دامنِ عصمت پہ دھوکا شہپرِ جبریل کا
انتہائے قدس میں ڈوبی ہوئی سی ہر نظر دامنِ مریم کا سایہ ہر سرِ معصوم پر
اک حریمِ قدس میں ہر بنتِ مریم سرنگوں لب پہ آیاتِ مقدس آنکھ میں رنگِ فسوں
آہ یہ معصوم منظر اُف یہ لاہوتی فضا یہ تکلم یہ ترنم یہ تقدس یہ دعا!
اے کلیسا پاکیٔ دامانِ مریم کی قسم ڈگمگاتے ہیں ترے جادہ پہ طاعت کے قدم
روح تھراتی ہے تیرے ہر مقدس راگ سے دل بھڑک اُٹھتا ہے اِن نغموں کی دھیمی آگ سے
جی میں آتا ہے کہ تیرا ہمنوا ہو جاؤں میں دل یہ کہتا ہے یہیں صرفِ دعا ہو جاؤں میں
شوق کہتا ہے کہ تیرا ساز تجھ سے چھین لوں درد کہتا ہے تری آواز تجھ سے چھین لوں
بر کنارِ دیر ہوں کعبہ سے میں بیگانہ ہوں لٹ چکا اِن سجدگاہوں میں مرے دل کا سکوں
اہرمن آباد ہیں تیرے ملائک زار میں معصیت بکتی ہے تیرے قدس کے بازار میں
درس دے انسانیت کا آدمِ بے درد کو یوں وقارِ بندگی رسمِ عبادت میں نہ کھو
جادۂ عشرت سے ہٹ کر حالتِ انساں بھی دیکھ آہ! اے ساحل نشیں خمیازۂ طوفاں بھی دیکھ!
بسترِ رہبانیت سے راہبوں کو اب جگا سن پسِ دیوارِ ہستی دردِ پیہم کی صدا
اس خراباتِ کہن کے جام و مینا توڑ دے چھوڑ دے للہ یہ بے حس عبادت چھوڑ دے!
داغدارِ سجدہ ہے صدیوں سے آدم کی جبیں زاہدانِ دہر کے سینوں میں لیکن دل نہیں
یاں کوئی دن ایک ایسا انقلاب آنیکو ہے قصرِ خودکامی کی ہر دیوار گرجانیکو ہے

منظور حسین شورؔ ایم اے۔ ال ال بی
پروفیسر مارس کالج ناگپور

ہندوستانی مصنوعات پر جنگ کے اثرات

موجودہ زمانہ میں جب کہ میکانی ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر مختلف ممالک کو ایک دوسرے سے قریب کردیا ہے، ایک مقام کے حالات و واقعات کا دوسرے مقام یا ملک پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ یوں تو امن کے زمانہ میں بھی ایک ملک کے معاشی حالات کا تعلق دوسرے ممالک سے رہا ہی کرتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں ان تعلقات کی نوعیت پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ متحارب ممالک کا جنگ اور اس کے معاشی اثرات سے متاثر ہونا ظاہر ہے لیکن موجودہ زمانہ میں جنگوں کی ایک خاص نوعیت یہ ہے کہ اس سے غیر جانبدار ممالک بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس وقت برطانیہ عظمیٰ اپنے حریف جرمنی سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اس جنگ کے نہایت ہی گہرے اور دور رس اثرات ان دونوں ممالک کی معاشی حالات پر پڑ رہے ہیں برطانیہ کی پشت پر اس کی عظیم دولت عامہ موجود ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بھی اس جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہندوستان کا بھی ان تمام حالات و واقعات سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ اگر ہندوستان کا برطانیہ عظمیٰ سے تعلق نہ ہوتا تو بھی شاید وہ اس جنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن برطانیہ سے اس کے قریبی تعلق کے مدِ نظر ان اثرات کی خاصی اہمیت ہے۔

موجودہ جنگ سے ہندوستان کی معاشی زندگی کے تقریباً تمام پہلو متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپ وہ اثرات ہیں جو ہمارے ملک کی صنعتی حالت کو متاثر کر رہے ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وہ ممالک جو امن کے زمانہ میں صنعتی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہتے ہیں، جنگ ان کے لئے پیامِ مسرت لاتی ہے۔ غیر ممالک کی مصنوعات سے مقابلہ کا

اندیشہ جاتا رہتا ہے، اندرون ملک اور بیرونی ممالک میں بڑا بازار مہیا ہو جاتا ہے جہاں مصنوعات کی نکاسی بے کھٹکے کی جا سکتی ہے۔ خام مال جو اب تک بیرونی صنعتی ممالک کو درآمد کیا جاتا تھا اب اندرون ملک مصنوعات سازی کے کام آنے لگتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود متحارب ممالک کو جو اب تک اپنی مصنوعات ان غیر ترقی یافتہ ممالک کو برآمد کیا کرتے تھے، ان ممالک سے فوجی مصنوعات خریدنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اسی لئے ان ممالک کی مصنوعات سازی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکاتے۔ ان ہی حقائق کے پیش نظر گذشتہ جنگِ عظیم میں جاپان نے عظیم الشان صنعتی ترقی کی۔ اس مضمون میں ہم یہ دیکھیں گے کہ جنگ نے ہماری صنعتی ترقی کے لئے کس حد تک سازگار ماحول پیدا کیا ہے۔

جنگ کے چھڑ جانے کے بعد عام طور پر یہ توقع کی جا رہی تھی کہ ہندوستانی مصنوعات میں خاطر خواہ ترقی ہوگی۔ چنانچہ ہماری مصنوعات نے ترقی کی طرف قدم تو اٹھایا لیکن توقع کے خلاف ان کی رفتار سست رہی۔ ۱۹۴۰ء میں بمقابل سال گذشتہ تمام بڑی صنعتوں میں سوائے کپڑے کی صنعت کے ترقی ہوئی۔ صنعت پارچہ بافی کی پیداوار میں اگرچہ اضافہ نہیں ہوا لیکن حالات پھر بھی امید افزا ہیں۔ جنگ سے قبل اس صنعت کی حالت خراب تھی اور پیداوار میں تخفیف کرنے کا مسئلہ درپیش تھا لیکن جنگ کی وجہ سے حالات میں تبدیلی ہو گئی۔ گرنیوں میں زائد از اوقات معینہ کام ہونے لگا اور جنگی ضروریات کی سربراہی کی جانے لگی ہے۔ قیمتیں بھی اچھی مل رہی ہیں۔

چھوٹی صنعتیں چھوٹی مصنوعات میں خاصی ترقی ہوئی اور پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ خصوصاً گھریلو مصنوعات کی پیداوار میں بڑا اضافہ ہوا۔ اون کی گرنیوں میں تیزی کے ساتھ کام ہونے لگا جنگ سے قبل صنعت کاغذ سازی کی حالت خراب تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس صنعت میں افراطی پیدائش ہو رہی ہے اس لئے کہ اس کے بہت سے کارخانے کھل گئے تھے اور ملک کی طلب سے بھی زیادہ کاغذ پیدا کیا جانے لگا تھا۔ لیکن جنگ کے باعث حالات میں تبدیلی ہو گئی۔ نہ صرف کاغذ زیادہ بنایا جانے لگا بلکہ ایسی طلب کی سربراہی بھی ہونے لگی جس کو درآمد سے پورا کیا جاتا تھا۔

چھوٹی مصنوعات کی ترقی کے سلسلہ میں کیمیائی صنعت کا تیسرا درجہ ہے۔ سلفیورک ترشہ اور سلفیٹ آف امونیا کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔

ذیل کے جدول سے جنگ سے قبل اور جنگ کے بعد چھوٹی اور بڑی مصنوعات کی پیداوار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مصنوعات	پیمائش کی اکائی	ستمبر تا اگسٹ	
		ماقبل جنگ سال	جنگ کا پہلا سال
بڑی مصنوعات			
۱۔ روئی	ملین گز	۴۱۷۲،۳	۳۹۶۸،۱
۲۔ جوٹ	سو ٹن	۱۱۲۱،۳	۱۳۶۱،۸
۳۔ لوہا	سو ٹن	۱۶۸۷،۲	۱۹۱۹،۰
۴۔ فولاد	سو ٹن	۹۹۹،۵	۱۱۷۲،۵
۵۔ نخته فولاد	سو ٹن	۹۸۸،۱	۱۱۴۲،۷
۶۔ شکر	سو ٹن	۶۵۰،۸	۱۲۴۱،۷
۷۔ کوئلہ	سو ٹن	۲۴۵۷۷	۲۵۵۳۶
۸۔ چار (شمالی ہند)	ملین پونڈ	۳۶۱،۳۰	۴۰۸،۸۴
۹۔ برقی	سو یونٹ	۲۰۰۴۱۸	۲۱۱۶۸۹۶
چھوٹی مصنوعات			
۱۔ سلفیورک ترشہ	سو ہنڈرویٹ	۵۵۴،۱۴	۶۶۵،۳۲
۲۔ سلفیٹ آف امونیا	ٹن	۱۷۱۶۰	۲۳۱۰۶
۳۔ کاغذ	سو ہنڈرویٹ	۱۱۹۹،۶۲	۱۵۴۴،۰۴
۴۔ آٹا (گیہوں)	سو من	۱۶۱۷،۶۴	۱۶۰۳۲،۹۷
۵۔ دیا سلائی	ملین گراس	۲۱،۹۹	۲۲،۳۵
۶۔ پٹرول	ملین گیلن	۱۷،۳۵	۲۴،۱۳
۷۔ مٹی کا تیل	ملین گیلن	۳۰،۸۱	۳۶،۴۲

جنگی فرمائشات کا اثر حالیہ اعلان کے بموجب جنگ کے ابتدائی چودہ مہینوں میں محکمہ سربراہی (سپلائی ڈیپارٹمنٹ) نے ½ ۵۶ کروڑ روپیہ کے آرڈر ہندوستان کو دئے۔ یہ فرمائشات مختلف قسم کی اشیاء کے لئے تھے مثلاً برقی اور لاشعاعی آلات، ہسپتال کا فرنیچر، بوٹ، جوتے، شہتیر، اشیائے خوردنی، بیاٹری Lubricating Oil، ترشے، سگریٹ اور تمباکو، ربر اور انجینرنگ کا سامان۔

جوٹ، کپڑا اور انجینرنگ کی مصنوعات کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ جوٹ کے لئے ۹،۵۹ کروڑ کے آرڈر اور ۱۷ لاکھ ریتی کے تھیلے مہیا کئے گئے۔

کپڑے کی صنعت کے لئے ۵۹، ۱۷ کروڑ روپیہ کے آرڈر مہیا کئے گئے جس میں سے ۴۱۴۰۰ ۲۳۰۸۰ گز ڈرل ۲۷۸۳۱۴۵۰ گز ٹیپ (Tape) اور جالے (Webbing) اور ۱۰۱۷۳۰۰ گز Macklino تھا۔ ۷۰، ۳ کروڑ روپیہ کے خیمے ۳۷ لاکھ روپیہ کے Comouflago nets اور Components ۲ ملین بلانکٹ ۹۰ ملین گز قمیص کا کپڑا ۹ ملین گز روئی کا دھاگہ اور ۴ ملین سے زائد روئی وسن کا کیوانویس، ان اشیاء کی سربراہی کی گئی۔

انجینرنگ کی فرمائشات میں ٹیلیفون، تعمیراتی سامان، پانی کی ٹنکیاں، بجلی کے بلب اور پنکھے شامل ہیں۔ ۵۶، ۵۴ لاکھ روپیہ کی Hutting ۰۴، ۲۷ لاکھ روپیہ M. S. Plates اور چادریں (Sheets) ۱۶، ۲۵ لاکھ روپیہ کا فولاد شامل ہے۔

فوجی مصنوعات ان مصنوعات میں کافی ترقی ہوئی۔ جنگ کے پہلے سال میں دس کروڑ Round چھوٹے آلات حرب (Amunition) ۴ لاکھ رونڈ بندوق کا Amunition بڑی مقدار میں بارود سمندر پار بھیجی گئی۔ ہندوستانی فوج میں موٹروں کی مقدار میں ۵ ہزار سے ۳۰ ہزار کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ہندوستانی موٹر سازی کی صنعت کو کافی پھیلنے کا موقع ہے۔ موجودہ جنگ کے لئے ۴۰ ہزار سازوسامان Automobiles ضروری ہے۔ جس کے منجملہ ۲۰ ہزار ہندوستان تیار کر رہا ہے۔ اس کی تیاری میں حکومت کی امداد اور مشورے شامل رہے ہیں۔ مشین گن، بندوق وغیرہ بھی

تیار ہو رہے ہیں۔ حال میں ۳۹ لاکھ روپیہ کے چھوٹے جہازوں کی فرمایش کی گئی ہے۔ ڈسمبر ۴۰ء تک ۱۳ لاکھ جوڑے جوتے، ۱۵ لاکھ بلانکٹ ایک کروڑ گز ڈرل ۱۲ لاکھ سوتی قمیص ۲۵ لاکھ جوڑے پاتابہ بھیجے جاچکے ہیں۔

میسور و ٹراونکور جلے ہوئے ناریل کے شل تیار کر رہے ہیں تاکہ مخالف گیس کے لئے استعمال کئے جائیں۔ اس سلسلے میں میسور کو ۲۸ ہزار ۵۰۰ روپیہ اور ٹرانکور کو ۱۵ لاکھ ۱۶ ہزار کے آرڈر حکومت ہند نے دئے ہیں۔ کئی اشیا مثلاً بیاٹری، برش، تیزاب، صابن، کوئلہ، سمنٹ، چار، شکر، روئی اور اونی کپڑوں کے لئے فرمایشیں دی گئی ہیں۔

Canning کی صنعت کا عنقریب افتتاح ہوگا۔ اس میں صرف دودھ، سیب، مچھلی، محفوظ رکھی جائے گی۔ المونیم کی تیاری کے لئے ایک کرنی قائم ہو رہی ہے۔ ۳۴ لاکھ گز Water Proof Packing Paper مدراس، بمبئی، کلکتہ میں بن رہا ہے۔ برقی اشیا کی تیاری میں گذشتہ سال نمایاں ترقی ہوئی۔ بیاٹری، Dry cells لیمپ، پنکھے، گرم پانی کی بوتلیں، ٹائپ رائٹر، سینے کی مشین وغیرہ تیار کی جارہی ہیں۔ اسی طرح مختلف فوجی ضروریات تیار ہو رہی ہیں۔

۱۹۱۲ء میں سمنٹ کم تیار ہوتی تھی اور اب دس لاکھ ٹن تیار ہوتی ہے، روئی کے کارخانے یونیفارم اور بلانکٹ تیار کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں روغنی تخم زیادہ ہوتے ہیں جن سے تیل اور چربی نکالی جارہی ہے اور ان کو فوجی ضروریات کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ لکڑی کے لئے بہت سی فرمایشیں وصول ہوئی ہیں۔ اسی لئے لکڑی کے کارخانے مصروف ہیں۔ پینٹ اور وارنش وغیرہ کی تیاری ہو رہی ہے۔

بعض اہم مصنوعات پر اثرات۔
(کپڑے کی مصنوعات)

جنگ سے قبل ۱۹۳۹ء میں ان مصنوعات کی حالت خراب تھی ۱۹۳۹ء میں کاروباری دنیا امید و بیم کی حالت میں ہچکولے لے رہی تھی۔ یوروپی بازارات میں ایک غیر یقینی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ قیمتیں گر گئی تھیں اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔ علاوہ ازیں جاپان نے ہندوستانی بازاروں میں بھرمار کی پالیسی جاری رکھی تھی پھر دوسری طرف

خود ہندوستانی آئندہ منفعت کی خاطر ذخیرہ کرنے لگے تھے۔ ان تمام حالات کا اثر قیمتوں کی تخفیف کی صورت میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ جنگ کے چھڑ جانے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا ۱۹۴۰ء بحیثیت مجموعی ان مصنوعات کے لئے غیر امید افزا نہ تھا۔ ذیل میں کپڑے کی بعض اہم صنعتوں کی حالت کا مطالعہ کریں گے۔

۱۔ روئی کی صنعت :-

جنگ کے چھڑتے ہی اس صنعت میں جان پڑ گئی۔ لیکن یہ حالت تھوڑے عرصہ کے لئے باقی رہی یعنی ستمبر ۱۹۳۹ء سے ڈسمبر تک۔ آغاز جنگ کے ساتھ ہی کاروباری حالت میں رجائیت پیدا ہوگئی۔ قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ مخمنون اور تاجروں کی بن آئی۔ نومبر میں تخمین کی ایک رو چلی جو کلکتہ سے شروع ہو کر تمام ملک میں پھیل گئی۔ اور ڈسمبر تک جاری رہی۔ لیکن اس کے بعد حالات میں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ ضروریات زندگی گراں ہوگئے۔ اب مزدوروں کی جانب سے اضافۂ اُجرت کا مطالبہ پیش کیا جانے لگا۔ ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اپریل تک جاری رہا ان سب پر طرفہ یہ کہ ریل کے کرایوں میں اضافہ ہوا۔ اپریل اور مئی کے درمیان اس صنعت میں ترقی ہوئی۔ لیکن پھر تنزل شروع ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جہازرانی کی دقتوں کے باعث برآمد میں کمی ہوئی۔ اس کا اظہار ماہانہ پیداوار کے اعداد سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ڈسمبر ۱۹۳۹ء میں ۳۹۲،۹ ملین گز پیداوار اور مارچ ۱۹۴۰ء میں ۲۵۰،۲ ملین گز لیکن اس کے بعد پیداوار میں پھر اضافہ ہوا یہاں تک کہ مئی میں ۳۷۵،۲ ملین گز پیداوار اور جولائی میں ۳۱۲،۳ ملین گز۔ اگسٹ میں اضافہ ہوا کیونکہ موسمی طلب میں زیادتی ہوئی۔ پیداوار پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے پہلے سال میں یعنی ستمبر تا اگسٹ ۱۹۴۰ء میں دوسرے سالوں کی بہ نسبت پیداوار زیادہ نہیں رہی۔ اس سال یعنی ۱۹۴۰ء میں کل پیداوار ۳۹۶۸،۱ ملین گز اور ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۴۱۷۲،۳ ملین گز رہی۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں ۱۵۰۰۰۰ مزدور کپڑے کی صنعت میں مشغول تھے اور جولائی کے اواخر میں ۱۴۰۰۰۰ مزدور رہ گئے۔

درآمد میں تخفیف پیداوار میں اس تخفیف سے جاپان اور لنکاشائر اچھی طرح فائدہ اُٹھاسکتے تھے لیکن دونوں ممالک جنگ میں مصروف تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے کسی مہینہ میں بھی درآمد سنہ ۱۹۳۹ء کے کسی مہینہ سے زیادہ نہ رہی۔ جملہ درآمد جنگ کے پہلے سال میں یعنی سنہ ۱۹۳۹ء۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ۴۶۶٬۰ ملین گز تھی حالانکہ سنہ ۱۹۳۸-۳۹ کے ان ہی بارہ مہینوں میں جملہ درآمد ۶۶.۵٬۵ ملین گز رہی۔

برآمد میں اضافہ اگرچہ پیداوار میں تخفیف ہوئی اور درآمد بھی کم رہی لیکن برطانوی ہند سے برآمد میں اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے مالی سال میں جملہ برآمد ۲۲۱٬۲ ملین گز تھی اور اس کے بمقابل سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۱۷۷ ملین گز رہی۔ سوت اور دھاگہ کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء میں ۴۰۱۲۴۳۵۵ پونڈ اور سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۳۸۳۷۲۴۳۶۹ پونڈ سوت اور دھاگہ برآمد کیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء کے پہلے چار مہینوں میں سوت کی برآمد ۱۹۰۱۰۴۸۹ پونڈ تھی۔

درآمد اور پیداوار میں تخفیف اور برآمد میں اضافہ کا اصلی سبب جنگ تھا۔ جنگ کے باعث ہندوستانی کارخانوں نے جو اپنی پیداوار اور مصارف پیدائش میں تخفیف کرنا چاہتے تھے، اپنا خیال بدل دیا۔ جنگ کے آغاز پر احمدآباد و بمبئی کی گرنیوں نے حکومت سے درخواست کی کہ "مزدور تحقیقاتی کمیٹی" (Labour inquiry Committee) نے جو مزدوریوں میں عارضی اضافہ کی سفارش کی ہے اس کو نافذ نہ کیا جائے۔ کیونکہ اضافہ اجرت سے صنعت پر زیادہ بار پڑے گا اس کے علاوہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ذخیرہ کی وجہ سے بھی صنعت زیر بار ہوگی کیونکہ اس کی نکاسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صنعت افراطی پیدائش کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اسی لئے تخفیف پیدائش کی اسکیم پیش نظر تھی۔ لیکن جوں ہی جنگ چھڑی خیالات میں تبدیلی ہوگئی اور تخفیف پیدائش کا مسئلہ ہی باقی نہ رہا۔ حالات و مواقع سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اور ہندوستان فوجی فرمائشات کی سربراہی کرنے لگا۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان مشرقی منڈیوں میں بھی ہندوستانی مال جانے لگا جہاں لنکاشائر اپنا مال روانہ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ لنکاشائر کی عدم مسابقت سے جاپان فائدہ اُٹھائے لیکن وہ خود چین سے برسرِ جنگ ہے۔ ہندوستان کو جاپان کی اس مصروفیت سے

فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔

برآمد میں اس اضافہ کے سلسلہ میں روئی کی تنظیمات Cotton organisation کو بھی دخل ہے۔ یوروپی بازارات کے بند ہونے کے خوف سے ہندوستانی مرکزی روئی کی کمیٹی Indian Central Cotton Committae نے ہندوستان میں ہندوستانی کپڑے اور قریب کے ممالک میں برآمد کرنے کے لئے وسیع پروپگنڈا کرنے کی تجاویز پیش کیں جن کو روبہ عمل لایا گیا۔

مخالف اثرات بعض ایسی اشیاء جن کی اس صنعت کو ضرورت تھی مثلاً رنگ، رنگ کٹ سفوف وغیرہ گران ہوگئے۔ اشیاء مایحتاج کی گرانی کے باعث اضافۂ اُجرت کا مطالبہ ہونے لگا۔ نتیجتاً ہڑتالیں ہونے لگیں۔ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء تا اپریل سنہ ۱۹۴۰ء ان ہڑتالوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ تو وہ مخالف اثرات تھے جو بالراست ظاہر ہوئے۔ جنگ کے بعض بالواسطہ بُرے اثرات بھی نمودار ہوئے مثلاً ریلوں کے کرایہ میں ۱۲ ½ فی صد کا اضافہ، سلطنت برطانیہ کے کپڑے پر محصول درآمد میں ہندوستانی برطانوی تجارتی راضی نامہ کی موجب ۲ ½ فی صد کی کمی۔

روئی اسی سلسلہ میں روئی کی حالت پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کی نسبت زیادہ آمدنی ہوئی لیکن سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں اتنی آمدنی کی اُمید نہیں ہے۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں خام روئی کی قیمت ۳۴۱ روپیہ تھی لیکن اس کے بعد سے تنزل شروع ہوا۔ ۲ رجولائی کو ½ ۱۴۷ روپیہ قیمت تھی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مزدوروں نے اسی زمانہ میں ہڑتالیں کیں اور نتیجتاً ہندوستانیوں میں روئی کا استعمال کم ہونے لگا۔

صنعت اون جنگ کی وجہ سے اس صنعت کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچا۔ اُون کی درآمد میں اضافہ ہوا اور برآمد میں کمی ہوئی۔ قیمتوں میں ۳۲ روپیہ فی من (سنہ ۱۹۳۹ء میں) سے ۴۸ روپیہ (جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں) تک اضافہ ہوا۔ جنگ کے پہلے سال میں خام اُون کی درآمد ۱۸۴۵۰۵۱۳ روپیہ تھی اس کے بمقابل سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۶۵۵۶۸۰۲۱ روپیہ تھی۔ لیکن برآمد میں ۳۴۵۴۷۰۶۰ روپیہ (سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء) سے ۲۶۰۹۰۶۶۱ روپیہ (سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء) کی کمی ہوئی۔ یہ تو خام اُون کی حالت تھی۔ اونی مصنوعات

کی درآمد و برآمد میں بھی کمی ہوئی ۔ لیکن اس کے باوجود صنعت برابر ترقی کرتی رہی ۔ تمام گرنیاں حکومت کے فرمائشات کی سربراہی کر رہی ہیں ۔ حکومت نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ تمام پیداوار وہ خریدے گی ۔ اور اس صنعت کی جانب سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ کم سے کم منافع لے گی اور زیادہ سے زیادہ وقت کام کرے گی ۔ لیکن اُون کی گرنیاں حکومت کی تمام فرمائشات کی تکمیل نہیں کر سکیں اس لئے دستی صناعوں سے Spinner's Association کے ذریعہ کام لیا جا رہا ہے ۔ حال ہی میں دہلی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ دستی صناعوں کو کس طرح مدد کی جائے ۔

اس غرض سے ایک کمیٹی کا تقرر کیا گیا ہے ۔

ریشم کی صنعت | جاپان و چین کی جنگ کی وجہ سے ہندوستان میں اس صنعت کی ترقی کے امکانات پائے جاتے ہیں ۔ ستمبر ۱۹۳۹ء تا اگسٹ ۱۹۴۰ء میں ۴۴۴۳۵۰ روپیہ کا ریشم برآمد کیا گیا ۔ اور ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۲۱۷۲۳۸ روپیہ کی برآمد ہوئی تھی ۔ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۲۶۰۴۶۲ روپیہ کی ریشمی مصنوعات برآمد کی گئی تھیں اور ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۲۹۸۴۳۲ روپیہ کی ۔ گویا خام ریشم اور ریشمی مصنوعات کی برآمد میں اضافہ ہوا ۔

شکر کی صنعت | شکر کی صنعت کو جنگ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ۔ اس کی پسماندگی کی وجہ یا تو اس کے اپنے نقائص ہیں یا دو صوبہ جات میں کانگریسی حکومت کی غلط حکمت عملی ۔

اس صنعت کی بے بسی کا اندازہ بعض اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے ۔ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۱۲۴۱۷۰۰ ٹن شکر پیدا ہوئی اور ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۶۵۴۸۰۰ ٹن شکر پیدا کی گئی تھی ۔ اگر اس میں گڑ سے بننے والی شکر ۳۱۷۰۰ ٹن کا اضافہ کر دیا جائے جو سال گذشتہ کے مقابل میں بھی زائد تھی (سال گذشتہ گڑ سے بننے والی شکر ۱۴۲۰۰ ٹن تھی) تو اتنی کثیر مقدار کی نکاسی ایک اہم مسئلہ ہے ۔ اس کے لئے کئی تدابیر مثلاً برآمدی بازارات (Export markets) کی فراہمی ، شکر کے صرف میں اندرون ملک اضافہ کرنا ، شکر کی پیداوار میں کمی اور نیشکر کو گڑ میں تبدیل کرنا ، یہ سب پیش نظر ہیں ۔ اس کے علاوہ نیشکر کے زیر کاشت رقبہ میں تخفیف بھی زیر غور ہے ۔ لیکن اس پر صرف ۱۹۴۱-۴۲ء کے موسم میں ہی

عمل کیا جا سکتا ہے ۔ موجودہ رقبہ زیادہ ہے اور اگر یو ۔ پی اور بہار کی حکومتیں صرف ۲ ۱/۲ لاکھ ٹن خریدے تو بقیہ پیداوار کا مسئلہ حل طلب ہی رہ جاتا ہے ۔

نیشکر کی قیمتیں چڑھی رہیں ۔ محصول جنگی میں ۲ روپیہ سے ۳ روپیہ فی ہنڈرویٹ اضافہ ہوا ۔ سلطنت متحدہ کو برآمد نہیں ہوئی اور برما کو برآمد کی ممانعت کروائی گئی یہ فریاد دقتیں ہیں ۔ ان کے ارتفاع کی تدابیر ہو رہی ہیں ۔

بیرونی شکر کی درآمد بھی ایک اہم مسئلہ ہے ۔ جاوا میں شکر کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے بعض بیرونی بازارات ہاتھ سے نکل گئے ہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں کہیں بھرمار شروع نہ ہو جائے ان حالات میں حکومت کا یہ اعلان ہمارے لئے باعث طمانیت ہے کہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں جاوا کی شکر صرف ۳۵۰۰۰ ٹن درآمد کی جائے گی ۔

معمولی حالات میں محاصل برآمد کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے لیکن جنگ کی وجہ سے اس کو ملتوی کر دیا گیا ہے اور اسی لئے سابقہ تامینی محاصل برقرار ہیں ۔ ۱۹۳۹-۴۰ء میں چنگی سے حکومت ۲۴۸۵۴۰۰ روپیہ منافع ہوا اور تامینی محصول درآمد سے ۳۹۶۰۸۰۰ روپیہ کی آمدنی ہوئی ۔

کوئلہ | کوئلہ کی پیداوار میں اضافہ ہوا ۔ جنگ کی وجہ سے برآمد میں بھی اضافہ ہوا کیونکہ مصر ، فلسطین اور یونان کے فرمائشات کی تکمیل کی گئی ۔ نئے بازارات کی فراہمی کے سلسلہ میں حکومت نے بھی مدد کی ۔ جنگ کے باعث نہ صرف برآمد میں اضافہ ہوا بلکہ ہندوستانی صنعتوں کے لئے بھی کوئلہ کی طلب بڑھ گئی ۔

۱۹۴۰-۴۱ء میں ریلوے کے لئے ۲۸۰۰۰۰۰ ٹن کوئلہ خریدا گیا جو گذشتہ سال کی خریدی سے ۴۰۰۰۰۰ ٹن زائد ہے ۔

کوئلہ کی قیمتوں میں گذشتہ اپریل ۱۹۴۰ء سے کوئی تغیر نہیں ہوا ۔ یہ سطح ڈسمبر ۳۹ء اور جنوری ۴۰ء کی قیمتوں کی اعلیٰ سطح سے کم تھی ۔ دیگر ممالک کے مقابلہ میں ہندوستانی کوئلہ کی قیمتیں کم ہی رہیں ۔ مسٹر ۔ ایچ ، کے ، ناگ نے Geological Mining and Metallurgical society of India.

کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ "یقیناً ہندوستانی کوئلہ کی قیمت تمام دنیا میں سب سے کم ہے" ریلوے کو البتہ زیادہ قیمت پر کوئلہ دیا گیا۔ لیکن اس کی تلافی اضافۂ اجرت، محصول منافع زائد اور سے ہو گئی۔

جنگ کی وجہ سے کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل بھی پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ بہار مزدور تحقیقاتی کمیٹی۔ Bihar labour Inquiry committee کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے۔ اور حکومت اس پر غور کر رہی ہے۔ ایک اور کمیٹی اس صنعت کی تنظیم جدید کے لئے Coal Industry Reorganisation committee قائم کی گئی ہے۔ مزدوروں کا مطالبہ ہے کہ انہیں مہنگائی الونس دیا جائے لیکن اس کو صنعت کے مفاد کے خلاف تصور کیا جا رہا ہے۔

سن سن کی پیداوار میں ۱۹۴۰ء میں کمی ہوئی۔ نومبر سے گیارہ ماہ میں ۹۵۸۴۰۰ ٹن اور ۱۹۳۹ء میں ۱۰۰۳۷۰۰ ٹن اور ۱۹۳۸ء میں ۱۱۷۵۳۰۰ ٹن سن پیدا ہوا۔

۱۹۳۹ء میں سن کی قیمتیں زیادہ تھیں، اپریل کے بعد سے جنگ کے آغاز تک کمی کی طرف رجحان رہا۔ ۱۹۴۰ء میں فبروری سے ستمبر تک (اس مدت کے اشاریہ نمبر معلوم ہو سکے) متواتر کمی ہوتی رہی۔ سن کی مصنوعات کی قیمت میں ۱۹۳۱ء میں اضافہ ہوا اور ۱۹۴۰ء کے پہلے حصہ میں بھی اضافہ تھا لیکن دونوں سالوں کے دوسرے حصہ میں قیمتوں کا رجحان یکساں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کارخانوں نے اپنے پروگرام میں تخفیف کر دی تھی۔ لیکن اس زمانہ کی قیمتوں میں بھی تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ ۱۹۳۹ء کے نصف آخر میں سن کی مصنوعات کی قیمت میں اضافہ ہوا حالانکہ اسی زمانہ میں ۱۹۴۰ء میں قیمتیں مستقل رہیں۔

برآمد برآمد کے سلسلہ میں صرف اگسٹ ۱۹۴۰ء تک کے اعداد و شمار دستیاب ہو سکے ہیں۔ جنگ کے پہلے سال میں جوٹ کی مصنوعات کی برآمد متاثر نہیں ہوئی لیکن ۱۹۳۹ء میں برآمد کی جو حالت تھی اس کی توقع ۱۹۴۰ء میں نہیں ہے۔ خام سن پر گہرے اثرات ہوئے ہیں۔ قیمتیں بڑھ گئی ہیں اور براعظمی بازارات بند ہو گئے ہیں۔ فبروری ۱۹۴۰ء میں خام جوٹ کی برآمد تقریباً مستحکم رہی لیکن بعد ازاں

اس میں تخفیف ہونے لگی یہاں تک کہ جولائی میں صرف ۸۱۰۰ ٹن کی برطانوی ہند سے برآمد ہوئی۔ اگسٹ ۱۹۴۰ء میں تھوڑا سا اضافہ ہوا ہے بہرحال جنگ کے زمانہ میں خام سن کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔

سن کی مصنوعات کی جملہ برآمد ستمبر ۱۹۳۹ء تا اگسٹ ۱۹۴۰ء ۱۱۲۲۵۸۰ ٹن تھی اور ۱۹۳۸-۳۹ء کے اسی زمانہ میں ۹۶۳۷۳۸ ٹن۔ جنگ کے دوران میں حالیہ اندازہ کے بموجب اب تک کل ۹۷۲۰۰۰۰۰۰ تھیلے ریتی کے تیار کئے گئے۔ ان کی فرمائشیں ایسے وقت وصول ہوئی ہیں جب کہ ان کی کم توقع تھی اور اسی وجہ سے قیمتوں میں فریا کمی نہیں ہوئی۔

چاء بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنگ چاء کی صنعت کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔

جنگ کی وجہ سے نئے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ سلطنت متحدہ "ہندوستانی چاء" کی بڑی منڈی ہے۔ اس پر حکومت کی نگرانی ہونے لگی۔ وزارتِ غذا نے ہندوستان سے ایک قلیل المدت معاہدہ کیا۔ ہندوستان میں بھی چاء کی حیثیت ایک نیم سرکاری صنعت کی ہوگئی۔ ایک نگرانکار Tea controller. کا تقرر کیا گیا ۲۶ ستمبر سے ۶ اکٹوبر ۱۹۳۹ء تک برآمد بند کر دی گئی تاکہ جنگ کے اثرات معلوم کئے جائیں۔

پہلی جولائی ۱۹۴۰ء میں ۳۱۴۹۴۵۶۸۳ پونڈ چاء قابل برآمد تھی حالانکہ جولائی ۱۹۳۹ء میں ۳۲۹۵۹۸۵۹۸ پونڈ۔ ۱۹۴۰ء میں سلطنت متحدہ سے طویل المدت معاہدہ ہوا۔

قیمتیں آغاز جنگ سے اختتام نومبر تک تھوڑا بہت اضافہ ہوا اس کے بعد اس میں تخفیف ہوئی یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء کے اختتام تک قیمتیں قبل جنگ کی سطح پر آ گئیں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ برآمدی بازارات میں اس کی طلب کم ہوگئی اس کمی کا سلسلہ مئی تک جاری رہا اس کے بعد سے برآمد میں پھر اضافہ ہوا۔

انجنیرنگ کی مصنوعات یہ مصنوعات ہماری صنعتی ترقی کے لئے نہایت اہم ہیں لیکن ان کی جملہ درآمد میں تخفیف ہوئی۔ خصوصاً برقی مشنری اور روئی کی مشینوں کی درآمد میں نمایاں کمی ہوئی۔

ہندوستان پانچ ممالک سے مشینیں درآمد کرتا ہے سلطنت برطانیہ، جرمنی، بلجیم، جاپان اور امریکہ سے۔ جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی جرمنی سے مشینوں کی درآمد بند ہوگئی، بلجیم کی فتح کے بعد سے ہندوستان نے اس ملک سے بھی مشینیں منگانی چھوڑ دیں۔ البتہ بقیہ تین ممالک سے درآمد جاری رہی۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء تا جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں جاپان سے ۳،۷۷،۵۶ روپیہ کی مشنری درآمد کی گئی اور سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کے اسی زمانہ میں ۱۰۱۷،۸۹ روپیہ کی۔ برطانیہ سے سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۱،۲۸،۲۵،۵۱ روپیہ کی مشینیں منگوائی گئیں لیکن سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۳۱۱۶۰۸،۷۶ روپیہ کی مشینیں طلب کی گئیں برطانیہ وجاپان سے درآمد میں گویا تخفیف ہوئی اور جرمنی و بلجیم سے درآمد بند ہوگئی۔ اس کی تلافی امریکہ کی درآمد سے ہوئی۔ ان ہی پانچ مہینوں میں سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۱۰۵۴۸۸۱۸ روپیہ کی اور سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۱،۲۷،۴۰،۶۲۱ روپیہ کی مشنری امریکہ سے درآمد کی گئی۔ جنگ کے بعد سے امریکہ کی یہ متواتر کوشش رہی کہ اپنی برآمد بڑھائے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں کامرس رپورٹ میں ایک مضمون

India's Wartime demands for American Products.

بھی شائع کیا گیا۔

صنعتی ترقی کی نوعیت سوال یہ ہے کہ ہماری صنعتی ترقی کی نوعیت کیا ہے اور یہ کہ ہم کس سمت میں قدم اُٹھا رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک بڑے پیمانہ پر جدید مصنوعات کا آغاز نہیں ہوا ہے لیکن اُمید ہے کہ اس سال ہوائی جہاز اور " خود حرکی مشینیں " تیار ہونے لگیں گی۔ حکومت نے ہوائی جہاز کے کارخانوں کی اسکیم سے اتفاق کرلیا ہے اور ضروری مشنری امریکہ میں خرید لی گئی ہے۔ دو صنعتی ادارے اس اسکیم سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ بمبئی کے مشہور صناع مسٹر وال چند ہیرا چند نے ۵ کروڑ کے سرمایہ سے ایک مشترکہ سرمایہ دار کمپنی کھول دی گئی۔ حکومتِ میسور نے بھی اس میں مدد دی ہے تجویز ہے کہ بنگلور میں ہر قسم کے ہوائی جہاز بنائے جائیں۔ کارخانے کے لئے بنگلور میں مقام کا انتخاب بھی ہوچکا ہے۔ امریکہ کے ماہرین کی نگرانی میں طیارہ سازی کا کام شروع ہوگا۔ موٹر سازی کے کارخانے کے قیام کی بھی ایک تجویز مسٹر وال چند ہیرا چند نے پیش کی تھی لیکن

حکومت میسور نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اس لئے یہ اسکیم فی الحال ملتوی ہے۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں رجسٹر شدہ کمپنیوں کے اداشدہ سرمایہ میں ۳ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ غیر معمولی نہیں ہے۔ اس لئے کہ امن کے زمانہ میں بھی تقریباً اتنا ہی اضافہ ہوتا تھا۔

مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کا اداشدہ سرمایہ ۳۱ر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں ۳۰۳،۶۷ کروڑ روپیہ تھا۔ حالانکہ سنہ ۱۹۳۷ء (بزمانہ امن) میں ۳۱۱،۴۲ کروڑ روپیہ تھا۔ گویا تقریباً ۸ کروڑ روپیہ کی کمی ہوئی۔

اگر نئی مصنوعات بڑے پیمانہ پر جاری ہوتیں یا موجودہ مصنوعات میں ترقی ہوتی اور اس طرح زیادہ اصل قائم اور مشین کا استعمال ہوتا تو اس کا اظہار درآمد شدہ مشنری کے اضافہ سے ہوتا۔ لیکن حالت اس کے برعکس ہے۔ جنگ کے پہلے سال میں درآمد شدہ مشنری کی قیمت سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کی بہ نسبت تقریباً ۶ کروڑ کم تھی۔

ان حالات وواقعات سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دورانِ جنگ میں جدید مصنوعات کا قیام عمل میں نہیں آیا اور نہ ہی اصل میں اضافہ ہوا بلکہ موجودہ کارخانوں اور مشینوں سے ان کی پوری قوت پیدا آوری کی حد تک کام لیا گیا۔ البتہ برقی صنعت میں کچھ اضافہ ضرور ہوا۔

حکومت کی امداد اس پس منظر میں چھوٹی اور بڑی صنعتوں کی ترقی کے امکانات پر غور کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی ان مساعی کا جائزہ لیا جائے جو اس نے ہماری صنعتی پیش رفت میں امداد کرنے کی غرض سے جاری رکھی ہیں۔ سر راما سوامی مدلیار وزیر تجارت حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ حکومت ان مصنوعات کو تامین عطا کرے گی جس سے ہندوستان کی جنگی مساعی میں فی الوقت امداد مل رہی ہے۔ اس قسم کی تامین فولاد کے پائپ اور المونیم کی صنعتوں کو دی گئی ہے۔ حکومت بعض ان شرائط کو بھی نظر انداز کرنے کے لئے تیار ہے جو مالیاتی کمیشن کی جانب سے تامین کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ فولادی پائپ کی صنعت کو تامین عطا کرکے حکومت نے ان شرائط کو بڑی حد تک نظر انداز کردیا ہے۔ کیونکہ اس کی خام پیداوار باہر سے منگائی جاتی ہے۔

حکومت نے اس مالی امداد کے علاوہ " Board of Scientific

"Industrial Research" سائنٹفک صنعتی تحقیقاتی بورڈ قائم کیا ہے۔

جنگ کے باعث بعض درآمدی اشیاء میں تخفیف اور بعض اشیاء کی برآمد میں کمی ہونے لگی علاوہ ازیں بعض جنگی ضروریات کی فراہمی کے لئے جدید صنعتوں کو جاری کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل پر غور کرنے کے لئے یکم اپریل ۱۹۴۰ء میں اس بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ مقصد یہ ہے کہ موجودہ صنعتوں کی ہمت افزائی اور جدید مصنوعات کے قیام کی کوشش کی جائے۔ ماہرین سائنس اور صنعت اس بورڈ کے اراکین ہیں۔ اس بورڈ کی نوعیت ایک مشاورتی مجلس کی سی ہے تاکہ جدید مصنوعات کے قیام کے سلسلہ میں حکومت کو صحیح مشورہ دے سکے۔ اس بورڈ کے لئے ۵ لاکھ روپیہ منظور کئے گئے ہیں جس میں سے ایک لاکھ روپیہ بورڈ اپنے انتظامی معاملات پر صرف کرسکتا ہے۔ بورڈ نے دو سو اسکیموں پر غور کیا ہے اور حسب ذیل تحریکات منظور کی ہیں۔

۱۔ نباتاتی روغن (Vegetable Oil) نباتاتی روغن کو مصنوعات کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہندوستان سے روغنی تخم دیگر ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں اور یہ روغنی تخم دیگر اشیاء مثلاً مختلف قسم کے تیل وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہوکر پھر ہندوستان میں واپس بھیجے جاتے ہیں۔ کوشش کی جارہی ہے کہ روغنی تخم کو برآمد کرنے کی بجائے دیگر صنعتی اشیاء کی تیاری کے لئے استعمال کیا جائے۔ تجویز یہ ہے کہ روغنی تخم کا پوست دیگر اشیاء کے استعمال میں لایا جائے اور تخم سے تیزاب و ادویات بنائی جائیں۔ یہ کام ماہرین کے تحت انجام پارہا ہے۔ اور اس کے لئے حکومت ہند کی منظوری سے ۲۰ ہزار روپیہ دئے جائیں گے۔

۲۔ مصنوعی ریشم | مصنوعی ریشم کی تیاری کی کوشش کی جارہی ہے اور اس غرض سے مشنری بھی خرید لی گئی ہے۔

Indian Central Cotton Committee نے ۵۰ ہزار روپیہ ادائی کے لئے نئی مشین Pilot Plant کی خریدی کے لئے دئے ہیں۔ اور بورڈ کی تحریک ہے کہ حکومت ۵۰ ہزار روپیہ مشین کی خریدی کے لئے دئے۔ تجویز یہ ہے کہ حکومت کی منظوری سے یہ کارخانہ بمبئی میں

قائم کیا جائے گا۔

۳۔ ادویاتی کمیٹی | جنگ کی وجہ سے ادویات کی قلت اور گرانی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک ادویاتی کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ارزان اور مفید ادویات کی تحقیق کی جائے یہ کام ڈاکٹر رائے اور دیگر ماہرین کی نگرانی میں انجام پارہا ہے۔ ان کی مدد کے لئے ڈاکٹر صدیقی کا تقرر کیا گیا ہے۔ بورڈ نے اس کمیٹی کے لئے ۲۵ ہزار روپیہ کی منظوری دینے کے لئے حکومت سے سفارش کی ہے۔

سلفر کے لئے کھدائیاں | بعض مقامات پر سلفر حاصل کرنے کے لئے کھدائیاں جاری ہیں۔ اس کام کے لئے دس ہزار روپیہ منظور کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔

راب کمیٹی | راب سے الکحل اور پوٹاسیم نکالنے کے لئے یہ کمیٹی مقرر کی گئی ہے اور اس کے لئے بیس ہزار روپیہ کی منظوری دی گئی ہے۔

فاسفیٹ کی کھاد کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے اس نے اپنی تحقیقات مکمل کرلی ہے۔

ہندوستان میں اخباری کاغذ کے سوائے تمام کاغذ تابین کے تحت تیار ہوتا ہے اخباری کاغذ کے لئے کشمیر، صوبہ متحدہ اور ہمالیہ کے دامنوں میں خام پیداوار کی تلاش جاری ہے۔ ڈاکٹر بھارگو اس سلسلہ میں تحقیقات کررہے ہیں۔

نباتاتی رنگ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے اور اس کام کے لئے حکومت سے ۱۵۰۰ روپیہ منظور کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔

جنگ کے لئے معدنی اشیاء کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مدنظر ابرک اور کرومائٹ (Chromite) کی معاشی مساحت کی طرف توجہ کی جارہی ہے۔ بلوچستان میں کرومائٹ کی ذخائر کی تحقیق کے لئے ایک افسر کا تقرر کیا گیا ہے اور ایک دوسرا افسر بہار میں ابرک کی تحقیق کے لئے مقرر ہوا ہے۔ ابرک ہوائی جہازوں، آبدوزوں، ٹنکیوں اور لاسلکی آلات کے لئے نہایت ضروری ہے

اس لئے حکومت اس کو محفوظ کر رہی ہے اور دشمن ممالک کو اس کی برآمد قطعاً ممنوع قرار دی گئی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں قواعد نگرانی ابرک" Mica Control Order " نافذ کیا گیا ہے جس کی رو سے ناجائز طور پر ابرک نکالنا اور فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بہار میں اس قانون پر سختی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ ابرک کی برآمد پر نگرانی کرنے کے لئے ایک انسپکٹر کا تقرر کیا گیا ہے۔

عمارتی لکڑی، شہتیر کثیر مقدار میں درآمد کئے جاتے ہیں۔ Indian Forest Research Institute Derham. اس کے مختلف بدل معلوم کرنے میں مصروف ہے۔ اور ریل کے لئے موزوں لکڑی کی تلاش جاری ہے صندوقوں کی موزوں لکڑی کے لئے تجربے ہو رہے ہیں۔ تھری گڑوال میں عمارتی لکڑی سے اخباری کاغذ کے لئے مصنوعی گودا تیار کرنے کے متعلق حکومت کو متوجہ کیا گیا ہے۔

لاک:۔ London Lak research Laboratory میں لاک کے نئے مصرف مثلاً وارنش پینٹ وغیرہ دریافت کئے گئے ہیں۔ اس کے برقی خواص معلوم کرنے کے لئے ایک معمل Indian Lak Research Institute قائم کیا گیا ہے۔

چھوٹی اور بڑی مصنوعات کی ترقی کے امکانات

گذشتہ مباحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کئی صنعتوں میں اضافہ اور وسعت کے امکانات موجود ہیں۔ چھوٹی صنعتوں کو خصوصیت کے ساتھ پھولنے پھلنے کا خاص موقع ہے۔ کیونکہ ان مصنوعات کی یورپ سے درآمد تقریباً بند ہو گئی ہے کیمیائی ادویات، نباتی روغن، پینٹ، وارنش، گلاس، الکحل، نباتی رنگ، ان چھوٹی چھوٹی مصنوعات کی ترقی کے لئے وسیع میدان ہے۔

ہندوستان کے صنعتی ارتقار کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف چھوٹی صنعتوں کو ترقی دی جائے بلکہ جدید بڑی صنعتوں کو بھی قائم کیا جائے۔ یہ امر ہمارے لئے باعث طمانیت ہے کہ حکومت جہاز سازی اور ہوائی جہاز سازی کی امداد کر رہی ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ صنعتی ترقی کی رفتار اتنی زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے تاہم

ایں ہم غنیمت است۔ اگر جنگ مزید ایک دو سال جاری رہے تو اُمید ہے کہ ہندوستان کا مستقبل دُرخشاں بن جائے۔ اور ہندوستانی محبانِ وطن کی ایک دیرینہ آرزو برآئے۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں کل ہند صنائع کانفرنس سر ایم وشوسیوا آئر کے زیر صدارت منعقد ہوئی تھی تاکہ دورانِ جنگ میں صنعتی ترقی کی رفتار کو بڑھانے کے امکانات پر غور کیا جائے اس کانفرنس میں ان صنعتوں پر بھی غور کیا گیا جو بعد جنگ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ صنعتی ترقی کی عام مساعی ایک نظم کے تحت ہو، اس سلسلے میں صناعوں، مالی مشیروں اور حکومت کو باہم تعاون کرنا چاہیے۔ حکومت نے جو رعایتی مالی پالیسی اختیار کی ہے اس کو نہ صرف ان مصنوعات تک محدود رکھنا چاہیے، جس سے جنگی ضروریات میں مدد ملتی ہے، بلکہ ان مصنوعات کو تامین عطا کی جانی چاہیے جنھیں زمانہ جنگ میں ترقی دی جا سکتی ہے۔

احمد خان بی۔ اے (عثمانیہ)

سابق مدیر

غزل

افتاد پہ افتاد تباہی پہ تباہی
شاید یہی تقدیر محبت ہے الٰہی

ہر سانس میں کانٹا سا کھٹک جاتا ہے اب بھی
اللہ رے ظالم تری دزدیدہ نگاہی

ہنستے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھ رہا ہوں
ہر پھول پہ ہنستی نظر آتی ہے تباہی

بیزار ہوں بیزار ہوں جینے سے ہوں بیزار
وہ درس دئے ہیں تری دنیا نے الٰہی

وہ مجھ کو ہر ایک بات پہ دیتے رہے چرکے
اور مجھ سے ہر اک بات کی پھر داد بھی چاہی

یہ کون نگاہوں سے مری دور ہوا ہے
چھائی نظر آتی ہے ہر اک شئے پہ سیاہی

دنیا سے شکایت نہیں رونا ہی تو یہ ہے
اب وہ بھی مرے حال پہ ہنستے ہیں الٰہی

اب اپنے کئے پر وہ پشیمان ہیں جامیؔ
جو کھیل سمجھتے تھے مرے دل کی تباہی

خورشید احمد جامی

Mr. JAMEEL AHMAD FAROOQI, B. Sc. (Osman.)

One of the most prominent figures among the University Students, and an Ex-Secretary of the Union who played the silent role of a moving spirit in the life of the University. He has also recently made his mark as a dynamic poet.

AZAM STEAM PRESS.

جواب

یہ میری شومیٔ قسمت کہ تم کو پا نہ سکا
غرورِ عشق امارت کے بُت کو ڈھا نہ سکا

قسم ہے رات کے جاگے ہوئے ستاروں کی
اُداس چاند کی غم آشنا نگاہوں کی

تبسموں میں نہاں سوزِ آتشیں کی قسم
غم و گداز میں ہنستی ہوئی جبین کی قسم

جو پوری ہو نہ سکے ایسے آرزو کی قسم
جبینِ عشق سے بہتے ہوئے لہو کی قسم

مآلِ سوزِ محبت سے سوگوار نہ ہو
کسی کے دل کی تباہی پہ اشکبار نہ ہو

پرائے غم کا کوئی آشنا نہیں ہوتا
شکستہ دل کا کوئی آسرا نہیں ہوتا

وہ حُسن کیا جو محبت میں سر جھکا نہ سکے
وہ عشق کیا جو سرِ دار مسکرا نہ سکے

ہوئی نہ جان شکیبا رہین آہ و فغاں
تبسموں میں رہا ہے غمِ حبیب نہاں

وفورِ غم نے بنایا ہے دل کو سوگ پسند
غمِ حبیب سے ہیں نغمہ ہائے عشق بلند

بگڑ جو جائے مقدر بنا نہیں سکتے
نقوشِ غم کو بہ آنسو مٹا نہیں سکتے

جمیل احمد فاروقی۔ بی ایس سی (عثمانیہ)

"عہدِ نبوت صلعم میں دنیا کی اخلاقی اور مذہبی حالت"

مضامین مقابلہ میلاد شریف اقامت خانجات میں میلاد کمیٹی نے اس مضمون کو مستحق انعام اول قرار دیا۔ "ادارہ"

مذہب کی تاریخ انسان کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی ہے اور اس کا قیام بھی بنی آدم کے قیام کے ساتھ ساتھ وابستہ ہے' انسان اور مذہب دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ہے چنانچہ حیاتِ انسانی پر کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب مذہب اور انسان کا تعلق ٹوٹ گیا ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ مبارک وہ دور ہے جب کہ ایک طرف تو مکہ سے آفتابِ اسلام آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بہت جلد مکہ معظمہ سے ضیا بار ہونے والی توحید کی شعاعوں سے جگمگا اُٹھے گی اور دوسری طرف دنیا کے سارے الہامی مذاہب اپنی حقیقتیں اور صداقتیں گم کر چکے تھے جس کی وجہ غیر الہامی مذاہب نے حق و صداقت کا نام لے کر کائنات انسانی کو گمراہی و ضلالت میں گرا رکھا تھا اور سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں دنیا میں مذہب کا وجود ہی نہ تھا' صرف انسانی خیالات داوہام کا نام مذہب قرار پاگیا تھا جو دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا تھا تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لئے سند کے طور پر کام آئے اور محض نجات کے طالب اور دنیوی معالات میں برکت کی خواہش کرنے والوں کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ وہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھیں۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر جاری رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ گنتی کی مذہبی رسوم کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کر لیا جائے لیکن جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لئے ضروری تھا کہ زندگی کے تمام شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ "جب مذہب نے تہذیب و تمدن پر

"عہدِ نبوت صلعم میں دنیا کی اخلاقی اور مذہبی حالت"

مضامین مقابلہ میلاد شریف اقامت خانجات میں میلاد کمیٹی نے اس مضمون کو مستحق انعام اول قرار دیا۔
"ادارہ"

مذہب کی تاریخ انسان کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی ہے اور اس کا قیام بھی نبی آدم کے قیام کے ساتھ ساتھ وابستہ ہے' انسان اور مذہب دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ہے چنانچہ حیاتِ انسانی پر کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب مذہب اور انسان کا تعلق ٹوٹ گیا ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ مبارک وہ دور ہے جب کہ ایک طرف تو مکہ سے آفتابِ اسلام آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بہت جلد مکہ معظمہ سے ضیا بار ہونے والی توحید کی شعاعوں سے جگمگا اُٹھے گی اور دوسری طرف دنیا کے سارے الہامی مذاہب اپنی حقیقتیں اور صداقتیں گم کر چکے تھے جس کی وجہ غیر الہامی مذاہب نے حق و صداقت کا نام لے کر کائنات انسانی کو گمراہی و ضلالت میں گرا رکھا تھا اور سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں دنیا میں مذہب کا وجود ہی نہ تھا' صرف انسانی خیالات داوہام کا نام مذہب قرار پا گیا تھا جو دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا تھا تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لئے سند کے طور پر کام آئے اور محض نجات کے طالب اور دنیوی معالات میں برکت کی خواہش کرنے والوں کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ وہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھیں۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر جاری رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ گنتی کی مذہبی رسوم کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کر لیا جائے لیکن جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لئے ضروری تھا کہ زندگی کے تمام شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ "جب مذہب نے تہذیب و تمدن پر

اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی علائق سے نفرت، تنافر، تعصب اور اسی قسم کے عناصر شامل کر دئے اور اگر تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد مادیت اور خواہشات نفس کی اتباع پر تھی، مذہب پر اثر ڈالا تو اس میں نفس پرستی کی نجاستیں داخل کر کے گندہ کر دیا، یہی وجہ ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں میں بے حیائی اور لذت پرستی کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان کے پیرو بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں[1]"۔ مذہبی لوگ نجات کے اعلیٰ وارفع درجے حاصل کرنے کے لئے دنیا سے الگ رہے اور دنیا والوں نے ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافی، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالی اور ہر قسم کی تمدنی کج راہی کے ساتھ اپنی زندگی کے اس ضمیمہ کو منسلک کر دیا اور بقول مولوی ابوالاعلیٰ مودودی "مذہب نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارتگری کا بھی، سود خواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور تحبہ گری کا بھی[2]" بہرحال اس کی وجہ پیدا ہونے والے فتنوں نے خونریزیوں، سفاکیوں اور مصیبتوں کے جہنم سلگا کر رکھ دئے اور دینی و دنیوی اقتدار رکھنے والوں نے دنیا میں دو متضاد نظام اخلاق قائم کر دیئے تھے "ایک نظامِ اخلاق تو روم اور ایران کے شاہنشاہوں، رئیسوں، امیروں اور دولت مندوں کا تھا جو ہر قسم کی دنیوی شان و شوکت، دنیوی جاہ و جلال اور دنیوی آرایش و نمایش کے اظہار کا ذریعہ تھا، دوسرا نظام اخلاق یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کا تھا جس میں انتہا درجہ کی بوسیدگی، انتہا درجہ شکستگی، انتہا درجہ کی خشکی اور انتہا درجہ کی ترشروئی پائی جاتی تھی[3]"، اور بقول ڈاکٹر گستادلی بان "اگر اقوام روم و یونان و ایشیا کی اُس حالت کو جو بعثت کے وقت تھی ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا متخیلہ ایک مدت سے سوچکا تھا،

[1] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" ابوالاعلیٰ مودودی ص ۸۵۔ [2] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" ص ۸۶۔ [3] "رہبانیت اور اسلام" عبدالسلام ندوی۔

اُن کے دلوں پر نہ تخیل حب الوطنی کا اور نہ پُرانے قومی دیوتاؤں کی پرستش کا کوئی اثر باقی رہا تھا، ایک خاص اور محض نفسی خود غرضی رہ گئی تھی[1]"،

اس دور مشترکانہ کی خصوصیات میں غلامی، عورت آزادی، دختر کشی، شراب خواری اور قمار بازی کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے فحش اور ناگفتہ بہ حالات بھی شامل ہیں۔ ہر ایک ملک میں ایسے مندر تھے جہاں حیاسوز واقعات ہوتے اور اُن میں مرلیاں چڑھاوے کے طور پر چڑھائی جاتی تھیں، کسی قوم میں وحدت کا تخیل موجود نہ تھا۔ ہندوؤں میں برہما، شو اور وشنو کی تثلیث اور دیگر ہزارہا دیوی دیوتا، بدھ مت والوں میں بدھ، دھرما اور سنگھا کی تثلیث، مصر میں اوسی رس ایمن اور تہاہ کی تثلیث، یونان میں منردا، جوپیٹر اور بکسش کی تثلیث، عیسائیوں میں باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث اور یہودیوں میں تجسیم کا رواج تھا۔ اور اس حقیقت سے کوئی واقف نہ تھا کہ

"حقیقت میں خدا ایک ہی ہے، اگر زمین، آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ہوتے تو بڑا فساد مچ گیا ہوتا[2]"،

عرب دنیا پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینے کے بعد جب ہم اُس قوم کی طرف پلٹتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قوم جہالت، بیہودگی اور توہم پرستی کے گڑھے میں گری پڑی ہے۔ عرب اپنی تمام صفات شجاعت و دلیری کے باوجود بے آئین، بیرحم اور وحشی ہیں۔ یہ بہادر ہیں، بے خوف ہیں، فیاض ہیں، عہد کے پابند ہیں، آزاد خیال اور آزادی کو پسند کرنے والے ہیں، اپنی عزت پر جان دیدینا اُن کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا، سادہ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے ہاں آئے دن خونریز لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، جنگ و جدال اور حرب و قتال نے تمام ملک کو میدانِ کارزار بنا رکھا ہے، جس کا جس پر بس چلتا ہے اُسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قبضہ کر لیتا ہے اور دوسرے کی عزت و مال کو اپنے لئے بہترین مصرف قرار دیتا ہے، آدمی کی جان کی ان کے نزدیک کوئی قیمت نہیں، اخلاق اور تہذیب سے عاری ہیں، بدکاری، شراب خواری اور جوئے بازی میں طاق ہیں، ایک دوسرے کے سامنے

[1] "تمدن عرب" ڈاکٹر گستاولی بان۔ [2] قرآن کریم۔

بے تکلف برہنہ ہوجاتے ہیں، عورتیں تک برہنہ ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کرتی ہیں۔ آزادی کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص کسی قاعدہ، قانون یا اخلاقی ضابطہ کی پابندی پر آمادہ نہیں، اس پر جہالت کا یہ عالم کہ ساری قوم پتھر کے بتوں کو پوجتی ہے، راستہ چلتے کوئی اچھا سا چکنا پتھر مل جاتا ہے تو اسی کو سامنے رکھ کر پرستش کر لیتے ہیں

"حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام کے تعمیر کئے ہوئے کعبہ میں خدا کی بجائے تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش کی جاتی ہے، دوسرے بت لوگوں کے گھروں پر تسلط جمائے ہوئے ہیں، بعض لوگ فرشتوں یعنی "بنات اللہ" کی پرستش کرتے ہیں جو اپنے باپ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوسکتی ہیں، بعض سورج اور چاند کی عبادت کرتے ہیں اور عملی طور پر ہر شخص ستاروں کے اقتدار کا قائل ہے"۔[1]

اساف، نائلہ، لات، منات، ہُبل وغیرہ بعض بُت بڑے باعظمت خیال کئے جاتے اور جو گردنیں کسی کے سامنے نہ جھکتیں وہ پتھروں کے سامنے جھک جاتیں اور سمجھا جاتا کہ یہ پتھر ان کی حاجت روائی کریں گے۔ کوئی بُرے سے بُرا فعل بھی ایسا نہ تھا جس سے کوئی شرمائے، فحش باتوں سے پرہیز تو درکنار ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ دوشیزہ لڑکیوں کے نام اشعار لکھ کر بازار میں گائے جاتے اور کوئی ولولہ ایسا نہ تھا جو چھپا کر رکھا جاتا ہو۔ روپیہ کمانے کے لئے بُرے سے بُرا فعل بھی جائز تھا، سودخواری ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا ڈاکہ زنی اور رہزنی سے دولت جمع کرنا کوئی فعل قبیح نہ تھا۔ حتیٰ کہ لونڈیوں کو ناچنا گانا سکھا کر بازار میں بٹھایا جاتا اور اس سے جو آمدنی ہوتی وہ مالک کا حق ہوتا۔ سوتیلی ماں سے نکاح جائز تھا، لڑکیاں موجب شرم سمجھی جاتیں اور اکثر لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کردیا جاتا، بعض گروہ خداؤں اور دیویوں کو خوش کرنے کے لئے انسانی قربانی کرتے تھے اور دیویاں عیسائیوں کی قربانیوں کو ترجیح دیتی تھیں۔ رومی مورخین لکھتے ہیں کہ

"عربوں کو تمام متمدن دنیا میں ناقابل اعتماد دوست اور غیر معتبر دشمن کا ناقابل رشک درجہ

[1] "پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" علامہ شیخ خالد لطیف گابا ص۲۱

دیا جاتا تھا"۔[1] لیکن ان سب باتوں کے باوجود عہد نبوی میں ہم دیکھتے ہیں کہ

"ایک عام رجحان مذہبی اور ملکی اتحاد کی طرف پیدا ہوچکا تھا اور اس کی علامتیں موجود تھیں۔ جس طرح سے رومی شہنشاہوں کے وقت میں قدیم دیوتاؤں سے نفرت پیدا ہو چلی تھی اسی طرح عربستان میں بھی اسی قسم کی نفرت ظاہر ہو چلی تھی، پُرانے اعتقادات کی حکومت اور پُرانے بتوں کی عزت جا چکی تھی۔ یہ اعتقادات بہت پرانے ہوچکے تھے اور دیوتاؤں میں کچھ دم باقی نہ رہا تھا"۔[2]

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں عرب پر دانت لگائے بیٹھی تھیں کیونکہ معاشی حیثیت سے عرب کا ملک کچھ زیادہ مفید نہ سہی لیکن وہ ایک تو یورپ و ہند کی بین الاقوامی تجارت کی گزرگاہ تھا اور دوسرے ملک گیری کے لئے عرب قوم سے زیادہ طاقتور شاید ہی کوئی اور قوم ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ملک عرب میں تقریباً ہر مذہب کے پیرو موجود تھے اور عیسائی خاص طور پر عربوں کو اپنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھے۔ ان مختلف مذاہب کے پیروؤں میں "یہودی" یہود قوم بھی نمایاں تھی حالانکہ اس کے مقاصد کو عیسائیوں سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اس وقت دنیا میں شاید یہی ایک قوم تھی جس میں توحید و رسالت کے عقائد کی بو اور دوزخ و جنت، حشر و نشر اور ملائکہ اور انبیاء پر ایمان لانے کی ضرورت کا تھوڑا بہت احساس موجود تھا، توریت کو پڑھتے بھی تھے، یہ اور بات ہے کہ تمام صورتیں ناقص صورت میں موجود تھیں، مگر موجود تھیں بعثت سے پہلے مدینہ کے یہود انصار کو یہ کہہ کر دھمکایا کرتے تھے کہ عنقریب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں ہم اُن کے ساتھ ہوکر تم سے لڑیں گے اور تم پر غالب آجائیں گے لیکن جب حضورؐ نے دعویٰ نبوت فرمایا تو یہی آپؐ کے اور آپؐ کے دین کے سب سے بڑے دشمن بن گئے۔ حضور نبی کریمؐ نے ان سے معاہدات کئے اور ان کو اپنا دوست بنا کر طرح طرح کی مہربانیاں، مراعات اور سلوک کرتے رہے لیکن یہ کبھی اپنی شیطنت اور شرارت سے باز نہ آتے اور ہمیشہ دشمنان اسلام قریش سے ان کی

[1] و [2] "تمدن عرب" ڈاکٹر گستاولی بان۔

ریشہ دوانیاں جاری رہتیں۔ چنانچہ قبیلۂ بنو قریظہ نے انتہائی مراعات وکرم اور دوستانہ معاہدہ کے باوجود حی بن اخطب کے جوش دلانے پر انتہائی نازک وقت میں دھوکہ بازی کی اور جب بعد میں باز پرس ہوئی تو صاف مکر گئے کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ محمدؐ کون ہے؟ اور معاہدہ کیسا ہے؟۔ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جن کی وجہ ان کی اخلاقی کمزوری خود غرضی اور نفس پرستی کو چھپا کر نہیں رکھا جاسکتا اور بقول ڈاکٹر گستاولی بان "یہودیوں کی تاریخ جھوٹ، ناشکری، ذلیل قسم کی بزدلی، متکبرانہ خود غرضی خونریزی بے رحمی اور شدید قسم کی ضعیف الاعتقادی سے بھری پڑی ہے[۱]"

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی صدہزار قربانیوں کے باوجود بھی ان کو اپنی رحمتوں کے لئے خاص کرلیا تھا اور اس قوم پر یہ کرم خاص تھا کہ ان کے اندر ہر زمانہ میں ان کی ہدایت وتربیت روحانی کے لئے ایک نبی موجود رہا لیکن انہوں نے کبھی ان کی قدر کی نہ ان کی عظمت پہچانی، اُلٹا نبیوں کو طرح طرح سے ستایا اور ان کی نافرمانیاں کیں حضرت زکریا علیہ السّلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو علانیہ قتل کیا اور اپنے تئیں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو بھی انھوں نے سولی پر لٹکا ہی دیا اور آخر میں جس زمانہ کا ہم ذکر کررہے ہیں اس میں حضورؐ کے قتل کی سازشوں میں شریک رہے اور چراغ مصطفوی کو بھی بجھانے کی اور ہر ممکن سعی کی اور کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ عرب سے باہر کسی قوم میں یہودیوں کی کوئی حیثیت نہ تھی لیکن عرب میں یہ بہت بڑے اقتدار کے مالک و حامل تھے، ان کے پاس مضبوط قلعے، بڑھیا آلات حرب اور کثیر دولت تھی جس کی وجہ ان کا وہ سودی کاروبار تھا جسے وہ کثرت سے کرتے تھے کہ اس کے مقابلے میں دوسری تجارتوں کو چھوڑ بیٹھتے تھے۔ حرص وطمع کی وجہ ان میں ہر قسم کی لالچ اور اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور عربوں سے قدیم لین دین اور تجارتی تعلقات کے باوجود ان کا عقیدہ تھا کہ عربوں کے ساتھ جس قدر بھی بد دیانتی کی جائے جائز ہے"۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو زیورات کی لالچ میں پکڑ کر جنگلوں میں بے رحمی سے ذبح کردیتے اور زیور اُتار کر اُن کی نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالتے چوری ان کے لئے معمولی بات تھی۔ راتوں کو آبادیوں میں پھرتے اور لوگوں کو لوٹ گھسوٹ لے جاتے

[۱] "تمدن عرب" ڈاکٹر گستاولی بان۔

عیش وآرام اور اس کے ساتھ شراب اور اس کے لوازمات سے کسی قسم کا پرہیز نہ کرتے اور کہتے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور پیارے ہیں ہمیں دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی اور اگر چھوئے گی بھی تو چند روزہ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جنت کی نعمتیں صرف ان کے لئے ہیں اور نبوت اور رسالت صرف ان کے لئے مخصوص ہے اور کسی دوسرے کا اس پر حق نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم خدا کے محبوب ہیں۔ اس لئے ہم جو کچھ بھی کریں قیامت میں اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ ان کے پیشوا اور عالم خدا کے احکام کو اپنی باطل تاویلوں سے بدلتے رہتے اور اپنے قیاسات واجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے اور بے چارے ان پڑھ جاہل ان کے گڑھے گڑھائے اور سُنے سنائے قصوں پر یقین وایمان رکھتے احکام الٰہی میں سے جو حکم آسان اور ضرورت کے موافق ہوتا اُسے پورا کرتے اور دوسرے احکام کو پس پشت ڈال دیتے۔ ہر روز ایک مذہبی فتنہ پیدا ہوتا جس میں کشت وخون کی نوبت آجاتی۔

"طاقتور کمزور کو، بڑا چھوٹے کو، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور
یہ موسوی بھیڑیں درندوں کا گلہ بن کر رہ گئی تھیں[۱]"!

ان کے عقائد واعمال میں اس ابتری کی بڑی وجہ صحیح تعلیم کا ناپید ہوجانا اور توریت کا اصلی صورت اور اصل زبان میں باقی نہ رہنا تھی۔

عرب سے باہر نکلتے وقت ہم دیکھتے ہیں کہ اطراف عرب، یمن، یمامہ، غسان، حیرہ، بحرین، اور عمان میں روم وفارس کے ماتحت جو ریاستیں ہیں وہ تو سرتاپا روم وایران کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ عرب کے شمال میں روم کی وسیع سلطنت ہے جو مغربی سمندر کی پہنائیوں سے پار تک پھیلی ہوئی ہے۔

"روم" اس وسیع اور عظیم الشان سلطنت پر شہنشاہ ہرقل قیصر کی حکمرانی تھی لیکن چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں ہی روم کی سلطنت زوال کی طرف مائل ہوچکی تھی۔ عام تمدنی واخلاقی ابتری کے ساتھ مذہبی حالت اس سے بھی زیادہ مایوس کن تھی۔ بت پرستی وکواکب پرستی بھی ہو رہی تھی اور باپ، بیٹا

[۱] "مولانا سید فضل اللہ شاہ"

اور روح القدس کی خدائی پر بھی ایمان ڈانواں ڈول تھا۔ ان تمام ملکوں میں جہاں رومی اثر کے تحت عیسوی مذہب پھیلا تھا پادریوں اور راہبوں نے آپس میں اچھی خاصی جنگ ٹھان رکھی تھی اور مذہبی اختلافات اور مناصب کے حصوں کے لئے کشت و خون معمولی بات تھی۔ ایک مرتبہ ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک مرتبہ میں ایک سو ستائیس آدمی کام آئے۔ اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عقیدتمند حصول زر کے لئے اپنی جان دینا فخر سمجھتے تھے جس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہی تھی کہ ان جنگ جوؤں کے ہاتھوں مذہب تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ ساتویں صدی کے آخر تک مسیحیت کی جو حالت رہی وہ اس کے لئے باعث ننگ ہے۔

"عیسائی مذہب میں بے انتہا اختلافات اور آسمانی بادشاہت میں شیطنت حکمراں تھی شیطان خوش آئند حفاظت کے ساتھ زمین پر اکڑ کر چل پھر رہا تھا۔ تثلیث میں توحید اور توحید کی رنگارنگی کے متعلق جو اختلافات تھے ان سے دوسرے درجہ پر وہ اختلافات تھے جو مسیحؑ کے خطبات نے پیدا کردئے تھے' یسوع مسیحؑ نے صرف بیٹا بننے پر قناعت کی تھی لیکن اُن کے پیرو "باپ" اور "مائیں" بن گئے علاوہ ازیں "بہنوں" کے وسیع قبائل بھی تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اس ملک کی عیسائیت دنیا کی آبادی کو راہبات بہم پہنچانے کے لئے ہے"[۱]

عیسوی مذہب میں بت پرستانہ عقیدوں کو جگہ دی جارہی تھی' روح القدس' حوارئین اور دیگر مسیحی سلاطین کے مجسموں کو اس کثرت سے پوجا جانے لگا تھا کہ اس کی نظیر بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی اسی زمانہ میں ایک گروہ "مریمی" پیدا ہوا جو حضرت مریم کو بھی شریک الوہیت کرنے لگا اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لیکر رفتہ رفتہ عیسائیت میں داخل کئے گئے اور کلیسا نے انھیں بخوشی شرف قبولیت بخشا چنانچہ "دس احکام" کی موجودگی میں دوسری اقوام کو

[۱] "پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" ص ۱۲۱

اپنی طرف مائل کرنے کے لئے خوش قسمتی سے ان پر ایک گیارہواں اور اہم حکم غالب تھا "اگر تو نے گناہ کیا تو اس کو ظاہر نہ ہونے دے تاکہ تو گناہ کے ثمرات سے لطف اُٹھانے کے لئے زیادہ دیر تک زندہ رہ سکے"۔ پادری عموماً مالدار ہوا کرتے تھے اور جتنی نفیس غذائیں ایک پادری کے دسترخوان پر ہوتیں اُتنی ایک بادشاہ کو بھی نصیب نہ تھیں۔ ان پیشواؤں اور بادشاہوں کا اثر عام رعایا کے اختلاف اور کردار پر پڑا جس کے نتیجہ کے طور پر اخلاقی ہوس پرستی اور اسراف مسیحی دنیا میں سرایت کرگیا۔ لوگ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے دولت حاصل کرتے اور لہو لعب اور عیاشی میں اُڑا دیتے۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا جو شخص کسی دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ حاصل کرتا اُسے اُتنا ہی بلند درجہ مل جاتا تجرد اور رہبانیت دینداری کا سب سے اہم جزو تھے اور طرح طرح کی مضحکہ خیز حرکتوں کو عبادات کا درجہ دیا جاتا۔ کوئی تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھالیتا' کوئی اپنے کو دلدل میں ڈال دیتا۔ کوئی سائے میں بیٹھنے کو حرام قرار دے لیتا۔ ماں' باپ' عزیز و اقارب' اہل و عیال سے نفرت اور پرہیز کمال تقویٰ سمجھتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اسی قسم کے خیالات و عقائد کو عیسائیت کے نام سے دنیا میں پھیلانے میں روم کا سب سے بڑا حصہ ہے چنانچہ عرب میں بھی قانون اور معین اصول اخلاق کے نہ ہونے کے باعث اُنھوں نے عرب ذہنیت میں ایک خاص دلچسپی لی لیکن اُنھیں دوسری جگہوں کی طرح یہاں کامیابی نہ ہوئی۔

"ایران" ایران میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ پہلے زردتشت کے ساتھ ساتھ تثلیث کا تخم بو دیا گیا تھا اور اس کا پودا ملک میں آہستہ آہستہ نشو و نما پاتا رہا ۵۳۱ء سے لے کر ۵۷۹ء یعنی بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تک ایران اسی زردشتی اور تثلیثی فتنہ میں مبتلا رہا اور اسی کشمکش میں ۵۷۹ء میں نوشیروان نے وفات پائی اور اس کے بعد ہرمز چہارم نے تخت سلطنت پر جلوس کیا لیکن بغاوت کے سلسلوں اور اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ ساتھ اندرونی بدنظمیوں اور باہمی خانہ جنگیوں کے غیر مختتم سلسلے نے ہرمز کو پنپنے نہ دیا امرا کی عیش پرستی اور عوام کی بداخلاقی میں روز روز ترقی ہوتی گئی اور ان کا سیاسی انحطاط بڑھتا گیا اور وہ سرزمین جو کسی زمانہ میں فارسی علم و ادب کا گہوارہ تھی

اور جس کی آب وہوا میں بڑے بڑے شعرا اور ادیب، حکما اور عقلا پرورش پاتے تھے حوادثات وانقلابات طبائع سے آپس میں خانہ جنگیوں کے سبب خون سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ اب فارس کے آتشکدہ میں روحانی زندگی کے لئے کوئی چنگاری بھی نہ تھی جو شعلہ زن ہو اور ظلمت خیر و شر نیکی و بدی کے فلسفے نے ایران کی عملی طاقت فنا کر کے بیسیوں چھوٹے چھوٹے فرقے پیدا کر دئے جن میں سب سے زیادہ اہم "مانوی" فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت سے مرکب تھا۔ آخر میں مزدکی فرقہ کی بیہمانہ تعلیم ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی کمزور کر دیا۔ نوشیروان نے شاہانہ اقتدار اور قوت استبداد سے اس فتنہ کو بیتہرا دبایا لیکن ایران کی اخلاقی زندگی اس کے خون کے چھینٹوں کے بعد بھی تشنہ ہی رہی۔ ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایران کی سرزمین عرصے توحید سے گوش آشنا نہ ہوئی تھی اور اخلاق کے بہت سے شعبے ایسے تھے جو تاریکی میں گم تھے۔ گو وہ اپنے آپ کو توحید کی لڑی میں منسلک کرنے کے دعویدار تھے مگر ان کی یہ آرزو اور تلاش کبھی زردشتی دائرے میں داخل ہو کر سرد پڑ جاتی اور کبھی مانی کے آغوش میں گم ہو جاتی اور کبھی صابی دام میں پھنس جاتی کتنے رنگ چڑھے اور اُترے، کتنے دور آئے اور گئے، کتنی جنبشیں کی گئیں مگر ان کی ہر حرکت اور سکون صاف گواہ ہے کہ ان کی ہر ایک آرزو باطل تھی اور ان کی ہر اشتہا کاذب تھی۔

زردشتی مذہب جو ایران کی اکثریت کا مذہب تھا پہلے کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو لیکن عہد نبوی میں یہ محض عقاید کا مجموعہ رہ گیا تھا اور استبداد زمانہ سے شرک کی گھاٹیوں میں پھنس گیا تھا اور ان کی وہ کتاب جسے وہ الہامی بتاتے تھے ان کے علما کی دستبرد سے معرض تحریف میں آگئی تھی اور انتہا یہ ہے کہ ان میں آگ کی پوجا کا رواج ہو گیا اور آتش پرستی شروع ہو گئی۔ انھوں نے خدائے واحد کو دو خداؤں میں تقسیم کر دیا تھا نیکی کے خدا کو یزدان اور بدی کے خدا کو اہرمن کہتے تھے اور اُس وقت بھی جبکہ دنیا ابھی اپنے پیروں پر بھی نہ کھڑی ہوئی تھی اُنھیں قرب قیامت کا ایسا ہی یقین تھا جیسا کہ آج ہے۔

"مصر" مصر میں عیسوی مذہب ایران سے پہلے پہنچا لیکن وہاں اس کی صورت دوسری تھی یعنی

مصر میں عیسوی مذہب جبر و تشدد کے ذریعہ پھیلایا گیا۔ ۳۸۹ء میں شہنشاہ تھیوڈریس نے کل قدیم عبادت گاہوں اور دیوتاؤں کی مورتوں کو تڑوا دیا اور قدیم عبادت کی ساری نشانیاں مٹوا دیں۔ عہد نبویؐ میں مصر کا سارا ملک اسی مذہبی جہالت کی توڑی ہوئی عمارتوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں کہ

"اس وقت یہ صرف عیسوی مذہب کے اُن مختلف فرقوں کی رزم گاہ بن گیا تھا جو اس زمانہ میں بکثرت پیدا ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو کفر کا فتوی دیا کرتے اور آپس میں جھگڑا کرتے تھے اور مصر مذہبی مناقشوں سے مجروح اور حکام کے مظالم سے تباہ ہو رہا تھا" [1]

عربوں کے آنے سے پہلے مصریوں نے صرف ایک دفعہ اپنا مذہب تبدیل کیا تھا اور وہ اسی زمانہ میں جبکہ قسطنطنیہ کے شہنشاہوں نے ملک میں غارت گری بپا کی اور تمام پرانی یادگاروں کو برباد ومنہدم کر دیا تھا اور پرانے مصری معبودوں کی پرستش کو جرم قرار دیا تھا جس کی سزا موت تھی مصریوں نے اس مذہب کو جو اس قدر جبر کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا منظور تو کر لیا لیکن قبول نہ کیا تھا اور جس سرعت کے ساتھ اُنھوں نے عیسائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جابرانہ مذہب کا تسلط اُن کے قلوب پر حد درجہ کمزور تھا — مصر سے پرے یعنی ممالک حبش، مراکش اور الجزائر و تونس وطرابلس جہاں اقوام بربری بستی تھیں قرطاجنہ کے دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی اور یہ اپنے بچوں کو زحل پر بھی چڑھاتے تھے اور آگ کو بھی پوجتے تھے۔ عیسائی تسلط کے وقت ان میں سے بہت سے قبیلوں نے جو عیسائی بستیوں سے قریب تھے عیسائیت قبول کر لی تھی۔

"یورپ" مغربی دنیا کے وہ ممالک جو آج تہذیب وتمدن کا مرکز ہیں اور مادی ترقی کے ساتویں آسمان پر پہنچ چکے ہیں اس وقت بڑی بری حالت میں تھے۔ تہذیب کی اُنھیں ہوا تک نہ لگی تھی اور یہ وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جنوبی حصہ مشرقی اقوام سے تھوڑا بہت متاثر ہو چلا تھا لیکن شمال میں وحشی اقوام بستی تھیں۔ آہستہ آہستہ رومی اثر سے یہاں بھی عیسائیت پھیل رہی تھی۔

[1] "تمدن عرب"

چھٹی صدی کے قریب شمالی وحشی قوموں ونڈال آلن، سوابو وغیرہ نے فرانس کو برباد کرنے کے بعد اندلس پر حملہ کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو دوسرے وحشیوں نے مغلوب کیا اور چھٹی صدی عیسوی میں اندلس پر قبضہ کرلیا۔ یہ وحشی بہت جلد اُن لاطینی اقوام کے ساتھ جو اندلس میں موجود تھیں مل گئے زبان لاطینی اُن کی زبان ہوگئی اور انھوں نے اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ لیکن ان یورپی اقوام کی حالت صلیبی جنگوں تک بھی نہایت ابتر تھی اور یہ جہالت کی تاریکی میں پھنسی ہوئی تھیں چنانچہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلیبی مثل وحشیوں کے تھے، دوست دشمن دونوں کو بلاامتیاز لوٹتے اور قتل کرتے تھے چنانچہ انھوں نے قسطنطنیہ کے انمول یونانی اور رومیوں کے صنعتی اور علمی ذخیروں کو برباد کردیا۔ عوام تو عوام امرا تک کی حالت درست نہ تھی چنانچہ موسیو بار تھے سینٹ ہلنز یورپ کے امرا کی زبوں حالت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"یہ امر نہایت مشکوک ہے کہ اگر بعد میں اسلام اثر انداز نہ ہوتا تو عیسوی مذہب خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو ان میں اچھے اخلاق پیدا کرسکتا۔" ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے کہ

"نویں اور دسویں صدی تک بھی ہمارے امرا نیم وحشی حالت میں رہتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ ان کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے جاہل راہب تھے جو اپنے وقت کو خانقاہوں کے کتب خانوں سے یونان و روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر اُن کو چھیلنے اور اُن چرمی اوراق پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے پر صرف کرتے تھے حتیٰ کہ گیارہویں صدی میں چند روشن خیال اشخاص نے اس جہالت کے کفن کو پھاڑ کر اُس زمانے کے اساتذہ یعنی عربوں کی طرف رجوع کیا۔"[1] اور اس کے بعد عیسائیوں نے اپنی وحشیانہ معاشرت چھوڑی اور بہادرانہ اخلاق اور اس کے کل فرائض یعنی عورتوں، بوڑھوں، بچوں کا پاس، قسم کی پابندی وغیرہ کو عربوں سے اخذ کیا ورنہ عہد نبوی میں یورپی جاہل، ذلیل، درندہ صفت اور بدعہد تھے۔ برطانیہ عظمیٰ میں بت پرستی ہو رہی تھی، بعض پادری مسیحی دین کی تبلیغ کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہو رہی تھی۔

[1] "تمدن عرب"

"آئرلینڈ کے اسکاٹ اور اسکاچستان کے باشندے کامل طور پر بت پرستی میں مبتلا تھے اور ۵۶۳ء میں سینٹ کولمبا نے ان کو عیسائی بنانے کی کوشش کی لیکن بڑی حد تک ناکام رہا۔"[1] کیرل رینسم کا دعویٰ ہے کہ چھٹی صدی کے آخر تک جنگلی قبائل، نیارٹن کے باشندے اور آئرستان اور کلائیڈ کی کھاڑی کے جنوب میں جتنے برطانی آباد تھے وہ برائے نام تو ضرور مسیحی ہوگئے تھے۔ لیکن خود مسیحی مذہب کی حالت اُن دنوں نہایت زبوں تھی۔ بہتر ہے کہ عیسائیت اور اُس کی اُس وقت کی حالت علامہ شیخ خالد لطیف گابا کی زبانی بیان کردی جائے۔ "وہ مذہب جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے سکھایا اور جس کی تشریح اُن کے قریبی حواریوں نے کی شرافت انسانی کو بہت قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے۔ عیسائیت کا پیغام پامال اقوام کے لئے ضرور قابل اعتماد ہے۔ یہ نوع انسانی میں اخوت اور مساوات پیدا کرنے کا مدعی ہے۔ بعض سابقہ تصورات سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی آسمانی بادشاہت کچھ پردہ راز میں پنہاں نہیں اور اس مذہب میں داخل ہوکر انسان قبل از وقت اپنی جگہ مخصوص کرلیتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو زمانہ قدیم کے پراسرار عقائد سے روگرداں ہو رہے تھے یا بت پرستی کی قباحتوں سے گریز کرتے تھے ابتدائی عہد کی عیسائیت نے تسکین کی صورت پیدا کردی لیکن یسوع مسیحؑ کے مذہبی اقتدار کے قبل از وقت تعطل اور کسی نشو پذیر آئین کے نہ ہونے کے باعث نہ صرف مسیحؑ کی تعلیم بلکہ خود مسیح علیہ السّلام کی شخصیت کے متعلق نئے نئے مباحث کے موضوع پیدا ہوگئے چنانچہ عیسائیت کے مختلف گروہوں نے اُصولی طور پر مختلف عقاید اختیار کرلئے اس طرح صحیح وجدان کے نزدیک باپ اور بیٹے کا تصور اُس انسان کے تصور سے بالکل علیحدہ ہے جو مسیحؑ کے نام سے موسوم ہے یا یہ کہ مسیحؑ جوہر اعلیٰ کا جزو تھا جو شیطان کو تباہ کرنے

[1] "تاریخ انگلستان" کیرل رینسم ص۳۵

چھٹی صدی کے قریب شمالی وحشی قوموں ونڈال آلن، سوابو وغیرہ نے فرانس کو برباد کرنے کے بعد اندلس پر حملہ کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو دوسرے وحشیوں نے مغلوب کیا اور چھٹی صدی عیسوی میں اندلس پر قبضہ کرلیا۔ یہ وحشی بہت جلد اُن لاطینی اقوام کے ساتھ جو اندلس میں موجود تھیں مل گئے زبان لاطینی اُن کی زبان ہوگئی اور انھوں نے اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ لیکن ان یورپی اقوام کی حالت صلیبی جنگوں تک بھی نہایت ابتر تھی اور یہ جہالت کی تاریکی میں پھنسی ہوئی تھیں چنانچہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلیبی مثل وحشیوں کے تھے، دوست دشمن دونوں کو بلا امتیاز لوٹتے اور قتل کرتے تھے چنانچہ انھوں نے قسطنطنیہ کے انمول یونانی اور رومیوں کے صنعتی اور علمی ذخیروں کو برباد کردیا۔ عوام تو عوام امرا تک کی حالت درست نہ تھی چنانچہ موسیو بارتھے سینٹ ہلنر یورپ کے امرا کی زبوں حالت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"یہ امر نہایت مشکوک ہے کہ اگر بعد میں اسلام اثر انداز نہ ہوتا تو عیسوی مذہب خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو ان میں اچھے اخلاق پیدا کرسکتا۔" ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے کہ

"نویں اور دسویں صدی تک بھی ہمارے امرا نیم وحشی حالت میں رہتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ ان کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے جاہل راہب تھے جو اپنے وقت کو خانقاہوں کے کتب خانوں سے یونان و روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر اُن کو چھیلنے اور اُن چرمی اوراق پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے پر صرف کرتے تھے حتیٰ کہ گیارہویں صدی میں چند روشن خیال اشخاص نے اس جہالت کے کفن کو پھاڑ کر اُس زمانے کے اساتذہ یعنی عربوں کی طرف رجوع کیا۔"[۱] اور اس کے بعد عیسائیوں نے اپنی وحشیانہ معاشرت چھوڑی اور بہادرانہ اخلاق اور اس کے کل فرائض یعنی عورتوں، بوڑھوں، بچوں کا پاس، قسم کی پابندی وغیرہ کو عربوں سے اخذ کیا ورنہ عہد نبوی میں یورپی جاہل، ذلیل، درندہ صفت اور بدعہد تھے۔ برطانیہ عظمیٰ میں بت پرستی ہورہی تھی، بعض پادری مسیحی دین کی تبلیغ کی کوشش کررہے تھے لیکن ان کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہورہی تھی۔

[۱] "تمدن عرب"

"آئرجائل کے اسکاٹ اور اسکاچستان کے باشندے کامل طور پر بت پرستی میں مبتلا تھے اور ۵۶۳ء میں سینٹ کولمبا نے ان کو عیسائی بنانے کی کوشش کی لیکن بڑی حد تک ناکام رہا۔"[۱] کیرل رینسم کا دعویٰ ہے کہ چھٹی صدی کے آخر تک جنگلی قبائل، نیارٹن کے باشندے اور آئرستان اور کلائیڈ کی کھاڑی کے جنوب میں جتنے برطانی آباد تھے وہ برائے نام تو ضرور مسیحی ہوگئے تھے۔ لیکن خود مسیحی مذہب کی حالت اُن دنوں نہایت زبوں تھی۔ بہتر ہے کہ عیسائیت اور اُس کی اُس وقت کی حالت علامہ شیخ خالد لطیف گابا کی زبانی بیان کردی جائے۔ "وہ مذہب جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے سکھایا اور جس کی تشریح اُن کے قریبی حواریوں نے کی شرافت انسانی کو بہت قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے۔ عیسائیت کا پیغام پامال اقوام کے لئے ضرور قابل اعتماد ہے۔ یہ نوع انسانی میں اخوت اور مساوات پیدا کرنے کا مدعی ہے، بعض سابقہ تصورات سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی آسمانی بادشاہت کچھ پردہ راز میں پنہاں نہیں اور اس مذہب میں داخل ہوکر انسان قبل از وقت اپنی جگہ مخصوص کرلیتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو زمانۂ قدیم کے پراسرار عقائد سے روگرداں ہورہے تھے یا بت پرستی کی قباحتوں سے گریز کرتے تھے ابتدائی عہد کی عیسائیت نے تسکین کی صورت پیدا کردی لیکن یسوع مسیحؑ کے مذہبی اقتدار کے قبل از وقت تعطل اور کسی نشوونما پذیر آئین کے نہ ہونے کے باعث نہ صرف مسیحؑ کی تعلیم بلکہ خود مسیح علیہ السّلام کی شخصیت کے متعلق نئے نئے مباحث کے موضوع پیدا ہوگئے، چنانچہ عیسائیت کے مختلف گروہوں نے اُصولی طور پر مختلف عقاید اختیار کرلئے اس طرح صحیح وجدان کے نزدیک باپ اور بیٹے کا تصور اُس انسان کے تصور سے بالکل علیحدہ ہے جو مسیحؑ کے نام سے موسوم ہے یا یہ کہ مسیحؑ جوہر اعلیٰ کا جزو تھا جو شیطان کو تباہ کرنے

[۱] "تاریخ انگلستان" کیرل رینسم ص۳۵

کے لئے آیا' یا یہ کہ باپ' بیٹا اور روح القدس میں کوئی فرق موجود نہیں' یا یہ کہ یسوع محض ایک انسان تھا اور صرف ایک طاقت نے جو باپ سے نکل کر اُس انسان یعنی مسیح میں آگئی تھی اُسے خدا کا بیٹا بنا دیا' یا یہ کہ حضرت عیسی علیہ السلام خود روح القدس ہیں' یا یہ کہ آپ وہ روح نہیں ہیں وغیرہ'۔ یہ امر چنداں حیرت انگیز نہیں کہ ان بے شمار نظریات نے سخت اختلاف پیدا کر دئے (عہد نبوی میں) ہر طرف ایک سچ دین کو حاصل کرنے کے لئے شورش برپا ہے مسیح علیہ السلام کی فیاضی' امن پسندی اور خوش اعتمادی' فساد' خون وغیظ و غضب کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔ تھیوڈرا کی "پاک" سرگرمیوں کے ماتحت انھیں گلیوں میں جہاں وہ کبھی عصمت فروشی کرتی تھی عیسائی خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اسکندریہ میں پاکدامن ہائی پیٹیا کو عیسائیت کے سرگرم معتقدین نے اغوا کر کے ذبح کر دیا ہے اور اس شیطان سیرت کو جس نے اس وحشیانہ فعل کی ترغیب دی مذہب کا ایک مقدس پیشوا تسلیم کر لیا گیا ہے۔[۱]" ظاہر ہے کہ اس مذہبی بنیاد پر جبکہ انجیل کے اکثر حصے کھوئے جا چکے تھے اور جو باقی بچا تھا وہ از بس غلطیوں سے بھرا اور ناقص کیا ہوا تھا کسی عمدہ اخلاقی نظام کی عمارت نہ کھڑی کی جا سکتی تھی اور عیسوی مذہب کے زیر اثر ممالک کسی ایسے نظام کے حامل نہ تھے۔

اب دنیا کے صرف وہ قابل ذکر ممالک رہ جاتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابھی تک دوسرے ملکوں کی طرح عیسائیت نہ پہنچی تھی۔ ان میں سے ایک چین کا ملک ہے جو اس وقت ایک عظیم الشان سلطنت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس پر خوش اخلاق شہنشاہ ثائی تسنگ" کی حکمرانی تھی اور دوسرا ملک ہندوستان ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ کسی طرح بھی قابل فراموشی نہیں۔

"چین" چین میں پہلی اور دوسری صدی عیسوی سے بدھ مت' کنفیوشس ازم اور تاؤ ازم ایک دوسرے

[۱] پرائڈ آف دی ڈیزرٹ ۱۹۵۰ء

کے ساتھ ساتھ پھلے پھولے اور ان میں کبھی فساد کی نوبت نہ آئی۔ ہر شخص کو اختیار تھا کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے بلکہ اگر کوئی چاہے تو ایک ساتھ دو مذاہب بھی اختیار کر سکتا تھا۔ تاؤ ازم عوام کا مذہب تھا اور کنفیوشس ازم کے پیرو زیادہ تر امراء تھے اور بدھ مت دونوں فرقوں میں مساوی مقبول تھا۔ بدھ مت کو حکومتِ چین نے کبھی دبانے کی کوشش کی اور کبھی اسے سرکاری مذہب بنایا۔ لیکن تمام گذشتہ مذاہب کی طرح بدھ مت کی عمدہ اخلاقی تعلیم اور سادہ اصول۔ رسوم اور بے معنی کہانیوں کی تاریکی میں چھپتے گئے اور مذہبی اختلافات نے متعدد فرقے پیدا کر دئے جو حل طلب اصولوں پر ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے۔ ان تنازعوں کے فیصلے کے لئے بدھ مت کے جنم بھوم یعنی سرزمین ہند کی طرف رجوع کیا جاتا۔ خصوصاً پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں بدھ پجاری گروہ در گروہ ہندوستان میں معلومات فراہم کرنے کے لئے آتے تھے اور بعض ہندی بدھ مت کے بھکشوں نے بھی چین میں جا کر مہاتما بدھ کی تعلیم کا پرچار کیا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں بھی اس وقت بدھ مت کی حالت چین سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی اور اُس بدھ مت میں جس میں "خدا کا وجود ایسا ہی بے بنیاد تھا جیسا کہ سائے کا وجود اور جس کے پیرو معابد بناتے ہی نہ تھے یہاں تک کہ اُس نا معلوم خدا کا بھی معبد نہیں بناتے تھے[۱]" پہلی صدی عیسوی سے ہی بت پرستی رائج ہو گئی تھی چنانچہ "مہاراجہ کنشک کے عہد میں جس فرقہ (یعنی "مہایانی") نے فروغ پایا اس کے بعض عقائد میں برہمنوں سے اتفاق کر لیا گیا تھا اور بت پرستی غالباً اس سے بھی پہلے ان کے ہاں جائز و رائج ہو چکی تھی[۲]" اور خود مہاتما گوتم بدھ کی مورتی پوجی جانے لگی تھی حتیٰ کہ ساتویں صدی تک بدھ مت میں زندہ بھکشو بھی پوجے جانے لگے تھے چنانچہ جب ہیون چیونگ "کوچنگ" پہنچا تو وہاں کے بادشاہ اور ملکہ نے مقدس بھکشو کی خدمت میں سجدۂ عقیدت پیش کیا تھا۔

ہندوستان ہیون چونگ کے قول کے مطابق جو ہندوستان کے سفر کے لئے فتح مکہ کے سال یعنی ۶۳۰ء میں چین سے نکلا' بدھ مت کے جنم بھوم ہندوستان میں اختلافات کا یہ عالم تھا کہ

[۱] مذہبی مصنف "میکس ملر" [۲] تاریخ ہند برائے انٹرمیڈیٹ سید ہاشمی فرید آبادی۔

"اس مذہب کے اٹھارہ فرقے تھے، جن میں اس گرما گرمی سے مباحثہ ہوا کرتا تھا کہ اس کی آواز سمندر کی موجوں کی طرح دور سے آتی تھی[1]۔" گو بدھ مت اور جین مت کے میلے بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے لیکن اندر ہی اندر ان میں کچھ سکت باقی نہ رہی تھی اور بدھی اور جینی برہمنوں کے اثر سے مورتی پوجا کرنے لگے تھے اس زمانہ میں اس طرح ہر فرقے میں بت پرستی کے پھیل جانے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان دنوں ہند کے مختلف مذاہب میں کم سے کم اتحاد کا ایک قوی عنصر پیدا ہو گیا ہوگا اور ان میں ایسا مذہبی اختلاف نہ ہوگا جو شدید عداوت باہمی کی صورت اختیار کرلے کیونکہ بت پرستی کا مشرب یقیناً نہایت وسیع ہوتا ہے اور ہیون چونگ نے ہرش کے خاندان یا دربار والوں کی نسبت جو لکھا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی تو شو کا پرستار تھا اور کوئی بدھ مت کا پیرو ہو گیا تھا، بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے، بعض وشنو کی، غرض ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہئے اپنی پرستش کے لئے مخصوص کرلے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے، کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ لیکن اس رواداری کے باوجود ان لوگوں کو جو پرانوں کو کتب مقدسہ ماننے لگے ہیں بدھ مت والوں سے شدید نفرت تھی اور اس کا کبھی کبھی اظہار کشت و خوں کی صورت میں ہوتا تھا[2]۔"

"ہرش کے بڑے بھائی کو بنگالہ کے جس راجہ سالنکا نے دغا سے مارا یہ شو کا پرستار اور بدھ مت کا بڑا دشمن تھا اور اُن کی خانقاہیں منہدم کرا کے بھکشوؤں کو طرح طرح کے آزار پہنچاتا تھا اس نے گیا میں اس بڑ کے درخت کو بھی کھدوا کے آگ میں جلوا دیا تھا جس کے نیچے گوتم کو عرفان حاصل ہوا اور جو بدھ مت والوں کی سب سے مقدس زیارت گاہ بن گیا تھا اور اُس پتھر کو بھی

[1] "ہیون چونگ" [2] "تاریخ ہند" ہاشمی صاحب

تڑوا ڈالا جس پر گوتم کے پاؤں کے نشانات تھے[1]۔" خود ہرش نے اپنے آخری عہد میں بدھ مت کا علانیہ طرفدار ہو جانے کی وجہ برہمنوں کا محسود بن کر اپنی ابتدائی عام مذہبی خدمات پر پانی پھیر لیا تھا چنانچہ ونسنٹ اسمتھ نے اپنی تاریخ ارلی ہسٹری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ

"ہرش کے آخری دور میں بدھ مت کے دو بڑے گروہوں میں جو اختلاف تھا وہ تو تھا ہی لیکن بدھ مت پر شاہانہ عنایت کے سبب برہمنی مذہب کے پیرو بدھ مت کے سخت دشمن ہو گئے تھے[2]۔" حالانکہ ان کے مذہب کی حالت بدھ مت اور جین مت سے بھی گئی گذری ہوئی تھی اور اس مذہب کے راجہ مہاراجہ تعصب سے اندھے ہو کر اپنی مذہبی و دھرمی تعلیم کے مطابق دشمنوں اور غیر ہندوؤں کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے جس کو کمزور تو چپ چاپ برداشت کر لیتے لیکن طاقتور منہ توڑ جواب دیتے تھے جس سے آپس میں جنگ و جدول جاری رہتی تھی۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ ہندوؤں نے بدھ مت اور جین مت والوں پر انتہائی مظالم کئے لیکن جب اقتدار بدھوں اور جینیوں کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے اپنے عہد اقبال میں ہندوؤں سے بری طرح بدلہ لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پانڈیا خاندان کے ایک راجہ کرنا کے ظلم کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ اس نے آٹھ ہزار جینیوں کی کھالیں بیک وقت اتروا کر انھیں انتہائی عذاب کے ساتھ قتل کیا۔ اس وقت کے ہندوستان کے متعلق گو ہیون چونگ کی عام رائے بری نہیں لیکن جہاں وہ مقامی حالات بیان کرتا ہے اس نے ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت پر سخت نکتہ چینی کی ہے کشمیریوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "لوگ بے حد خوبصورت ہیں لیکن دغاباز ہیں، لوگوں کو علم حاصل کرنے کا شوق ہے لیکن وہ بڑے وہمی مزاج واقع ہوئے ہیں" اسی طرح جالندھر کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ "لوگ بد اطوار ہیں، کینہ پن اُن کی فطرت میں ہے، بدصورت ہیں لیکن خوشحال ہیں" ہیون چونگ نے ہندوستان میں ایسی قوموں کو بھی دیکھا جو دیوتاؤں پر انسانی قربانی کی بھینٹ چڑھایا کرتی تھیں چنانچہ الہ آباد (پریاگ) کے راستے میں اُسے چند دریائی

[1] "ارلی ہسٹری آف انڈیا" ونسنٹ اسمتھ صفحہ ۳۲۰ و ۳۱۹ ۔ [2] ارلی ہسٹری آف انڈیا ونسنٹ اسمتھ صفحہ ۲۳۹

لٹیروں کا سامنا ہوا، یہ ڈاکو درگا دیوی کے پجاری تھے اور ہر سال انسانی قربانی اس کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ جب ان کی نظر ہیون چونگ کے خوبصورت چہرے پر پڑی تو انھوں نے اسے درگا کی بھینٹ چڑھانے کی ٹھانی اور اسے پکڑ کر اپنے مسکن پر لے گئے لیکن عین اسی وقت آندھی کا ایک زبردست طوفان اُٹھا اور ڈاکو اس سے خوفزدہ ہو گئے اور کچھ چینی کے خاموش اور پر سکون رویّے نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ انھوں نے اسے چھوڑ دیا — ہیون چونگ نے سارناتھ میں سادھوں کی ایک بڑی تعداد دیکھی جو ننگ دھڑنگ پھر رہے تھے اور جسم پر اس لئے راکھ مل لی تھی کہ وہ نروان حاصل کر سکیں برہمنی مذہب کی بنیاد میں کوئی حقیقت نہ تھی، برہمن جن کتب کو آسمانی کتب کہتے تھے اُن

میں سے ایک کے متعلق بھی وہ خود یہ نہیں بتا سکتے تھے اور نہ بتا سکتے ہیں کہ "وہ کن پر اُتری، کہاں اُتری، کن کن زبانوں میں اُتری، نظم میں اُتری کہ نثر میں اُتری صدیوں میں اُتری، جگوں میں اُتری۔ جب ان تمام بنیادی سوالات پر، ایسے سوالات پر جن کی تحقیق کے بغیر کسی چیز کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ منحصر ہے، اندھیرا اور گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، ظاہر ہے کہ شک کے ان دلدلوں میں یقین کا قدم کسی طرح نہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔"[لے] خود مندروں کے محافظ اور پجاری بداخلاقی کا مجسمہ تھے، پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے لوٹتے اور ذات پات کے جھگڑوں سے آپس میں تفریق پیدا کراتے تھے۔ یہ اپنے سوا کسی کو وید کے کلمات سُننے کا مستحق نہ سمجھتے تھے اور یہاں تک حکم دے رکھا تھا کہ اگر وید کے الفاظ کسی شودر کے کان میں پڑ جائیں تو اس میں سیسہ پگھلا کر بھر دیا جائے۔ شودروں کو ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا اور ان کو قانوناً تمدنی، اخلاقی اور مذہبی کسی شعبہ میں بولنے کا حق حاصل نہ تھا۔ عورتوں کا کوئی حق نہ تھا، وہ اپنے باپ اور خاوند کی ملک سمجھی جاتیں اور اُنھیں محکومی اور غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ بیوہ ہونے کے بعد عورت زندگی کی ہر لذت سے قانوناً محروم کر دی جاتی جس کی وجہ ستی کی رسم جاری تھی۔ لڑائی میں شکست کے بعد خود ان کے باپ بھائی اور شوہر ان کو اپنے

لے "النبی الخاتم" مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ صہ ۱۶۱

ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے۔ شراب نوشی کا رواج کثرت سے تھا، دیوتاؤں کے آگے شراب رکھ کر ان کی پوجا کی جاتی اور جانوروں اور انسانوں کو ان کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھاتے — رہبانیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے جنگلوں میں چلے جاتے اور عبادت و نفس کشی کے جنون میں جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف دیتے، کوئی ہاتھ خشک کر لیتا، کوئی کھڑے کھڑے پیروں کو سن کر لیتا، کوئی شہد کھانا چھوڑ دیتا، کوئی ننگا رہنا پسند کرتا، بھوتوں، پلیتوں اور سینکڑوں اوہام فاسدہ سے نفع و ضرر کا تعین ان کے مذہب میں داخل تھا، ملک میں اخلاقی جرائم کثرت سے ہوتے تھے اور اخلاقی ڈاکو کبھی مذہبی پیشواؤں کے لباس میں مندروں اور مجلسوں میں ایمان پر ڈاکہ ڈالتے، کبھی پنڈوں اور چوبوں کا روپ بھر کر پجاری بن جاتے اور شریف خاندانوں کی عزت پر ڈاکہ ڈالتے اور کبھی دغا و فریب سے مملکت میں عہدہ دار بن جاتے غرضکہ مذہبی و اخلاقی، تمدنی و سیاسی کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں جرائم پیشہ انسانوں کا دخل نہ ہو مگر اس زمانے میں مہاویر و گوتم سا بھی کوئی مصلح پیدا نہ ہوا جو ان کو اگر تینتیس کروڑ معبودوں سے کاٹ کر ایک سے ان کا رشتہ نہ جوڑتا، در بدر رکھی جانے والی جبینوں کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی چوکھٹ پر نہ جھکاتا تو کم از کم ان کی اخلاقی حالت تو درست کر کے ان گرتے ہوؤں کو سنبھال لیتا صرف ایک طرف روشنی کی شعاع نظر آ رہی تھی اور وہ اُس جنوبی حصے میں جہاں عرب سوداگر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام لیکر پہنچ چکے تھے، باقی سارے ہندوستان میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔

عہد نبوتؐ میں ہندوستان ہی کیا جیسا کہ اوپر معلوم ہوا ساری دنیا ابتذال و معائب کی گندگیوں اور آلائشوں میں مبتلا تھی۔ صرف خیالات و اوہام کا نام مذہب قرار پا گیا تھا اِس لئے معیار حق کے مسئلے میں ساری دنیا محو کشمکش تھی، لیکن مکہ سے ضیا بار ہونے والی توحید کی کرنوں نے تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کو جگمگا دیا اور تمام دنیا کے پیشوائے اعظمؐ نے سارے مسائل حل کر کے رکھ دئے۔

محمد شعیب اللہ خان۔ سال اوّل

تعزیت مادرِ دکن

مادرِ دکن عُلیا حضرتہ بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کی وفات حسرت آیات نہ صرف فرزندان جامعہ عثمانیہ بلکہ مملکت آصفیہ کے زیر سایہ سانس لینے والے ہر فرد کے لئے ایک سانحۂ جانگداز ہے۔ حضرتہ مغفورہ کی ذات بابرکات ملک کے تمام اقوام و ملل کے لئے یکساں رحمت تھی عثمانیہ برادری بلاامتیاز مذہب و ملت حضرتہ مغفورہ کے ماتم میں شریک ہے اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے کہ حضرتہ مغفورہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جلالتہ الملک ظل سبحانی حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ اور خانوادہ آصفی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

میر اکبر علی ناصری متعلم بی۔اے
شریک مدیر

کلیہ کی خبریں

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں

مولوی معتقد ولی الرحمٰن صاحب لکچرار شعبہ فلسفہ نے میقات آخر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کا تقرر بیس سال قبل شعبہ فلسفہ کے لکچرار کی حیثیت میں ہوا۔ نفسیات سے آپ کو فطری لگاؤ تھا اس مضمون میں آپ نے برسوں تحقیقاتی کام کیا۔ قدیم و جدید نفسیات کا کوئی مسئلہ آپ نے تشنہ نہ چھوڑا۔ دارالترجمہ میں آپ کے کئی ایک ترجمے ہیں آپ کی حقیقی قابلیت اور تبحر علمی کا اندازہ تو کچھ وہی لوگ بہتر کرسکتے ہیں جو آپ کے طالب علم رہے اور جن کو آپ سے اکتساب علم و فیض کے مواقع حاصل رہے معلم نفسیات کی حیثیت سے ہندوستان کی تمام جامعات میں آپ کی شہرت تھی۔ آپ کی اچانک موت فلسفہ کے طلبہ کا ایک زبردست نقصان ہے جامعہ عثمانیہ بالعموم اور آپ کے طالبعلم بالخصوص آپ کی دیرینہ علمی خدمات کو بھلا نہ سکیں گے۔ ہم خداوندِ کریم سے مرحوم کے لئے مغفرت کی دُعا کرتے اور آپ کے پسماندگان کے لئے صبر جمیل طلب کرتے ہیں۔

پنڈت ہری ہر شاستری صاحب ریڈر شعبہ سنسکرت نے میقات آخر میں وفات پائی آنجہانی جامعہ کے قدیم اساتذہ سے تھے گذشتہ بیس سال سے آپ نے قابل قدر ادبی خدمات انجام دیں۔ مشرقی زبانوں۔ تلنگی، کنڑی، مرہٹی اور سنسکرت میں آپکی غیر معمولی قابلیت اور تبحر مسلمہ تھا۔ طلبہ میں آپ کی ہر دلعزیزی آپ کے اخلاق اور خلوص کی آئینہ دار تھی۔ آپ کی موت شعبہ سنسکرت کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ہم آنجہانی کے پسماندوں کے ساتھ مخلصانہ اظہار تعزیت کرتے اور ان کے لئے خداوند کریم سے صبر جمیل کی دُعا کرتے ہیں۔

ہم مولوی سعیدالدین خانصاحب دوم مددگار مسجل کی وفات پر اپنے گہرے رنج و الم کا

اظہار کرتے ہیں مرحوم علاوہ اس عہدے کے ہمارے جامعی بھائی غیاث الدینخانصاحب
بی۔ اے (عثمانیہ) کے والد تھے۔ آپ نے گذشتہ بیس سال سے جامعہ کی قابل ستائش
خدمات انجام دیں۔ آپ ہمدرد، خلیق، اور ہر دلعزیز عہدہ داران جامعہ میں شمار ہوتے
تھے۔ ہم مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے پسماندگان بالخصوص
اپنے بھائی مسٹر غیاث الدین خان بی۔ اے کے لئے صبر جمیل کے طلبگار ہیں۔

توسیع کتب خانہ جامعہ حکیم محمد قاسم صاحب مرحوم کے مشہور کتب خانہ کو اس کی نوادرات السنۂ سنسکرت، مرہٹی، تلنگی اور کنڑی کے علاوہ تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے کتبوں کے ساتھ کتب خانہ جامعہ میں منتقل کیا گیا ہے ہمیں توقع ہے کہ اس طرح مستقبل قریب میں کتب خانہ جامعہ ہندوستان کے کتب خانوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلے گا۔

جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم حسب روایات قدیم جامعہ کے اقامت خانوں کے مقیمین کی جانب سے سال حال بھی جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا۔ اس سلسلہ میں انعامی مضامین کا ایک مقابلہ بھی منعقد کیا گیا تھا اور عنوانات ذیل پر مضامین لکھوائے گئے۔

(۱) عہد نبوت میں دنیا کی اخلاقی اور مذہبی حالت۔

(۲) عرب کے باشندوں کو اسلامی تحریک سے دینی منافع کے علاوہ دوسرے کس قسم کے فوائد حاصل ہوئے۔

(۳) سیرت محمدی کا مطالعہ کیوں کیا جائے (برائے غیر مسلم طلبہ)

پہلے دو عنوانات کے بہترین مضامین پر میلاد کمیٹی کی جانب سے انعامات عطا کئے گئے جسکے مسٹر شعیب اللہ خان متعلم سال اوّل اور مسٹر یوسف الدین ایم۔ اے مستحق قرار دئے گئے۔ اور تیسرے عنوان کا "پروفیسر سباراؤ پرائز" مسٹر نارائن راؤ بی۔ اے کو عطا کیا گیا۔
اس مقابلہ میں طلبہ جامعہ کے علاوہ ملحقہ کلیوں کے طلبہ اور کلیۂ اناث کی طالبات نے بھی حصّہ لیا۔

"مسنر پروفیسر ہارون خان پرائز" احمد النساء بیگم صاحبہ ثریا جبیں متعلمہ سال چہارم کلیہ اناث کو عطا کیا گیا۔ ہم ان سب کی خدمات میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

جلسہ میلاد طعام خانہ نمبر ۱ کے ہال میں منعقد کیا گیا جس میں جامعہ کے ممتاز اساتذہ اور طلبہ کی تقریروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ختم جلسہ پر آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ نے انعامات تقسیم فرمایا۔ ہم اس جلسہ کی شاندار کامیابی پر مسٹر سید عبد الرزاق قادری جعفر بی۔ اے (عثمانیہ) معتمد کمیٹی جشن میلاد کو مبارک باد دیتے ہیں

تنظیم جدید یوں تو فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی تعلیم کا انتظام جامعہ میں بہت پہلے سے ہے لیکن آئندہ سال تعلیمی سے ان زبانوں کی باضابطہ تعلیم ہوا کرے گی جن کا دو سالہ نصاب تیار ہو گیا ہے۔ ان زبانوں کا امتحان جامعہ کی جانب سے لیا جائے گا اور کامیاب ہونے والے طلبہ کو ڈپلو بھی دیا جائے گا۔ ہم اس تنظیم جدید کا خیر مقدم کرتے ہیں اور متمنی ہیں کہ جامعہ کے طلبہ اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں۔

جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں علمی اجتماعات ڈسمبر ۱۹۴۱ء میں جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس، اور انڈین میڈیکل کونسل کے اجلاس منعقد ہوں گے۔ جن کے انتظامات اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہیں۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کے متمنی ہیں۔

بزم دینیات جامعہ عثمانیہ بزم دینیات کے جدید انتخابات میں مسٹر سید عبد الرزاق قادری جعفر بی۔ اے (عثمانیہ) صدر منتخب ہوئے۔ سال حال بزم کا جلسہ کرسی نشینی آنریبل مسٹر سید عبد العزیز صدر المہام بہادر عدالت و امور مذہبی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں صدر بزم کے خطبہ صدارت کے علاوہ جسٹس نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر میر شعبہ دینیات اور مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات کی تقریریں ہوئیں۔ صدر جلسہ صدر المہام بہادر عدالت و مذہبی نے اپنی تقریر میں ہندوستان کی مذہبی تعلیم کی تاریخ اور نظام تعلیم کے مختلف ادوار اور اس کی تدوین پر ایک فاضلانہ تقریر کی۔

دور مغلیہ اور درس نظامیہ کے تعلیمی نظام پر بحث فرمانے کے بعد آپ نے شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

گذشتہ چند سال سے انجمن اتحاد کے بعد ذیلی بزموں میں بزم دینیات نے ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے۔ ہم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی ہمت افزائی سے مسٹر سید عبدالرزاق قادری جعفر بی۔ اے کی صدارت میں اراکین بزم دینیات کی ہمہ جہتی ترقیوں کے متمنی ہیں۔

تحصیلداری کے انتخابات سال حال جامعہ عثمانیہ کے حسب ذیل طیلسانین تحصیلداری کے لئے منتخب کئے گئے۔

(۱) مسٹر محمد عمر مہاجر ایم اے ۔ صدر انجمن اتحاد
(۲) مسٹر محمد فرید مرزا بی۔ اے۔
(۳) مسٹر پریم راج ماتھر بی۔ ایس۔ سی
(۴) مسٹر قادر علیخان ایم۔ اے
(۵) مسٹر راجندر نارائن آستانہ۔ بی۔ اے
(۶) مسٹر کاظم علیخان بی۔ اے۔
(۷) مسٹر حامد الرحمن بی۔ اے۔
(۸) مسٹر بالکشن راؤ بی۔ اے۔
(۹) مسٹر سیتارام راؤ یاڈوی کیکر بی۔ اے۔
(۱۰) مسٹر محمد حسین بی۔ اے۔
(۱۱) مسٹر سید اسد خاں رضوی بی۔ اے

ہم ان برادران جامعہ کو مبارکباد دیتے ہیں اور متوقع ہیں کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں عثمانی روایات قائم رکھیں گے۔

اسپوٹس ڈے جامعہ کی زندگی میں پہلی مرتبہ کھیلوں کا دن (اسپوٹس ڈے) بصدارت عالیجناب معین امیر جامعہ منایا گیا۔ خود نائب معین امیر صاحب کی دلچسپی ثناء اللہ خان صاحب و

شریف حسین صاحب و خلیل اللہ صاحب معتمد عمومی کھیل کے باہم تعاونِ عمل جناب اسد علی صاحب کے اشتراک اور کپتان و معتمد صاحبان کی عملی دلچسپی سے جشن بہت کامیاب رہا ایک علٰحدہ شامیانہ میں عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا، عصرانہ کے بعد انعامات تقسیم کئے گئے۔ جس کے بعد تقریریں ہوئیں۔

مسٹر خلیل اللہ نے اپنی تقریر میں کھلاڑیوں کے مشکلات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ باوجود ان تمام دقتوں کے کھلاڑیوں نے شاندار کامیابیاں اس سال حیدرآباد اور باہر کے مختلف مقامات میں حاصل کیں۔

عالیجناب معین امیر جامعہ نے اپنی ہمدردانہ اور ناصحانہ تقریر میں کھلاڑیوں کے مشکلات کو رفع کرنے کی بہت اُمید دلائی اور خاص طور سے ذیل کے جملوں پر زور دیا:۔

"کھیلوں اور خصوصاً فٹ بال سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور کھلاڑیوں کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔

اس کے بعد عالیجناب نائب معین امیر کی اختتامی تقریر کے بعد جلسہ برخواست ہوا۔

اس جشن کی کامیابی مسٹر خلیل اللہ بی۔ اے۔ کپتان فٹ بال اور معتمد عمومی کھیل کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس کے علاوہ مسٹر خلیل کی کپتانی میں فٹ بال ٹیم نہ صرف بین الجامعاتی ٹورنمنٹ میں کامیاب رہی بلکہ میسور اور آل انڈیا ٹورنامنٹ اورنگ آباد میں بھی اس ٹیم نے شاندار کامیابیاں حاصل کیا ان کامیابیوں پر ہم فٹ بال ٹیم، مسٹر خلیل اور مسٹر سید بدرالدین قادری بی۔ اے معتمد فٹ بال کلب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مزدور کیمپ ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ہماری جامعہ کے ایک ہونہار سپوت ڈاکٹر قاسم علی صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ یس (عثمانیہ) کا تقرر مزدور کیمپ جامعہ پر ہوا۔ مسٹر قاسم علی ایک اچھے کھلاڑی اور ہمدرد ڈاکٹر کی حیثیت سے طلبائے جامعہ میں ہر دل عزیز ہیں ہمیں یہ سن کر اور زیادہ مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے برادران جامعہ جب بھی طبی امداد اور مشورہ طلب کرتے ہیں تو وہ نہایت ہی خوشی اور ہمدردی کے ساتھ ہر ممکنہ امداد فرماتے ہیں جس کے لئے ہم ڈاکٹر صاحب کے مشکور ہیں۔

تقرر جامعہ عثمانیہ میں سال حال عہدۂ کنٹرول آفیسری کا اضافہ عمل میں آیا۔ اس عہدہ پر ہماری

جامعہ کے برادر قدیم مسٹر اسد علی بی۔اے۔ ڈی۔پی۔ای (عثمانیہ) جیسے متعد تجربہ کار اور ہر دلعزیز برادر جامعہ کا انتخاب ہمارے لئے ایک مژدہ انبساط ہے۔ ہم مسٹر اسد علی کی خدمت میں پر خلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

میر اکبر علی ناصری متعلم بی۔اے
یونیورسٹی ٹاؤن ۔ شریک مدیر

میر اکبر علی ناصری متعلم بی۔اے
نائب مدیر حصہ اردو

AZAM STEAM PRESS.

غزل

جنابِ ڈاکٹر کرپا شنکر صاحب حشمؔ آنجہانی حیدرآباد کے اچھے شاعر گذرے ہیں خصوصاً شعرا میں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ پہلی مرتبہ آپ کا کلام مجلہ عثمانیہ کے ذریعہ روشناس کرایا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

دلِ پُر داغ کو دیکھو فدا ہے روئے جاناں پر
بہارِ بیخودی چھائی ہوئی ہے اس گلستاں پر

فلک اور وہ فلک جو چھا گیا گورِ غریباں پر
ستم اور وہ ستم ڈھاتا ہے جو اب بھی مری جاں پر

نہ کھل جائے کہیں حالِ دلِ وحشت زدہ ان پر
مجھے افسوس آتا ہے مرے چاکِ گریباں پر

اسیرِ بے گناہ کی آہ کی تاثیر دیکھو گے
فلک بجلی گرائے گا در و دیوارِ زنداں پر

یہی حسرت بھرے دل سے زلیخا کی صدا نکلے
مرا یوسف ہے زنداں میں تو جوبن بھی ہے زنداں پر

ابھی کچھ اور حسرت ہے ابھی کچھ اور خواہش ہے
نظر رہ رہ کے پڑتی ہے تری گنجِ شہیداں پر

وفورِ گریۂ خونی کا درماں اور کیا ہوگا
تم اپنی آستیں رکھدو ہماری چشمِ گریاں پر

وہ زہر آمیز یہ لذت وہ دردِ دلِ عاشق
ہنسا کرتے ہیں زخمِ دل مرے لب ہائے خنداں پر

جو وہ ہیں محوِ آرایش تو عالم محوِ نظارہ
چلو دیکھو کہ درباں گر رہے ہیں آج درباں پر

کوئی امید بر آتی نظر آتی نہیں ہم کو
سیہ بختی کا سایہ پڑ گیا شب ہائے ہجراں پر

ہمارے پاؤں کے چھالوں کے یہ ٹکڑے کہاں ملتے
حشمؔ احسان ہے اپنا سرِ خارِ بیاباں پر

ڈاکٹر کرپا شنکر حشمؔ

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

THE OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

Managing Editor, and Editor, English Section

KRISHEN DAYAL MATHUR, B. Sc., (Osmania)

Joint Editor,

HAMIDUR RAHMAN B. A., (Osmania)

Vol. XIV **1941** **Nos. 1 & 2**

Printed at
THE OSMANIA PRINTING WORKS
87, E. & F, Kingsway, Sec'bad.

The Osmania Magazine

Vol XIV. Nos. 1 & 2.

ADVISORY BOARD

President :
Qazi Mohammed Husain, Esq., M.A., LL.B., (Cantab), Pro-Vice-Chancellor.

Advisor, English Section :
Prof. V. S. Krishnan, M. A., (Oxon)

Advisor Urdu Section:
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M. A., Ph. D. (London).

Honorary Treasurer:
Prof. Wahidur Rahman, B. Sc.

MANAGING COMMITTEE
1349—1350 F.

President:
Qazi Mohammed Hussain, Esq., M.A., LL.B. (Cantab.), Pro-Vice-Chancellor.

Advisor, English Section:
Prof. V. S. Krishnan, M. A., (Oxon.)

Advisor, Urdu Section:
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A., Ph. D. (London)

Honorary Treasurer:
Prof. Wahidur Rahman, B. Sc.

Secretary:
Mr. Krishen Dayal Mathur, B. Sc., (Osmania)
Managing Editor & Editor, English Section.

Mr. Mohd. Omer Mahajir,
President, Students' Union.

Mr. Shaik Khaleellullah, B. A., (Osmania)
Editor, Urdu Section.

Mr. Mir Akbar Ali Nasri; B.A., (Final)
Joint Editor, Urdu Section.

Mr. Hamidur Rahman, B.A., (Osmania)
Joint Editor, English Section.

Annual Subscription

	Rs.
From Government	12
„ Universities, other Institutions and State officials ...	8
„ General Subscribers	6
„ Old boys, Aided Societies and Reading Rooms ...	5
„ Present Students, Osmania University	4
„ Abroad ... ... Fifteen Shillings.	
„ Old Students, Abroad ... Ten Shillings.	
„ Single Copy ... ... Two Rupees.	

Note:— Registrations and V. P. Charges Extra.

Can be had of:

OSMANIA MAGAZINE OFFICE
OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD-DECCAN.

CONTENTS

		PAGE
1.	EDITORIAL	i
2.	IN MEMORIUM	xi
3.	MOTHER DECCAN, *by Mirza Yar Jung* ..	xii
4.	THE NIGHT OF MARTYRDOM, *by Sarojini Naidu*	xiv
5.	THE CITY STATE OF MECCA	1
6.	IF WISHES WERE HAIR TONIC BOTTLES, *by F'ruz Mehta, B. Sc., (Alig) LL.B. (Previous)* ..	29
7.	HALF-PAST-TEN: MY BLUE (Sherwani) *by Prabhakar Rao, LL.B. (Previous)* ..	44
8.	TEARS SPEAK THEIR INNOCENCE, *by S. Ahmed Hussain, Junior Intermediate* ..	47
9.	LORD BASAVA OF KALYAN, *by Siddayya Puranik, Junior B. A.* ..	50
10.	MUSINGS ON WRITING, *by P. Prabhahar. Rao, LL.B. (Previous)* ..	64
11.	THE PHILOSOPHY OF A MIRROR, *by C. S. Inamdar, Junior B. A.,* ..	67
12.	RELIGION AND POLITICS, *by M. Hamidur Rahman, B. A., LL. B. (Previous)* ..	70
13.	MUSINGS OF A MORNING, *by Krishen Dayal, B. Sc.,* ..	76
14.	THE EXAMINER, *by M. Naeemuddin Siddiqui, M. A., (Final)* ..	78
15.	MY ALMA MATER, *by S. K. Sinha, B.A.* ..	81
16.	MARXISM: A Rationalised Thought-Process, *by Govardhan Shastri, Junior Intermediate* ..	83
17.	"THE MOTHER'S HEART" (Translated) *by Md. Muktar Ahmad, B. Sc.* ..	88
18.	BALLAD POETRY, *by Mohammad Mahmood Husain, M. A.,* ..	89

19. The Black Death,
by Syed Abdul Bari, 1st year (Arts) .. 96
20. The Psychology of Situations,
by Mohd. Jalaluddin Ahmed, IV year B. A., Class .. 101
21. The West-Minster Statute of 1931 and India's Political Future (Translated from an article in Urdu in the "Payam")
by Abdul Hasan Siddiqui, Junior Intermediate .. 104
Book Reviews 111

KRISHEN DAYAL B. SC. (OSMANIA)
Managing Editor
and Editor English Section.

AZAM STEAM PRESS.

EDITORIAL

It is now thirteen years since our Magazine was started and still it is trying to serve to a great extent—it is her hope to serve— her Alma Mater, her country and her King, and we feel highly delighted when we consider the work turned out by the Magazine during this very short period, in promoting the educational interest and elevating the literary taste of the students. We shall also try to give good output this year, in which we request the co-operation and good-will of you all.

The past year was a fortunate one for us, when our Princes Nawab Azam Jah Bahadur and Nawab Moazam Jah Bahadur visited our University. We are deeply indebted to them for their gracious visit.

But this year brought one irreparable calamity, when we lost a mother, so dear and loving. We feel deeply grieved at the death of 'Ulaya Hazrat Mader-e-Deccan' who was a model of kindness and clemency. A lady of extraordinary gifts and virtues, her memory cannot be forgotten by us. The Executive Council has most laudably opened an "Educational Fund" in memory of the late 'Mader-e-Deccan' for which all Hyderabadis should feel grateful. Her death has not only been a heavy blow to our beloved Ruler, but also a great loss to all his loyal subjects. We pray God, may her soul rest in Peace.

War

Now we are passing through a period of vital importance in history and in these times of dismal and dreary happenings, it is difficult to say what to-morow will bring. The catastrophies of war are manifest, and are a great blow to the civilisation of the world. Situations are changing every minute, even every second.

The menace prevails. The belligerent countries fight on, and the world lies in danger. We are witnessing a great tragedy, but let us pray God that He may crush the Nazi menace quickly, restoring peace and security, and relieving the whole of mankind from this ravage.

Hyderabad

Under the benign rule of our gracious sovereign Hyderabad is rapidly improving day by day, specially in the industrial and social improvements. We are very proud that under the far-seeing direction of our revered Chancellor, the advancement and betterment of village life in the State are receiving the closest attention. We have received an issue of a paper entitled '*Gaun Sudhar*' which seeks to promote the well-being of the villagers. In this connection the opening of the School for "Arts and Crafts" by the Rt. Hon. the Chancellor, and the establishment of an Industrial School by Hon. Raja Dharam Karan Bahadur, are matters upon which the State can justly feel happy.

These are a few of the many great achievements which will ever remain in the history of the Deccan, and the coming generations will look back upon this period with wonder.

Prosperous and safe are we under the happy regime of our beloved Ruler H.E.H. Asaf Jah the Seventh, who is sagaciously guiding our fates and destinies.

Congratulations

We offer our respectful congratulations to our Chancellor, Rt. Hon. Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur, on his election as honorary member of the "Institute of Engineers."

We heartily thank our Vice-Chancellor, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, who has kindly promised to order that our Magazine should be purchased by the Educational Department.

We feel very proud when we see our Chancellor and Vice Chancellor taking a very keen interest in our betterment and welfare. The congenial surroundings, the homely atmosphere, the special care taken by our authorities are things which we cannot forget. When such great facilities are being provided for us, it is our bounden duty to achieve high educational distinctions and serve our King and country to the best of our ability.

Elections

We are highly pleased that this time we had a very good ministry. We congratulate the following:—

1.	Mr. Mohammed Omer Mahagir	.. *President*,
2.	,, Abdur Razzaq Qadri	.. *Vice-President*,
3.	,, Qadri Mohiuddin Asir	.. *Secretary*,
4.	,, Abu Turab Qaliluddin	.. *Librarian*.

and the other members of the cabinet for the success in the elections. Mr. Mohammed Omer Mahagir, a Student of extraordinary merits and abilities, has been the most popular and a very brilliant student of our University. He has now been selected as a Tahsildar.

Hostels

The hostel activities were in full swing this year. Different hostels went on picnics to Nizam Sagar, Golkonda Fort, and Osman Sagar, etc., which were both instructive and enjoyable. This year Hostel 'C' students arranged a good dinner and 'Mushayira', which ended very staisfactorily.

We congratulate the students of the different Hostels for bringing about homely atmosphere, and co-operation among themselves.

Dining Hall

It is a very old complaint that the management of the Dining Hall is unsatisfactory.

"Boys may come and boys may go
But "this" goes on for ever."

This year Prof. Khaeelul Rahman has been appointed as the Special Officer of Dining Hall No. 1. We hope now that the management will become better, and there will be peace and tranquility among the Dining Hall hostel students.

Sports

This year our results in sports have been very satisfactory. The Cricket Team under the Secretaryship of Mallick Arjun Patel, toured Northern India, and won many matches. It is only on account of the deep interest taken by the Captain Mr. S. M. Hosain that the standard was able to rise this year.

The Tennis Team also under the Secretaryship of Mr. Abdul Wahab, toured Northern India, and fared well, wining several matches.

We congratulate all the Captains and Secretaries of this year, Mr. Shamsuddin, (General Sec.) Mr. Mujtaba Yar Khan (Secy. Hocky Club), Mr. Khalilullah (Secy. Football Club) and others for maintaining discipline and unity among the players and improving the standard of the game. Notwithstanding the fact that our College team won trophies in many games, the standard leaves much to be desired, and we hope we shall do much better this year.

From this year onwards 70% attendance in sports has been made compulsory. This we feel is too high. We hope that the minimum percentage might be reduced, and the compulsion applied only to the hostel students.

Results and Percentages

"A Judicious man," says Carlyle, "looks at statistics not to get knowledge, but to save himself from having ign orance

foisted on him,"—and this is a right rule for a University Student. In the light of this we are sure that our University Standard has risen; but we do not know why our results are not satisfactory. Perhaps it is because the tutorial system, which was once introduced, is now losing its importance. This is detrimental to the growth of knowledge in the University. As such, much stress ought not to be given to the examination but to the tutorial records of the whole academic year.

Another want that is felt among the students is about the "translated words" in Urdu. At huge expense, thousands of words have now been translated in the Translation Bureau by the Specialists of our University. We request the authorities to kindly publish them as soon as possible, as it will meet to a great extent the needs of the students.

Convocation Address

Sir Maurice Gwyer, Chief Justice of Federal Court, India, delivered a very inspiring and instructive Convocation Address to us this year. In the very notable address Sir Maurice has dilated much upon the historical, philosophical, and political advancement expected of a University.

The real advancement of knowledge now-a-days is the advancement of "Scientific education". For science has become now the hall-mark of civilisation, and even poetry and philosophy have taken a scientific turn.

Ex-Students

Every year there is a coming and going of students. This year also many students will leave their Alma Mater, but the true lovers, really speaking, do not not leave it, for there is always a picture of their "Mother" in their hearts.

We feel highly proud of the fact that Osmania has produced many men of genius and worthy students in her very

short life, who are serving their Alma Mater, their King and their Country in an eminent manner.

From these students also who are leaving us now, we expect great deeds of fame and renown, which will brighten more and more the sacred name of Osmania.

University and Suggestions

We feel there is a little lack of social and academic atmosphere in the University, and we consider that it would be desirable if students and professors try to create this by mingling with one another in parties, picnics etc.,. This contact will increase the knowledge of the students, and will be a great stimulus to co-operation, good-will and understanding.

In this connection we must suggest the idea of Literary Circles to be started not only in the Hostels, but also in the University Classes. We wish that this year some stress might he laid on it.

We regret very much that the seats in the science section are limited in our University. In the future days when science will play a more important part, this kind of limitation of seats seems improper. India needs more scientists, and when Industries are being increased day by day, the scientific education must not be hindered. In the words of our renowned professor, Dr. Raziuddin Siddiqi,

"Every educated person can easily master the subject necessary for the graduate at his leisure, whereas scientific education can only be imparted in the Universities or organised institutions of similar kind" and "this policy of the educational authorities by which during the admissions, seats in the science section are limited, and not in the Arts section—is contrary to the times and needs of the community andcountry."

(*Translated*)

Instead of "talking at large" on this subject we think it proper to suggest what is essential for the amelioration of our country, that the scientific education should be made common.

In this connection we must suggest one more thing. Merely offering more seats in the science section is not enough for any University. The chief object should be to provide employment for those students, who after long study finish their University career. And we consider there will not be any difficulty in Hyderabad if Industries are developed on a large scale. We cannot say what the other Universities are going to do, but as the masters of our university are the masters of our state, and as in the benign rule of our beloved Ruler so many improvements have been made in Hyderabad, we feel confident in requesting the authorities to make special arrangements for the students of science in the State—by establishing scholarships, by opening industries, and by giving fair chance to the students of science in the Civil Service Examinations. This will be an invitation to the students, to do research in science, by which there will be a two-fold benefit to the country. First that new Industries will absorb more men and thus add to the resources of our state, and secondly our University will stand unique in India, in doing such a pioneer work.

More Suggestions

With the special facilities provided for us in this great institution, we live in a healthy and calm atmoshere. But whenever we feel any need for other facilities we deem it a privilege to inform our authorities about it. The students of the university circle, will be benefited by a swimming pool being provided in the University colony.

Secondly the road between Seethapalmandi and the hostel is very dangerous, particularly in the nights, as there is always a fear of snakes. It would be beneficial if a road is constructed in the interests of the lives of the hostel students.

Finally, we have one last and earnest desire, surely worth greater response from the authorities. It is our deep-felt craving that a worthy memorial should be constructed, as a sacred monument of our late 'Mader-e-Deccan'.

A word for Freshers

It is our pleasant duty to welcome the freshers who have joined the University. We, whose days in the university are numbered, may say to you that:

"Where the vanguard camps to-day
The rear shall rest to-morrow".

Magazine

All of us know very well that due to the extraordinary disturbances and delay in the college elections, we are compelled to issue the Magazine at a late hour. But we are hoping to avoid these delays by making modifications in the Magazine Board, which might not be affected by the annual Editorial changes.

We do not wish to say anything about the articles that are published in this issue. The readers will judge them for themselves. Our thanks are due to Nawab Moinud-Dowla Bahadur and Mrs. Sarojini Naidu, for kindly giving us Poems for the publication is our Magazine and to Nawab Miza Yar Jung Bahadur who has kindly contributed, at our request, an article on Mader-e-Deccan.

We are fortunate enough in having two Ghazals of the late Dr. Krijashanker Hasham, which we are publishing in the Urdu section. The late Dr. Sahib, a relative of the late Raja Shiv Raj Dharamvant Bahadur, was a very learned scholar of Urdu and Persian, and we are glad that he is introduced for the first time to the Urdu world by our Magazine.

In this connection I must thank our advisors Dr. Mohiuddin Khadri Zoar and Prof. Krishnan; and my colleagues Mr.

Khalilullah and Mr. Akbar Ali Nasri, for the kind co-operation and interest which they have shown in the publication of the Magazine. My thanks are due to Prof. Wahajuddin, whose kind advice and help have been very valuable.

In conclusion we feel a word of apology may be necessary for the long Editorial: but since we place in your hands a double issue, the length of Editorial remarks also might be double the usual size. And we dedicate this effort of ours to the cause of knowledge and enlightenment for which our great University stands, sheltered under the protecting care of our munificient Ruler.

"For Colleges on bounteous kings depend
And never rebel was to arts a friend."

KRISHEN DAYAL MATHUR,
Editor.

Mr. OMAR MAHAGIR, M. A. (Osman.)

A very popular president of the Student's Union, has an All India fame as a rare combination of a cogent writer and an excellent speaker, both in English and Urdu.

AZAM STEAM PRESS.

In Memorium

The death of 'Ulaya Hazaret Mader-E-Deccan,' which occured on Sunday the 9th Khurdad 1350 F. (13th April 1941), at 1-30 P. M. is a great tragedy to the Hyderabadis, and especially to us, Osmanians.

Her great personality, Universal popularity, and love for her subjects, and her sympathy for the poor, are a few among her many rare virtues. In truth these qualities are the especial blessings conferred by the Almighty upon those whom He loves.

Her death has not only been a great blow to our beloved ruler and the royal family, but also to each and every citizen of Hyderabad. Every Hyderabadi, of every caste or creed feels he has lost a mother in the demise of the revered Mader-E-Deccan. The worthy example which His Exalted Highness has set up to the young men of his country, by his profound love for his mother, will always remain in the annals of history.

For all the well-wishers of the Asafiya Dynasty, the death of 'Mader-E-Deccan' has been such a shock as cannot easily be got over.

In this great bereavement, we humbly offer our sympathy to our great Sovereign and fervently pray that the Soul of the mother may rest in peace.

MOTHER DECCAN

During the last two centuries, there have been seven mothers of seven ruling princes of the State of Hyderabad, but the distinction of the epithet of 'Mother Deccan' was reserved for the seventh one only--a distinction which speaks volumes for affection and reverence with which the sons of the soil hold her. Millions of people come and pass away from this world, but there are the chosen few who leave the imperishable estate of love and affection of people as their legacy. The history of humanity proves that the glorious end of life some-times eclipses its past. The life of Ulya Hazarat Saheba ends as the 'Mother Deccan' and to be so regarded by the people is and end glorious for a lady. Indirectly, she has served a great political purpose also. By the acquisition of the love and affection of crores of people over whom her illustrious son rules, she has practically sent deeper the roots of his Sovereignty. Sheik Sadi, a great Persian poet and scholar says 'A king is like a tree and his subjects constitute the root of that tree'. In that sense, the tree of the Sovereignty of her son gained so much strength and vitality through her. Again, as the mother of the present Nizam she may be looked upon as the root cause that gave birth to all the reforms and administrative changes that have been achieved during the reign of her son for the happiness, growth and prosperity of this State. The magnitude of this work alone will place her in the most prominent position in the galaxy of the mother princesses of India.

The late 'Mother Deccan' once lived the life of a princess. Again she lived as a princess dowager. But there is a third aspect of her life which is higher than the first two. It is the aspect of mother pure and simple. There is a saying of our Prophet in Arabic, which is rendered in Persian most succinctly in the following words :—

(Heaven is under the feet of the mother). It is this position of mother in which she seems to be unrivalled. In the History of royal personages, very few can be found who showed that devotion, filial affection and respect to mother-hood as the sovereign Osman Ali Khan, Nizam the VII did. It is something sublime and inspiring for the humanity. Again in the list of the princesses Dowager, very few will be found who inspired so much love and affection in the minds of their ruling sons as she did. The history of the reign of the present ruler will be incomplete unless it gives a vivid description of his daily after-noon visits to 'Purani Haveli' where his mother lived. Let clouds thunder and rains fall; let the multifarious duties of a ruling sovereign swarm, but none of these obstacles will prevent his royal motor car from running daily over the Afzalgunj Bridge towards his mother's house in the midst of of continuous Police whistles serving as signals. What for? To pay homage to mother-hood. It will be a moot subject for the future historians of Hyderabad to study the origin and foundations of the Stoic and purely Islamic traits and features of the life of the present Nizam, and I will not be astonished if is they trace atleast a part of them to the influences which the mother exercised upon the son from behind the four walls of the Zenana. It is in the background of these circumstances that to perpetuate the memory of his mother, the sovereign son has issued a Firman to build Zohra Mosque at Aligarh University so that her name be associated with a religious institution and may go down to posterity through future generations of Muslim students who may assemble there daily to worship God. We pay homage to such a soul. May it rest peacefully in Heaven!

MIRZA YAR JUNG
July 6, 1941.

MOTHER DECCAN

During the last two centuries, there have been seven mothers of seven ruling princes of the State of Hyderabad, but the distinction of the epithet of 'Mother Deccan' was reserved for the seventh one only—a distinction which speaks volumes for affection and reverence with which the sons of the soil hold her. Millions of people come and pass away from this world, but there are the chosen few who leave the imperishable estate of love and affection of people as their legacy. The history of humanity proves that the glorious end of life some-times eclipses its past. The life of Ulya Hazarat Saheba ends as the 'Mother Deccan' and to be so regarded by the people is and end glorious for a lady. Indirectly, she has served a great political purpose also. By the acquisition of the love and affection of crores of people over whom her illustrious son rules, she has practically sent deeper the roots of his Sovereignty. Sheik Sadi, a great Persian poet and scholar says 'A king is like a tree and his subjects constitute the root of that tree'. In that sense, the tree of the Sovereignty of her son gained so much strength and vitality through her. Again, as the mother of the present Nizam she may be looked upon as the root cause that gave birth to all the reforms and administrative changes that have been achieved during the reign of her son for the happiness, growth and prosperity of this State. The magnitude of this work alone will place her in the most prominent position in the galaxy of the mother princesses of India.

The late 'Mother Deccan' once lived the life of a princess. Again she lived as a princess dowager. But there is a third aspect of her life which is higher than the first two. It is the aspect of mother pure and simple. There is a saying of our Prophet in Arabic, which is rendered in Persian most succinctly in the following words :—

(Heaven is under the feet of the mother). It is this position of mother in which she seems to be unrivalled. In the History of royal personages, very few can be found who showed that devotion, filial affection and respect to mother-hood as the sovereign Osman Ali Khan, Nizam the VII did. It is something sublime and inspiring for the humanity. Again in the list of the princesses Dowager, very few will be found who inspired so much love and affection in the minds of their ruling sons as she did. The history of the reign of the present ruler will be incomplete unless it gives a vivid description of his daily after-noon visits to 'Purani Haveli' where his mother lived. Let clouds thunder and rains fall; let the multifarious duties of a ruling sovereign swarm, but none of these obstacles will prevent his royal motor car from running daily over the Afzalgunj Bridge towards his mother's house in the midst of of continuous Police whistles serving as signals. What for? To pay homage to mother-hood. It will be a moot subject for the future historians of Hyderabad to study the origin and foundations of the Stoic and purely Islamic traits and features of the life of the present Nizam, and I will not be astonished if is they trace atleast a part of them to the influences which the mother exercised upon the son from behind the four walls of the Zenana. It is in the background of these circumstances that to perpetuate the memory of his mother, the sovereign son has issued a Firman to build Zohra Mosque at Aligarh University so that her name be associated with a religious institution and may go down to posterity through future generations of Muslim students who may assemble there daily to worship God. We pay homage to such a soul. May it rest peacefully in Heaven!

MIRZA YAR JUNG

July 6, 1941.

THE NIGHT OF MARTYRDOM

Black-robed, bare-footed, with dim eyes that rain
Wild tears in memory of thy woeful plight,
And hands that in blind rhythmic anguish smite
Their blood-stained bosoms to a sad refrain
From the old haunting legend of thy pain,
Thy votaries mourn thee through the tragic night
With mystic dirge and melancholy rite,
Crying aloud on thee, *Hussain! Hussain!*
Why do thy myriad lovers so lament,
Sweet saint, is not thy matchless martyrhood
The living banner and brave covenant
Of the high creed thy Prophet did proclaim,
Bequeathing for the world's beatitude
Th'enduring loveliness of Allah's name.

SAROJINI NAIDU.

THE CITY-STATE OF MECCA

"In all ages and areas, from ancient Egypt to modern America, the highest development of human mentality, initiative and achievement has been in urban communities. So long as men remained in the pastoral or agricultural stages there was little stimulus to the differentiation of economic functions, the entire energies of men were absorbed in the task of raising the food supply. But with the city came the division of labour and possibilities for economic surplus, hence wealth, leisure, education, intellectual advance and the development of the arts and sciences."[1]

The object of this paper[2] is simply to draw the attention of the learned world to a rich field for investigation which has till now been almost neglected. The astonishingly rapid expansion of Islam and the extraordinarily capable statesmen which at the very outset the uncultured and unlettered city of Mecca produced are facts which must have some background. Napoleon had remarked that the secret of the valour of the Arab Muslims perhaps lay in their long internecine feuds of pre-Islamic days which formed their character.[3] In a public lecture delivered in 1935 at the Sorbonne, Paris, I had emphasised, that Arabia had already federated economically on the eve of Islam through its periodical fairs and the highly developed system of escorts of caravans. Obviously this economic federation coupled with the fact of their speaking a common language, consulting the same oracles and worshipping gods in common, and to a great extent, observing the same customs, must have greatly prepared the ground for the political unification which Islam later achieved so rapidly, in the anarchic peninsula of Arabia. Now I propound here another thesis, that the

1. Encyclopaedia of Social Sciences, s. v. *City* by William B. Munro.
2. A paper read at the 9th All-India Oriental Conference, held in December 1937 at Trivandrum.
3. Momorial de Sainte-Helene III, 183.

citizens of Mecca had developed a sound and progressive constitution for their city-state long before Islam and had thereby received the necessary training for the administration of the future Arab (Muslim) empire which expanded within the short span of 20 years from the small city-state of Medina to embrace the vast territories of the Persian and Byzantine Empires and others in three continents, Asia, Africa and Europe. As for Europe it is recorded that in 647/27 H. in the time of Caliph 'Uthman, the Muslim armies penetrated into Spain and remained there till Tariq came many generations later to complete the conquest.[1]

The study of the city-states of Arabia has not yet been taken up seriously. For this purpose I could have selected any city other than Mecca, for instance, Ta'if, Dumatuljandal, Taima', Saba', Aden, Suhar, etc. But for me the choice of Mecca was determined by several reasons. Our knowledge about Mecca is surer and ampler than about other cities. Mecca was the cradle of Islam. It was here that the Prophet Muhammad was born and brought up. It was here that the major portion of his missionary life was also spent. It was here that almost all the prominent figures of the first Muslim empire were born and bred. Again, it was the possession of this city that was coveted by all the three contemporary neighbouring empires, Byzantine, Persian and Abyssinian, and to believe the author of the *Kitabuttijan*, even Alexander the *Bicorned*[2] thought it important enough to pay a visit to its sanctuary, the Ka'bah. (Cf. also 'Ainiy, commentary of Bukhariy, VII, 365; Azraqiy, *in loco*.)

1. Tabariy, *Annales*, I, p. 2817; Gibbon *Decline & Fall*, V, p. 555. (Oxf. Univ.)
2. I think, the appellation of "Dhu'l-qarnain" (bicorned, two-horned) had been suggested to the Arabs by the national head-dress of the Macedonians. In 1934, when King Alexander of Jugoslavia was assassinated in Marseilles, his bicorne was among the many relics and ornaments which were placed, in state, by the side of the body of the dead king. Cf. also Baladhuriy, *Futuh* (ed. Egypt), p. 51 for the expression 'the horned Romans' (ar-rum dhat al-qurun).

As for Byzantium, from the time of Aellius Gallus down to Nero all the emperors cherished the desire of extending their influence to the important station of Mecca and made tentative efforts in the direction.[1] According to Ibn Qutaibah[2] the Byzantine Emperor helped Qusaiy in his attempt to capture the city of Mecca. But later, Qusaiy seems to have become independent and neglected Byzantine interests. So, some generations later, when a Meccan, 'Uthman Ibn-al-Huwairith of the clan of Asad, embraced Christianity, the Emperor put a crown on his head and sent him to Mecca with a ukase ordering the Meccans to accept him as their king. 'Uthaman was in a very favourable position, since the Meccans, who were largely dependent upon the Byzantine provinces of Egypt, Palestine and Syria for the victuals and for trade, could not disregard the Imperial ukase. But at the last moment, a kingsman of 'Uthman himself harangued the mass meeting of the Meccans and protested against and ridiculed the impossible innovation of autocracy and kingship for the free citizens of Mecca. 'Uthman was disgusted and returned to Syria. The emperor retaliated by closing the route of his dominions to Meccans and imprisoned those who sojourned there at that time.[3] This happened probably after the Emperor had given the charter of permission to Hashim to come to Syria and had given a letter to the name of the Negus, recommending him to open his country to the Meccan caravans.[4] The Emperor could not push further his designs as the war with Iran had begun. Al-Wahidiy in his *Asbabunnuzul*[5] records that the Medinite Abu-'Amir ar-Rahib also used to threaten that he would bring in the armies of the emperor.

As for the Persians, after their conquest of Yaman, they began to believe that Mecca had automatically come under their influence. Hence the order of the Chosroes to his Governor of Yaman to command the Prophet to go over to

1. Lammens, *La Mecque a la veille del'Hegire*, pp. 239, 243.
2. *al-Ma'arif*, p. 313 (ed. Europe).
3. al-Fasiy, ed. Wuestenfeld p. 144; as-Suhailiy *Rawd'ul-unuf*, I, 146; Lammens, *La-Macque*, p. 267; Sprenger, *Das Lebenu. die Lehre des Mohammed*, I, 89-90.
4. Ya'qubiy, I, 280; Tabairy, p. 1089; Ibn Sa'd, 1/1, pp. 43, 45; *Lisan 'al 'arab*, s. v. ilaf'; Lammens, *La Mecque* 128. etc.
5. P. 195

Iran to see the Emperor. If the Prophet did not obey the order, he was to be arrested and sent to Ctesiphon.[1]

The Abyssinians had actually undertaken an expedition[2] under Abrahah with his famous elephant Mahmud[3] (Mammoth ?).

The innumerable incidents of the Meccan and other Arab notables having been received by the emperors of Byzantium, Iran, Abyssinia etc. also tend to prove that these emperors wished to extend their influence in the interior of the desert Peninsula through pacific means.

TOPOGRAPHICAL

Northern and western Arabia is generally barren and desert. A small oasis with a spring is a sufficient attraction for men to settle down there. If it happens to be on any of the main trade-routes, as Mecca was, it becomes much easier to have there a fixed population. Mecca already existed at the time of Abraham who is said to have visited it, and the Arab authors[4] asssures us that there were dense forests and good pastures in the valley where Mecca is situated. Qusaiy, an ancester of the Prophet, had hewed down[5] a large number of trees in order to make room for the houses which he and his tribesmen constructed around the sanctuary of *Ka'bah.* And there is evidence from other periods to the same effect.[6] Even to-day the Boahir's lodge at Mecca is more like a palace on the Malabar Hill, Bombay, than as a building in the *wadi ghair dhi zar*'[7] where it is situated. It was an important junction of the trade-routes to Syria, Yaman, Taif and Najd, situated near the spring of Zamzam and protected on all sides by high and impre-

1. Tabairy, p. 1572 ff
2. See Conti Rossini for Abyssinian Wars in Arabia in J. A,. 1911, pp. 5-36 and R. S. O., IX, 378 ff; *La Mecque*, p. 280 ff.
3. Ibn Hishad p. 29 ff. 4. Azraqiy, p. 47; cf. *Aghani*, XIII, 108.
5. Ibn. Hisham, p. 80; Qutbuddin, *I'lam bi-a'lam balad 'allah al-haram*, p. 34; Tabariy, p. 1097.
6. Regarding the Jurhumite time see Azraqiy, *Akbar Makkah*, p. 47.
7. Quran, 14; 37.

gnable mountains. Its early history is obscure. Its political life we shall discuss in the next section. Certain pecularities of town-planning may be dealt with here.

Like the *polis* and *asty* (or *high* and *low* towns) of the Greek cities, Mecca has also been divided from time immemorial into *Ma'lat* and *Masfalah*, a division which has persisted to this day. In the remoter antiquity, *Bakkah* and *Makkah* seem to have been the terms in vogue. In his classical history of Mecca, al-Azraqiy quotes[1] that "Bakkah is the place where the sanctuary is situated and Makkah is the city". The Quran confirms this indirectly when it says "the first sanctuary erected for the people is the one situated in Bakkah',[2] and again, "it was He Himself who prevented them from attacking you and prevented you from attacking them in the valley of Makkah."[3] The terms *two Meccas*[4] in the sense of *two cities*[5] used in Ibn Hisham to denote the sister cities of Mecca and Taif also suggest the same thing.

Naturally the aristocracy lived in the ma'lat or the acropolis where also the sanctuary and the grave yard were and are situated. We know for certain[6] that when Qusaio took possession of Mecca, he transferred all bis kinsmen from the *zwahir* (suburbs) to the *bat'ha'* (the centre or the heart of the city). And *vis-a-vis* the sanctuary, was erected the house containing the council hall of *darunnadwah.*[7] The temple had become a pantheon containing 360[8] idols of various tribes and clans. The *Lat* and '*Uzza*' were originally the deities of Taif and Makkah respectively[9] but their duplicates were placed around the Ka'bah and

1. *op. cit., p.* 196, *l.* 12 ('Bakkah mawdi' al-bait wa Makkah al-qaryah).
2. 3:96. 3. 48:24.
4. (Makkatain), cf. Ibn Hishim, pp. 121, 519.
5. (Qaryatain), cf. Quran, 43: 30, See also Mubarrad. *Kamil* p. 291; Baladhuriy *(ansab?)*, pp. 34, 37 (cited by Lamens).
6. Ibn Hisham, p. 80. 7. Qutbuddin, *op. cit.*, 24.
8. Azraqiy, pp. 75-6; Abu Nu'aim, *al-Muntaqa*, (MS. Bazm Abad, Hyderabad, Deccan), fol. 205b-206a.
9. Ibn Hisham, p. 55; Kalbiy, *al-Asnam*, in loco.

were venerated by the Meccans as well.[1] Again, like all Greek towns,[2] Mecca too had its surrounding territory called *haram*, extending roughly to 125 sq. miles.[3] Islam later extended the area of haram and the limits in each direction are now called *miqat*. We do not know if there were in Mecca the necessary forum, race-course, mobilisation ground and reserve pastures, of the existence of which at Medina and other cities there is plenty of evidence. The etymology of *ajyad*, a street in Mecca, suggests, however it having some connection with race-horses.

Prof. Halliday in his interesting article on the Greek city-states observes:—[4]

> "After the turmoil of the ages of migration had subsided there was a change from a normal state of war to one of cosmopolitan peace and from a wandering to a settled life.
>
> "But how these cities came into being? The earliest settlements were undoubtedly in villages...But in general a group of villages found it convenient to fortify some hill or strongly defensible position in the plane, to the shelter of which their women and cattle might be sent when their neighbours crossed the mountain on a summer raid...In this stronghold was usually placed the temple of the god and the palace of the king.
>
> "A natural tendency then arose for the commonalty to leave their villages for dwelling near the city of refuge, and from there to go out daily to their fields; while the nobles found it convenient to establish themselves round the king and the centre of the government. In this way a

1. These must have been transportable idols since Abu Sufyan was carrying them at the battle of Uhud, Tabariy. p. 1395; Aghani XIV,15.
2. Cf. Phillipson, *Internationl Law and Custom in Ancient Greece and Rome*, I, 28; Warde Fowler, *City State in loco*; Halliday, *History of the World* ed. Hammerton, Ch. Greek City States p. 1107.
3. Calculated from the delimitation of the Haram as given by Azraqiy, (pp. 360-61), Ahmad ibn Muhammed al-Khadrawiy, *al-Iqd'ath-thamin fi by fada'ilal-balad al-amin*, (*p. 13*, ed. Cairo, 1290) and others.
4. Halliday: *op. lit.*, p. 1110.

> lower town (*asty* is the Greek word) developed round the citadel or 'polis'. In course of time a wall of fortification was erected round the *asty*".

Mutatis mutandis it is true of Hedjaz also.

Mecca is situated in a deep valley surrounded by high and impregnable mountains. There are only one highway crossing through the city and two byeways to the city.[1] The people did not need to bother much about a wall of fortification. We read, however, in Qutbuddin's history of Mecca[2]:—

> "that in ancient times Mecca had walls of fortification. So in the direction of the *ma'lat* there was a wide wall between the mountain of Abdullah-ibn-'Umar and the mountain opposite to it. There was a gate there with iron plates which the king of India had presented to the prince of Mecca... And there was another wall in the direction of *masfalah* in the street called *darbulyaman* ... At-Taqiy al-Fasiy has mentioned: 'that there was a wall in the higher town besides the one mentioned...and I do not know when these walls of Mecca were constructed nor who constructed them nor who repaired them'. 'And I have seen', continues Qutbuddin, 'in some histories to the effect that there existed a wall in the time of Abbasid caliph al-Muqtadir".

These must have been the renewals of ancient, crude fortifications of pre-Islamic days.

The finest esplanade has from the very beginning been reserved for the sanctuary-edifice, and the Arab authors[3] assure us that the ancient inhabitants of this valley were so superstitious that they would not construct any house near the House of God. They preferred to live in the suburbs, and around the Sanctuary they had only tents. It was Qusaiy, they say, who first thought of erecting dwelling houses around

1. *Mir'at al-haramain*, I, 178 See also any map of the city of Mecca
2. *op. cit.*, p. 7.
3. Tabariy, p. 1097, Qutbuddin, *op cit*, p 34.

the sanctuary, and in order to reconcile the populace to this innovation, he pointed out:—

"If you will live around the Sanctuary, people will have fear of you and will not permit themselves fighting you or attacking you. And moreover, Qusaiy began himself and constructed the council-hall of *darunndwah* in the north side...and it is said that it was situated where there is the Hanafi-musalla to-day wherefrom the Hanafi Imam conducts the five daily services.

"The lands on the remaining three sides of the sanctuary were distributed by him among the Quraishite tribes where they constructed their dwelling houses".

POLITICAL

Qusaiy had married the daughter of the Jurhumite chieftain of Mecca. Hence his claims to the chieftainship after his father-in-law's death. His relatives of the tribe of Quda'ah as well as his partisans in the city helped him; and to believe Ibn Qutaibah[2], even the Byzantine emperor aided Qusaiy in his enterprise, obviously to extend the imperial authority as far into the interior as possible, in order to assure the security of the overland trade-route to and from India.

Qusaiy[3] must have inherited many political institutions, such as the guardianship of the sanctuary of Ka'bah. And no wonder if this man of genius himself created some new institutions to assure and to improve his position. It will, however, be difficult to ascertain how many of the ten[4] public offices which became prominent in the time of Qusaiy, were ancient institutions and what reforms were due to the genius of this brilliant and truly great chieftain. The erection of a Council

1. Qutbuddin, p. 34. 2 *al-Ma'arif*, p. 313.
3. Cf. on him Martin Hatmann's article in the Z. f. Assyriologie, XXVII, pp. 43-9.
4. Ibn 'Abd Robbihi, *al-'iqd al-farid*, II, 45-6 : Zubair ibn Bakkar, *Ansab quraish* (MS. of Istanbul, cited by Lammens, *Triumvirat*, p. 114).

Hall (darunnadwah)[1] as well as the imposition of an annual tax, called *rafadah*,[2] are expressly attributed to Qusaiy. We also know that the institutions of *nasi*,' *ijazah* and *ifadah* were left in the hands of the ancient families.[3] Generally, however, only six offices are mentioned as having been in charge of Qusaiy[4] and they were the more important and lucrative ones.

Ibn 'Abd Rabbihi[5] and other authors mention, as just remarked, that there were ten public offices held hereditarily by ten clans of the Quraishites of Mecca. They may have been originally only ten, as was the case in Venice and Palmyra. Citing Chabot,[6] Lammense[7] remarks:—

"....un Conseil des Dix, compose des chef des dix familles principales. Ce Conseil de Dix, l'epigraphie nous en revele l'existence et le fonctionnement a Palmyre, a cote d'un senat avec son president et son secretaire. Conseil et Senat legiferent, controlent l'execution des lois fiscales, edictent, au besoin, des penalites."

And adds:—

"Ce serait peine perdue de chercher les traces d'une organisation analogue a la Mecque."

In fact, we find many more than ten institutions, reference to which one can glean from the pages of Arabic authors. Ibn 'Abd Rabbih, although he himself expressly mentions that there were only ten chiefs, yet he enumerates 17 functions and ascribes more than one function to several of the said ten holders of offices. To these, four or five more can easily be added from available sources. This is a list of them:—

Nadwah, mashurah, qiyadah, sadanah, hijabah, siqayah,

1. Ibn Hisham, p. 83; Tabariy, p. 1099; Ibn Sa'd, 1/1, p. 39; Azraqiy p. 65.
2. Ibn Hisham, p. 83; Tabariy, p. 1099; Ibn Sa'd, 1/1, p. 41; Geog. of Yaqut s.v. Makkah; *Akhbar Makkah*, ed. Wustenfeld, IV, pp. 31-2.
3. Tabariy, p. 1134; Ibn Hisham, pp. 66 67,77,78.
4. Azraqiy, p. 66 (umur sittah). 5. Ibn 'Abd Rabbibi, *op. cit.*, II, pp. 45-6.
6. *Choix des Inscriptions de Palmyre*, 24, etc. 7. *La Mceque*, p. 69.

'imaratulbait, ifadah, ijazah nasi,' qubbah, a'innah, rifadah, amwal muhajjarah, aysar, ashnaq, hukumah, sifarah, 'uqab, liwa,' hulwan-un-nafar.

Leaving aside the vexed question of the Council of Ten, I would rather try to explain in my own way the political structure and the working of the constitution of the city-state of Mecca.

To begin with, the community or the population was termed "*jama'ah*,"[1] a word retained by the Prophet in order to designate and distinguish his adherents from others, as his epistle to the prefect of Bahrain[2] also testifies. The word *millat*,[3] however, had a sense more religious than political. The word *qawm* has been used in the Quran[4] in a meaning wider than the general body of voters. Those who possessed the right of vote and a voice in the public deliberations are always termed as *mala*.'[5] It is only with the *tradi* (consent) of the *mala*' that the local potentate could act. The Quran has also employed the word in this sense.[6] The Quran in mentioning the *mala*' of Pharoah always excludes the Israelites who had no franchise. The king of Egypt in the time of Joseph and the queen of Sheba all have had, according to the Quran,[7] their respective *mala*' for consultation. They are the *ulu quwah* and *ahl-ul-hall wa al-'aqd*, and they interfere if any thing goes wrong.[8] The same is reported to have been the case in Palmyra.[9] This *Senate House* of Mecca was a council of elders only, since al-Azraqiy[10] and Ibn Duraid[11] assure us that only the quadragenerian citizens of Mecca could attend a

1. Waqidiy, p. 59 *l*. 3.
2. Ibn Sa'd, 2/1, p. 27; cf. Hamidullah, *Corpus des Traites*, No. 55; idem *Documents sur la Diplomatic musulmane*, p. 74.
3. Cf. Quran, 2 : 130 ; 3 :95 ; 4 : 126 ; etc.
4. Quran, 7 : 60, 66, 109, 127 ; 11 :27, 37 ; 23 : 24, 33 ; etc.
5. Quran, 2 : 246 ; 28:20 ; etc.
6. Quran, 2: 233 ; 4 : 29.
7. Quran, 12 ; 43 ; 27:29,32.
8. al Fasiy, p. 109.
9. Lammens, *La Mecque*, p. 79.
10. *op. cit.*, 64, 65, 465.
11. *Ishtiqaq*, p. 97.

meeting of the *darun-nadwah*. The sons of the chieftain Qusaiy, however, were privileged to be exempt from this age limit.[1] It is probably of this age of franchise that we have a souvenir in the Quranic verse[2] *hatta idha balagha ashuddahu wa balagha arba'ina sanatan*. In later times more liberal concessions seem to have been in vogue and we hear, for instance, that Abu-Jahl was admitted therein although he was only 30 years of age and this franchise of his was on account of his wise council (*lijudi ra'yihi*),[3] and Hakim-ibn-Hizam, when only 15 or 20 years old.[4] The Council of Elders in Sparta was in fact a council of elderly people and none under 60 years[5] of age could be a member of the local Gerousia.[6]

Prior to Qusaiy, the Meccans must have deliberated either in the open forum or the tent of their chieftain. It remained, anyhow, for Qusaiy to erect a special hall for the meetings of the city-council and to name it darun-nadwah, a word which has also been commemorated by Hasan-ibn-Thabit,[7] the poet laureate of the Prophet. It was situated a few yards to the North of Ka'bah but it has since been demolished to extend the mosque of the *Haram* around the Ka'bah. Naturally the Council did not meet at regular intervals but only as occasion required.[8]

It was here that the consultations were held and wars declared or defensive measures discussed.[9] It was here again that marriages were celebrated and treaties of commerce concluded.[10] Foreign guests were also entertained here.[11] Like the aborigines of Nilgris,[12] the pre-Islamic Meccans also performed a parti-

1. Azraqiy, pp. 64, 65, 465.
2. Quran, 46 : 15.
3. Ibn Duraid. *op. cit.*, p 97, l. 6.
4. Ibn 'Asakir. IV, 419, *l*. 2.
5. Cf. the Hindustani exprssion 'a youngster of sixty' (satha patha).
6. Pultarch's Lives Lycurgus; Warde Fowles, p. 71, n. 2.
7. Diwan, No. 145, 183.
8. Ibn Duraid, p. 97.
9. As an instance, the plan to murder the Prophet which led to his migration to Medina.
10. Lammens, *La Mecque* p, 72.
11. Waqidiy, ed. von Kremer. p. 23.
12. Hamidullah. *Nilgri*, p. 26 (ed. Hyderabad).

cular ceremony when a girl reached her puberty, and clad her in the gown of grown up women (dir'). This also was done in the darun-nadwah.[1]

Apart from this central municipal council, there were as many ward councils or communes as there were tribes or clans in the municipal area. These were called *nadi*,[2] corresponding to the *Saqifah* of Medinite tribes. The *darun-nadwah* was the "*nadi*" *par excellence*, a common and central *nadi* for all the local tribes. And in fact the famous traditionist and lexicographer Abu-'Ubaid[3] derives *nadwah* and *nadi*, both, from the same root *nxdx*. The Quran also immortalises this *nadi* by its "*fal-yad'u naa:yahu*"[4] and "*ta'tunfi nad: kimul.munkar*".[5] It was in these family circles or clubs that foreigners were affiliated to the family[6] and also the excommunication (*trad* or *khal'*) of some hot-heated culprit from among the members of the family was proclaimed.[7] It was here that the family members and casual visitors assembled sometimes even for hearing night-tales (*musamarah*).[8] Commercial transactions and the arrival and departure of caravans all had to have recourse to these centres.

Regarding Athens we read the following in Jowett's Thucydides.[9]

> "In the days of Cercrops and the first kings, down to the reign of Theseus, Athens was divided into communes, having their own town-halls and magistrates. Except in case of alarm the whole population did not assemble in Council under the king but administered their own affairs and advise together in their several townships.

1. Ibn Hisham, p. 80.
2. For a description see Lammens, *La Mecque* p. 88, etc.
3. *Gharib al-hadith*, fol 191a (cited in *La Mecque*, p. 73).
4. Quran, 96 : 17.
5. Quran, 29 : 29.
6. Ibn Hisham, pp. 243, 246 ; Aghani. xiv, 99.
7. Aghani, VII, 52,53.
8. Azraqiy, p. 376 ; *La Mecque*, p. 88 ff n. 8 ; *Agham*, XIII, 112.
9. Vol. I, 104 (cited by Warde Fowler, pp. 48-9).

In Mecca there was the office of heraldry (called *munadi* also *muadhdhin*,— "Mu'adhdhin" being retained up to this day, in the original sense, among the Syrian nomads)[1] to call the meeting.[2] Each tribal chief had his particular *munadi* or *munadis*[3] These heralds were used not only for emergency meetings but also for inviting to feasts and for making known the banishment of some member of the family. Non-herald commoners and even foreigners could call for the emergency meeting and for that purpose they used to put off their clothes and cry completely naked. The Arabists know them very well by the common term *an-nadhir al'uryan*.

Qusaiy is represented as a varitable monarch, an autocrat and a supreme chief of the whole city whose word was law,[4] and he was gratefully remembered the posterity for uniting the tribes of Quraish, converting them into the elite of the city, hence his sobriquet of *Mujammi'*[5] (one who unites). After the death of Qusaiy, however, an oligarchy ensued because Qusaiy himself had distributed his several office among his several sons,[6] and probably this was the orign of the reputed Council of ten[7] at the dawn of Islam. We do not deny the possibility of Qusaiy's exercising the supreme authority, nobody challenging him owing to the great deeds he had performed, yet in later times, terms like *saiyid-un-nas*[8] etc.,' should not mislead us to take them in the sense of '*doge*' of Venice renown. The office of *qiyadah*[9] in Mecca is to me of dubious character. The brilliant sketch of Wellhausen on *Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit* also tends to arrive at the same conclusion. Yes,

1. Cf. *La Macque*, p. 160, n. 3.
2. The word was used even as late as the year 9 H.; cf. Abu 'Ubaid, *kitabal-amwal*. section 455.
3. Ya'qubiy,"qubiy,!I, 281 (*l*. 14), 290, 292; cf. Lammens, *La Mecque*, pp. 64-5; idem, *Berceau*, 1, 229; *Aghani*, xi, 65,*l*.5; Ibn Duraid p. 94; *Mufaddaliyat* ed. Throbecke, 2'2.
4. Ibn Hisham, p. 84.
5. Tabairy, p 1095, Ibn Hisham, p. 80.
6. Mas'udiy, *Tambih*, p. 293, *Murnj*, III, 119.20, IV, 121.
7. Ibn 'Abd Rabbiai, II, p. 45; Masudiy, *Murnj*, III, 119.20, IV, 121.
8. Azraqiv, p. 64; *La Mecque*, p. 69.
9. Azraqiy, p. 65.

there was a marked tendency in various parts of Arabia towards monarchy. As already said, 'Uthman ibn al-Huwairith had attempted it in Mecca.[1] In Medina Abdullah-ibn-Ubaiy-ibn-Salul was to be crowned king (*liyutauwijuhu*) as Ibn Hisham,[2] al-Bukhariy[3] and at-Tabariy[4] have recorded, when the immigration of the prophet to Medina changed the idea of his partisans. Sprenger[5] believes that :—

> "Schon in ihren wilden Zustande also haben diese Leute (d. h. Beduinen) monarchische Ueberzeugungen."

RELIGIOUS

The most important civil function in those days of self-help, was the administration of the Temple. With this are connected the offices of *saddanah, hijaban, siqayah* and *'imaratul bait*. Again, the offices of *aysar* and *azlam* remind us of Greek oracles of the temples of Delphi and others. Similarly they were individuals pretending to possess supernatural powers like *'aif, kahin, 'arraf, khirrit, munajjim* and even a certain number of those called *sha'ir* or poet. People also believed in *hatif* or the unseen talker. One met there also with sacrifices (*qurban*).

Sadanah (administration of the sanctuary) and *hijabah* (gate-keeper of the temple) also meant the possession of the key of the door of the sanctuary-edifice and the exclusive power of letting anybody inside the sacred edifice, which always brought pecuniary gratifications to the officer concerned. It is well-known how Qusaiy brought the office of the gate-keeper for a bagful of wine[6] and how the Prophet returned the key to the head of the old family entitled to its possession.[7]

1. Subailiy, 1, 146, cf. supra. 2. p. 727; cf. Quran, 63;8 in any commentary.
3. *Sahih* of Bukhariy, 79 : 20' 4. p. 1511 ff
5. *Das Leben und die Lehre des Mohammed*, 1, 249.
6. Tabairy, chapter Qusaiy.
7. See any biography of the prophet, conquest of Mecca.

The offices of *siqayah* (supplying water) and *imarotul-bait* (keeper of the temple) are taken notice of by the Quran[1] also. Supplying the pilgrims with water must have been a lucrative job in Mecca where water is so scarce and the sacred water of Zamzam was required by every pilgrim. In Palmyra a similar office brought in annually the considerable sum of 800 gold-dinars.[2] Probably the citizens and the inhabitants of Mecca were exempt from paying any fee in this connection. The office of *'imarah* (keeper) meant according to Ibn 'Abdulbarr, to make casual rounds and see that the sanctity of the temple was not violated by abusive talks and quarrels and by too-loud speaking. Al-'Abbas the uncle of the Prophet attended to that function.[3]

I do not know if the pre-Islamic Hajj consisted of as many rituals as to-day and whether certain acts are not amalgamated which had formerly separate existence and had nothing to do with the cult of Ka'bah. It is noteworthy that in the Quran[4] the same verb has been employed both in connection with the Ka'bah and the mounts Safa and Marwah : ليطوفوا بالبيت العتيق - يطوف بهما Still a circumambulation is observed regarding the Ka'bah and only a walking to and fro between the mountains regarding the Safa and Marwah. In connection with hajj, the offices of *ijaza* and *fada*[5] also had a certain importance and gave the privilege of first departure to certain families. But I will dwell more on the institution of *nasi* or intercalation.[6]

Even in the primitive conditions of their civilization, the Meccans of pre-Islamic times had known the inequalities and

1. Quran, 9 : 19.
2. Chabot, p. 30 (cited in *La Mecque*).
3. Ibn'Abd Rabbibi, 11, 46.
4. Quran, 2 : 158; 22 : 29.
5. Ibn Hisham, p. 76 ff,
6. For its practical bearing on the history of the time of the Prophet, see my paper in the Proceedings of the second session of the Idara Ma'arif Islamiya, Lohore. For a general treatment of the subject, see the thesis of Mohmoud Effendi (later M. Pacha Falaki) in J.A., 1885, pp. 109-92 (also Arabic version), 'Memmoire sur le clendrier arabe'. Axel Moberg's recent monographe '*An Nasi' id der islamischen Tradition*' is useful for the references of the literature.

there was a marked tendency in various parts of Arabia towards monarchy. As already said, 'Uthman ibn al-Huwairith had attempted it in Mecca.[1] In Medina Abdullah-ibn-Ubaiy-ibn-Salul was to be crowned king (*liyutauwijuhu*) as Ibn Hisham,[2] al-Bukhariy[3] and at-Tabariy[4] have recorded, when the immigration of the prophet to Medina changed the idea of his partisans. Sprenger[5] believes that :—

> "Schon in ihren wilden Zustande also haben diese Leute (d. h. Beduinen) monarchische Ueberzeugungen."

RELIGIOUS

The most important civil function in those days of self-help, was the administration of the Temple. With this are connected the offices of *saddanah, hijaban, siqayah* and *'imaratul bait*. Again, the offices of *aysar* and *azlam* remind us of Greek oracles of the temples of Delphi and others. Similarly they were individuals pretending to possess supernatural powers like *'aif, kahin, 'arraf, khirrit, munajjim* and even a certain number of those called *sha'ir* or poet. People also believed in *hatif* or the unseen talker. One met there also with sacrifices (*qurban*).

Sadanah (administration of the sanctuary) and *hijabah* (gate-keeper of the temple) also meant the possession of the key of the door of the sanctuary-edifice and the exclusive power of letting anybody inside the sacred edifice, which always brought pecuniary gratifications to the officer concerned. It is well-known how Qusaiy brought the office of the gate-keeper for a bagful of wine[6] and how the Prophet returned the key to the head of the old family entitled to its possession.[7]

1. Suhailiy, 1, 146, cf. supra. 2. p. 727; cf. Quran, 63;8 in any commentary.
3. *Sahih* of Bukhariy, 79 : 20' 4. p. 1511 ff
5. *Das Leben und die Lehre des Mohammed*, 1, 249.
6. Tabairy, chapter Qusaiy.
7. See any biography of the prophet, conquest of Mecca.

The offices of *siqayah* (supplying water) and *imarotul-bait* (keeper of the temple) are taken notice of by the Quran[1] also. Supplying the pilgrims with water must have been a lucrative job in Mecca where water is so scarce and the sacred water of Zamzam was required by every pilgrim. In Palmyra a similar office brought in annually the considerable sum of 800 gold-dinars.[2] Probably the citizens and the inhabitants of Mecca were exempt from paying any fee in this connection. The office of *'imarah* (keeper) meant according to Ibn 'Abdulbarr, to make casual rounds and see that the sanctity of the temple was not violated by abusive talks and quarrels and by too-loud speaking. Al-'Abbas the uncle of the Prophet attended to that function.[3]

I do not know if the pre-Islamic Hajj consisted of as many rituals as to-day and whether certain acts are not amalgamated which had formerly separate existence and had nothing to do with the cult of Ka'bah. It is noteworthy that in the Quran[4] the same verb has been employed both in connection with the Ka'bah and the mounts Safa and Marwah : ليطوفوا بالبيت العتيق - يطوف بهما Still a circumambulation is observed regarding the Ka'bah and only a walking to and fro between the mountains regarding the Safa and Marwah. In connection with hajj, the offices of *ijaza* and *fada*[5] also had a certain importance and gave the privilege of first departure to certain families. But I will dwell more on the institution of *nasi* or intercalation.[6]

Even in the primitive conditions of their civilization, the Meccans of pre-Islamic times had known the inequalities and

1. Quran, 9 : 19.
2. Chabot, p. 30 (cited in *La Mecque*). 3. Ibn'Abd Rabbihi, 11, 46.
4. Quran, 2 : 158; 22 : 29. 5. Ibn Hisham, p. 76 ff,
6. For its practical bearing on the history of the time of the Prophet, see my paper in the Proceedings of the second session of the Idara Ma'arif Islamiya, Lahore. For a general treatment of the subject, see the thesis of Mohmoud Effendi (later M. Pacha Falaki) in J.A., 1885, pp. 109-92 (also Arabic version). 'Memmoire sur le clendrier arabe'. Axel Moberg's recent monographe' 'An Nasi' id der islamischen Tradition' is useful for the references of the literature.

differences between the lunar and the solar years. So with a rough calculation, every third year an extra month was added to the usual twelve months and this month was intercalated between Muharram and Safar, and declared with ceremony, by the office-bearer who always belonged to the family of Banu Fuqiam and was called Qalammas[1] or Qalambas[2]

Intercalation brings us to *ashhur-hurum* or the months of the Truce of God· As everywhere else, the pilgrimage to the sanctuary of Ka'bah during fixed times of the year witnessed considerable commercial activity, as the influx of the pilgrims demanded more imports of victuals and new-comers also carried on private business and trade in goods brought by themselves making the pilgrimage a fair, simultaneously. The Quran[3] also encourages the continuation of the habit in the verse : (ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربكم). As this periodical fair brought large sums in the from of *'ushr* or tithes to the chieftain in possession of the site of the fair, he employed all possible means, including the well-developed system of escorts, to induce foreigners to come over there in larger and larger numbers. The institution of *ashhur-hurum* or months of general truce owes its origin to the same need of attracting foreigners and customers. The longest period of these *ashhur-hurum*, known to Arabian history was of three months and was connected and coincided with the hajj of the Ka'bah.[4] This clearly shows, in spite of the persistant and repeated denial of Lammens[5] and his partisans; the great importance of this fair which was attended by people from all parts of Arabia and even Syria and Egypt.[6] Incidentally it may be mentioned that certain privileged families of the Quraishities enjoyed this truce

1. Qalammas is generally given as the title of the individual who first introduced intercalation in Arabia, but I have also come across the plural from *qalamisah*, in the *al-Muhabbrr* of Ibn Habib (MS. Brit. Meseum).
2. A synonym, cf *Lisan*.
3. Quran, 2 : 198.
4. See also the commentaries of the Quranic verse 9 : 36,
5. Specially in his monographe L' Organisation militaire de la Mecque, J. A., 1916.
6. Azraqiy, p. 107; Ibn Hisham, p. 282; Ibn Sa'd, 1/1, p, 145.

of God for eight months consecutively and it was referred to in history as *basl*.[1] It is to be noted that this was a personal privilege and the general people could not enjoy its protection. Anyhow it shows a marked tendency in the country towards general pacification instead of *bellum omnium contra omnes.*

It was certainly unfortunate though perhaps not intentional, that every three years when the Qalammas proclaimed in the month of hajj (dhul-hijjah) that the next month would not be the sacred month Muharram, but that it would be a profane month during which the bedouins were not bound to observe the truce. The continuity of the three consecutive months of truce was intercepted therewith and the result was that hardships were caused to those intending early departure.

The Meccans recognised a truce for three consecutive months and one stray month, viz. Dhul-qa'dah, Dhul-hujjah and Muharram for the Hajj-Akbar of the Ka'bah and 'Arafat;[2] and Rajab for the celebration of the Hajj-Asghar or *Umhar*[3] of the Ka'bah. The Quraishite influence was responsible for an almost universal respect, of this 'truce of God' in Arabia. There were other truces connected with other localities and other fairs and hence the famous expression of the "Rajab of the Mudarite tribes" occurring in the oration of the Prophet on the occasion of his last pilgrimage,[4] as contradistinguished from the "Rajab of the Rabi-'ah tribes". These non-Quraishite truces were less rigorously observed. As remarked just now, the Quraishite truces were universally observed except by the two Christianised and proverbially bandit tribes of Tay' and

1. Ibn Hisham, p. 66 ; cf *Qamus*, s. v. BSL.
2. Cf, the instructions of the Prophet to 'Amr ibn Hazm where the terms hajj *akbar* and *asghar* are clearly explained (Ibn Hisham, p. 961 ; cf. also *Tafsir* Tabariy for the verse 9 ; 3)
3. *Ibid.*
4. See for complete text, Ibn Hisham, pp. 968-70 ; Tabariy, pp. 1753-55 ; Jahiz, *al-Bayan wa at-tabyin*, II, 24-6 ; Ya'qubiy, II. 122-3 ; Ibn 'Abd Rabbihi, '*Iqd*, chaptar *Khutub*; etc.

Khath'am.[1] It was certainly due to the extensive commercial relations of the Quraishites and their wide spread alliances. In this; connection it may be interesting to read a paragraph from the very important work of Muhamad ibn Habib (d. 245H.) which has not yet been edited and which has a unique manuscript in the British Museum, I mean the *Kitab al-muhabbar:*—[2]

> "Every trader who set out from Yemam or Hedjarz (for Dumatul-jandal in the extreme North of Arabia), acquired the services of the Quraishite escort as long as he travelled in the country inhabited by Mudarite tribes, since no Mudarite hasassed the Quraishite traders and also no ally of the Mudarites. So, the Kalbites never harassed them as they were allied to the Banu al-Jusham and the Tay'ites also never harassed them on account of their alliance with the Banu Asad."

It may be recalled that the Tayites and Khath'amities[3] did not believe in the pagan Arab truce of God. Owing perhaps to their Christianity. Our author continues:—

> The travellers acquired the services of the escorts of Banu 'Amr ibn Marthid which protected them in the whole of the country inhabited by the tribes of Rabi'ah... When going to al-Mushaqqar in Bahrain the Quraishite escorts were sought. . When going to the fair of Maharah in the southern extermity of Arabia, escorts of Banu Muharib were employed. . In the fair of ar-Rabiah in Haydramaut, the Quraishites were escorted by the Banu Akil-ul-murar and the rest of the people were escorted by the Al-i-Masruq of Kindah. It brought glory and eminence to both these tribes yet the Akil al-murar[4] superceded their rivals on account of the partonage of the Quraishites...'Ukaz was the greatest of the Arab fairs and was visited by the tribes of Quraish, Hawazin, Ghatafan, 'Adl, ad-Dish, al-Jabbar, al-mustaliq, al-Ahabish and others.

1. Ya'qubiy, I, 313-14 ; Marzuqiy, Vol. I. 90 ; II, 166.
2. Chapter 'aswaq al-'arab', fol. 94-6.
3. No wonder that it was a Khath'amite who consented to serve as a guide for Abrahah in his expedition against the Ka'bah, cf. Ibn 'Abd Rabbihi, II. 78.
4, Cf. Olinder, *The Kings of Kinda of the family of Akil al-murer* (Lund, 1927).

Although the offices of *qubbah* (canopy) and *a 'innah* (reins of the horse) are explained by later Arab authors[1] as 'pitching a public tent in order to collect therein donations and contributions for some public emergency' and 'the hipparch' or master of the cavalcade' respectively, yet probably Lammens[2] is right when he says that originally *qubbah* ment the sacred canopy sheltering transportable idols in wars or during festivals. And by the office of the reins, the same author understands the privilege of conducting a horse by its reins when a deity was taken in procession on horseback.

The mention of the sacred canopy is not rare in Arabic literature and naturally it is difficult to believe that in the primitive Meccan society there could have been two separate offices for the master of the cavalcade and commander of the rest of the army.[3] In Islamic times when many of the rites and rituals of the days of Jahiliyah were forgotten owing to their desuetude for centuries, ingenious lexicographers often explained antiquated terms the signification of which they did not know, by the root-meaning, isolating them from their associations. The mastership of the reins was inherited, it is said, by Khalid ibn al-Wolid deducing probably from the fact that it was he who led the Meccan cavalry at the battle of Uhud[4]. But excepting Uhud, the Quraish never used any cavalry worth mentioning either in Badr or Khandaq or any other battle, horses always being a luxury for the Arabs Moreover, the offices of canopy and of reins are indissolubly con-

1. Ibn 'Abd Rabbhi, 45;
2. His monographe 'Le culte des Betyles et les processions religeuses chez les Arabes preislamites' in 'L' Arabie occidentale'.
3. Regarding Athens, however, it is recorded that: 'There are also ten Taniarchs, one from each tribe...and each commands his own tribesmen and appoints captains of companies (Lochagi) There are also two Hipparchs elected by open vote from the whole mass of the citizens, who command the cavalry, each taking five tribes' (*Athenian Constitution* by Aristotle, Eng. trans., pp. 112-13).
4. In fact the hipparch of the right flank was Khalid ibn al-Walid and the left flank was led by 'Ikrimah ibn Abi Jahl. Cf. Ibn Hisham, p. 561.

nected in literature and entrusted to the custody of the same person,[1] and obviously it is not necessary that the commander of the cavalry alone should be the collector of public subscrip. tions and vice versa.

FINANCE

Finance comes next. The ingenious Qusaiy is said[2] to have found a very good pretext for imposing an annual tax on the people of Mecca by explaining to them the necessity of feeding the poor pilgrims and inviting others to a feast called *san'ah* on behalf of the city as was done by various doges in other parts of Arabia.[3] The surplus must naturally enrich the coffers of the the chief. The family of Nawfal[4] inherited this privilege from Qusaiy and perhaps the richness of Khadijah may partly be attributed to this source. Al-Ya'qubiy[5] asserts that when Qusaiy had introduced many innovations, like the construction of houses in close proximity to the sanctuary, he suggested this feast to appease the wrath of foreign pilgrims. Anyhow Qusaiy retained the custom to his profit and the profit of his successors. This tax was called *rafadah*. Qusaiy also exercised the right of escheat on the property of foreigners dying without heirs.[6]

The import-customs[7] especially during the fair have been another great source of income. The Jurhum-Qatura confederacy of Mecca had divided the city into two spheres of influence and each of the unit-chiefs could levy the tax on whoever entered from the main entrance situated in his part of the city.[8] Qusaiy needed not this division as he

1. Ibn 'Abd Rabbihi, II, 45.
2. Ibn Hisham, p. 83 ; Tabariy, p. 1099; Ibn Sa'd, 11, p. 41 ; Yaqut, s. v. Makkah.
3. Muhammad ibn Habib, *op. cit.*, fol. 94-96 ; Marzuqiy, *Azmiuah* II. 161-66
4. Ibn 'Abd Rabbihi, II. 45. 5 I, 275-6.
6. Baladhuriy, *Ansab* fol. 28/a (cited in *La Mecque*, p. 44).
7. Even the pre-historic Amalekites are said to have exercised the same right in Mecca. Cf. *Mana'ih al-Karam*, cited in the *Mir'at- al-Haramain*. I, 69
8. Ibn Hisham, p. 72 ; Azraqiy, p. 47 ; Aghani, XIII. 108.

was the sole beneficiary[1] of this; and of course the inhabitants of the city themselves were exempt from this tax[2]. The same was the custom in other cities of Arabia and generally a tithe was the tariff *ad valorem*[3]. A curious incident of free import is mentioned by Azraqiy[4] viz., that once when the Ka'bah was burnt and then demolished by a flood, the Meccans bought a ship wrecked on the Port of Shu'aibah and permitted the crew to come to Mecca and sell whatever they had rescued without paying the customary tithes.

Again, the offerings to the sanctuary must have some guardian and in fact we are assured[5] that the Banu-Sahm held this office of the *amwal muhajjarah*. Another source of income but not of public income was the compulsory purchase of a suit of garments from some inhabitant of Mecca as only in that dress or quite naked could one accomplish the circumambulation of the Ka'bah[6]. Further, they had developed a system of paying-guests for the foreign pilgrims and took from them some garments or beast of sacrifice, and this tax or fee was called *harim*[7].

ADMINISTRATION OF JUSTICE

Public Council and judiciary must be distinguished from each other. The latter was concerned with crimes and civil claims only. In Arabia as elsewhere, "to rule meant to arbitrate and decide" as the very word ***hakama*** signifies[8]. The chief of each tribe was also its arbiter[9] Inter-tribal disputes, however, necessitated

1. Ibn Sa'd, 1/1, p. 39. 2 *Ibid.*
3. Cf. Muhammad ibn Habib and Marzuqiy re fairs in Arabia.
4. pp, 106-7. 5 Ibn 'Abd Rabbihi, II, 46.
6. *Tafsir* of Tabariy, VIII. 120, commentary of 7;31.
7. Ibn Duraid, 171-2.
8. For a detailed description see my article in *Majjala 'Uthmaniya*, XI
9. Cf. Ya'qubiy, 1,300.

recourse to oracles and well-known foreign arbitrators. The *kahin, hatif, 'a'if, azlam* and *aysar*[1] remind us of the oracles of Delphi and other Greek temples. There was no common judge for the whole city of Mecca after Qusaiy as owing to family jealousies discord reigned, and hence the order of chivalry, the famous *hilful-fudul* was instituted which aimed at helping the oppressed, be he a citizen or a foreigner arrived in the city-limits.[2] It could have developed into a fixed and organised institution but presently the Islamic movement began and rendered it superfluous in the face of the well-organised judiciary appointed by the central government embracing the whole of Arabia and southern Palestine in the very time of the Prophet[3].

The office of *ashnaq* may be mentioned in this connection. It is said that the family of Caliph Abubaker held it hereditarily.[4] It meant[5] that whoever committed a compoundable tort or crime, the officer in charge of *ashnaq* determined the extent and value of the pecuniary liability and the whole city was bound by his calculations and the family of the culprit subcribed towards the amount. The custom has very clearly been explained in the constitution of the city State of Medina promulgated by the Prophet soon after his migration to it, and the document containing the said constitution has fortunately come down to us *in toto*.[6] I do not know wherefrom Lammens[7] has taken the explanation which he ridicules, that

1. Muhammad ibn Habib, *op. cit.* ascribes a whole chapter for the details of the procedure of the Arab oracles.
2. Ibn Hisham, pp. 65-86; Suhailiy, I, 90.94; Ibn Sa'd, 11 1.p. 42; *Musand* of Ibn Hanbal, I, 190.
3. See for details my article in the *Islamic Culture*, April 1937, 'Administration of Justice in early Islam.
4. Ibn'Abd Rabbihi, II, 45.
5. *Ibid.*
6. Ibn Hisham, pp. 341-44; Abu-'Ubaid, *Kitab al-amwal*, ss. 517; Ibn Kathir *al-Bidayah*, III, 224-26. Also my article in *Majalla Taylasaniyin*, 1939.
7. *La Mecque*, pp. 67-8,

the officer in charge of *ashnaq* paid the blood or compound-money from his private purse.

AMBASSADORSHIP

The last item in civil administration, though by no means the least, was that of the *safir-munafir*.[1] Thins is ascribed to Banu 'Adiy, the family of Caliph 'Umar. This Ibn 'Abd-Rabbihi explains in a succinct manner:—

> "Whenever there was a war, they sent 'Umar as their envoy plenipotentiary; and if and when a foreign tribe challenged the priority of the Quraish, it was again he who went and replied and the Quraish agreed to whatever he uttered."[2]

MILITARY

In connection with war, our authors mention several hereditary offices, Of these *canopy* and *reins* have already been disposed of. Others are *'uqad, liwa,* and *hulwan-annafr:*

The office of *uqab* or standard-bearer is said[3] to have reposed in the Banu Umaiyah. Apparently this was the office of the custodian of the national flag in time of peace and of unfurling it as a call to mobilisation. In the actual expedition other persons as well could be elected and entrusted with this responsibility.[4]

our authors[5] distinguish between the office of *'uqab* and that of *liwa* (Banner) but do not give the difference between them. I have not been able to solve the difficulty, especially as the offices belonged to two different families. Perhaps the *upab* was a war-flag, and *liwa* a tribal one used when there were other allies also.

1. Ibn ,Abd Rabbihi, II, 45.
2. *Idid.*
3. *Ibid.*
4. *Ibid.*
5. *Ibid.*

Ibn 'Abd Rabbibi concludes his narrative with the desription of a very curious office, for which see a P. S. note at the end of this article, which no other source mentions, and says[1] :—

> As for the *hulwan'an-nafar* (Gratuity of the Mobilisation), there was no monarchic king over the Arabs (of Mecca) in the Jahiliyah. So whenever there was a war, they took ballot among the chieftains and elected one, be he a minor or a grown-up man, Thus on the day of Fijar, it was the turn of the Banu Hashim and as a result of the ballot al-'Abbas who was a child was elected and they seated him on a shield, to carry him.

This is not the place to describe in detail the military organisation[2] and the laws and practices of the Quraish in time of war and neutrality. I shall only make a passing reference to the *mirba'* or the fourth part of the booty, the *fudul* or the undividable fractions, the *nashitah* or the captures before the general plunder, and the *safiy* or the choice—which were the rights and prerogatives of the commander of the tribe in a razzia or other expedition.[3] Ra'sulhajar al-khushaniy, al-Qa'qa' at-tamimiy, and Dirar ibn al-khattab al-fihriy are mentioned by Ibn Duraid[4] among those who were entitled to the *mirba* in the Jahiliyah.

I have no time to give in detail all the arguments which Lammens[5] has put forward in support of his interesting thesis that the Meccans had established and developed a standing army of merecenaries and negro slaves. His aricle is considerably documented, yet the main purpose of the learned—though unfortunately in the main much prejudiced and unsympathetic —Jesuite Father was professedly to show that the Quraish were a cowardly people who dreaded fighting and only in order to assure their communications so essential for the maintenance of

1. *Idem*, p. 46 2. For certain details see Mas'udiy, *Tanbih*, pp 279-80.
3. Marzuqiy, II, 330. 4. *Ishtiqaq*. pp. 64, 145, 318.
5. Les Ababish et l' Organisation militaire de la Mecque au siecle de l'Hegire in J. A., 1916 or in 'L'Arabie occidentale,' pp. 237-93.

their wide commercial intereet, they had organised in Mecca a standing army of mercenaries and slaves. A conqueror like Napolean was astonished at and had envied[1] the military achievements[2] of these early Meccans and if a prejudiced Jesuit priest does not want to see any value in the valour of Meccans like Khalid ibn al-Walid, Sa'd ibn Abi Waqqas and Abu 'Ubaidah, it will not be their fault.

SOCIAL

The Greeks called the outsider barbarians, "and the Greek word for enemy actually meant the outsider."[3] The Arabs on the countrary used while referring to foreigners with the harmless term *'ajami*, meaning a dumb person, as distinguished from their own oratory and rhetoric. But everywhere in Arabia as well as Greece foreigners sojourned and even became domiciled.

In Greece the resident aliens formed a special class between the slaves and the citizens and were called metics.[4] "The metics enjoyed for themselves and their families all the protective rights held by the citizens; but they could hold none of the state offices, neither could they vote or own real property in the state. They must each have as patron some citizens to stand as surety for their good behaviour. They had to pay a direct metic tax of 12 drachmas for each man, 6 drachmas for each unmarried woman. In other respects they were on a footing of equality with citizens, serving the city state in its wars and taking part in all public religious festivals."[5] The Arab *Mawali*, especially the Meccan ones, were less harshly treated. There were no taxes imposed upon them. They enjoyed with their patrons all the civil rights

1. Memorial de Saint Helene, III, 183. 2. See *supra*, introduction.
3. Encyclopaedia of Social Sciences, I, Introduction; cb. also F. Roth, Ueber Sinn und Gebrauch des Wortes Barbar (Nuremberg, 1814).
4. Halliday, p. 1124.
5. Encyclopaedia of Social Sciences, Introduction of. The City State domination.

(the client and the patron both being alike termed *mawla*) with this obvious limitation that a client could contract no new foreign client of his own. He became a full member of the family of his patron and exercised all the privileges of an original tribesman with the exception, however, that he should not accord protection or asylum to a foreigner without the concurrence and assent of his patron.[1] In fact the Arabs were bent upon Arabicisation,[2] whereas the Greeks were told by their philosophers that Nature intended the foreigners to be the slaves of the Greeks[3]. And again in Greece:—

> "The members of a political group were united primarily by a common ancestry and a common religion. Society was organized in 'phratriae' or brotherhoods, that is, in groups of related families, and these 'brotherhoods' were in turn united by a supposed common ancestry in a larger group called 'phyle' or tribe. The bond of blood was reinforced by the bond of religion."[4]

The internal organisation of Meccans, was much more elaborate and complex, owing to the unusual importance attached to geneology in their life. There were *arifs* or the leaders of ten persons (cf. Decurtion) and the *qa'ids* are said to command groups of a hundred (cf. Centurion). Then there were the subdivisions of *qabilh, btn, fakhidh, sha'b,* etc. described in detail among others by Wuestenfeld in the preface of his 'Register' of the 'Geneologische Tabellen', on the authority of Arab authors.

The pre-Islamic Meccans lacked a common religion believed in by all the populace and they lacked a sacred Book or written code of law to be observed by all. Among the Meccans

1. Ibn Hisham, p. 251: Tabariy, p. 1203.
2. For details see Hamidullah, *La Diplomatii musulmane*, I, 74.
3. Aristotle, *Poitics*, 1, 2, 6, quoted by Lawrence in *Principles of Internationa Law.*
4. Halliday, pp. 1108–9.

there were pagan idolators, polytheists, associators, atheists and even animists and materialists besides those who had embraced Magism, Judaism and Christianity. Nevertheless the average citizen had reached the stage of believing one, common, supreme god over and above all the petty tribal deities and they called Him Allah. Their political consciousness too had developed so much that the interest of the state was everywhere the supreme consideration. So, when the Meccans were unexpectedly beaten in the battle of Badr, they subscribed to the war-fund the whole of the profits of the caravan just returned under Abu Sufyan from Syria.[1] The Meccans used to send their newborn children to Sahara or desert habitations of bedouin-women. Brought up in the pure and simple village life they combined many a virtue of the bedouin and none of the vices of the metropolitan life. The Prophet himself had spent several of his early years in the same manner. I may refer you here to the social laws of Lycurgus, which though barbarous. aimed at the physical and mental training of the younger generations of the Spartans in Greece.

The Greek nature was characterised by love of knowledge, as a contrast to, for example, the love of wealth attributed to Phoenicians (including Jews) and Egyptians. The Quraishite Meccans may be said to be distinguished by their love of arts and letters. It was this love of art which probably induced 'Utbah ibn Rabi'ah ibn 'Abdshams to build a crystal palace (Dar-al-Qawarir) in Mecca[2]. They felt so much at home in the poetry that the very terms *bait, misra, asbab, awtad, fawasil* as much mean a tent and its parts as a couplet and its constituent elements. The object and end of the Greek philosophers was the good life[3]. One is tempted to quote here in the end the famous Quranic verses

1. Ibn Hisham, p. 555: Ibn Sa'd, 2 1, p. 25ff.
2. Baladhuriy, *Futuh* (ed. Egypt), pp. 63, 64.
3. *Politics*, 1, 2, 3.

in which the end of human life according to the pagans and the Muslims has so vividly been described :—

> "There are some men who say, O Lord give us good in this world; but such shall have no portion in the next world. And there are others who say, O Lord, give good in this world and also good in the next world and deliver us from the torment of the Fire. They shall have a portion of that which they have gained: God is swift in taking an account".[1]

P. S. In the chapter on military organisation, the office of the *Gratuity of Mobilisation* was mentioned. Although our only source of information, Ibn 'Abd Rabbihi explains it to mean a razzia-leader, yet that is not very convincing, Personally I am tempted to understand thereby the post of Recruiting Officer. So, whenever an expedition was organised, it was permissible for the citizens of Mecca not personally to take part but to send instead someone and to provide for his services. For instance, Abu-Lahab did not go in the battle of Badr in the time of the Prophet and hired services of some foreign mercenary who joined colours. The Recruiting Officer had to see that all those who were liable to military service took part in the razzia or at least provided for a substitute. Any differences between the hirer and the hired were settled by this officer.

This is my personal impression for which no authority can at present be cited.

1. Quran, 2: 200-2.

IF WISHES WERE HAIR-TONIC BOTTLES—

It was a glorious winter afternoon. In parks and gardens the floral tribe smiled welcome. Wherever one turned his head he found beautiful, smiling flowers and green verdure. Green was the dominating colour in the garb of nature. Indeed it was a pleasent sight. But alas! the beauty of nature did not tempt me as I hurriedly bent my way to Alexander Street on a pressing errand of my father.

I was destined to meet a human oddity viz., Mr. Munnuswamy Chetty. He was round and blobby. He was a stocky man with a round, solid head, small eyes and an undershot jaw. His greatest peculiarity was his nose, an important organ which ill-treatment had reduced to a mere scenario. A narrow drip of forehead acted as a kind of buffer state, separatin his front hair from his eye-brows.

Mr. Chetty forcibly reminded me of Mr. Pickwick—my school days' favourite character. Chetty did represent Charles Dickens' famous hero in a life-like manner. He had the same short, stout figure and genial nature so frequently associated with Pickwick. To complete the resemblance Mr. Chetty would survey the outside world thro ugh steel-rimmed glass in a truly Pickwickian manner. But try as he might, he could not command the same respectful attention, especially from the members of his household, which was spontaneously Pickwick's from whomsoever he met. Mrs. Chetty and her children treated Munnuswamy with even less regard than they would a well-used stick of furniture ; a treatment with which Chetty never reconciled himself. Such an attitude Chetty stoutly refused to countenance in the members of his family. Oft-times he tried to meet his wife's eye mutinously; but failed. He realized the

stark injustice of his spouse and children. It was a poor consolation that dame-fortune was not kind to him. He had no wish to play the part of a martyr. At the same time he could not muster enough guts to burn the boat and divorce his wife once for all. Undoubtedly she was not a person to be trifled with. She was a large woman, with a swash-buckling sort of mouth. She was the type of woman whom small, diffident men seem to marry instinctively, as unable to help themselves as cockleshell boats sucked into a mael-storm. In the corners of her mouth there lurked wit and humour; but alas ! this seldom found any outlet. At the same time she was capable of turning a bully at a moment's notice and this, she frequently did, to Mr. Munnuswamy's great petrifaction.

The Chettys had, on that very day, shifted to a new house in Alexander Street; a quiet corner in the suburbs. But the place gave the lie to my snug opinion. Actually I found the atmosphere surcharged with feverished activity and it seemed more a hive of the diligent bees than a dwelling plaee of human beings. 'This is no devils' workshop'; I mused.

On glancing through the half-open front door, truth came to light. In a corner sat the khader - clad, bespectacled twentieth century Indian Pickwick with a scowl on his amiable face. He was aimlessly fidgetting with his spectacles, and this spoke volumes to the knowing. There was no laughter in his fixed gaze as he looked peevishly at a badly lit corner of the room. It seemed as though he was in sulks—and in real earnest too. None of your half-hearted frowns but a full-fledged rage shone on his round face. This was a new aspect of Munnuswamy with which I was not acquainted. This did not dishearten me. 'Live and learn' is my motto. Following his gaze to a dimly lit corner of the room, I saw a sight which froze the cheery greeting on my iips. Only a guttural sound issued from my lips. In that corner, half-shrouded in darkness

stood Mrs. Chetty with her dark silken hair falling in profusion on her pretty shoulders. It set her aggressively handsome face becomingly. Yet I had no eye for her beauty. With protruding chin and pursed lips she was waving a useful-looking broomstick at her husband. In that shaded light she looked every inch an 'Amazon'' Everything about her was formidable.

Poor Mr. Munnuswamy ! He was caught in a nice trap. He contemplated the wifely demonstrations with growing uneasiness. He was as desperate as a cornered rat. Even in his unenviable frame of maid he was conscious of the beauty of his wife. He wondered how any other man would have 'tamed the shrew'. But that was not a moment of quiet meditation. Even then it might be too late. With the coming of this knowledge his eyes shifted to the precariously held broomstick. In her excitement Mrs. Chetty was carelessly wielding the dangerous looking weapon of feminine warfare; and he contemplated with horror the possibility of the missile descending upon his bald head. It wus a particularly tempting proposition and in all probability, Mrs. Chetty might succumb to it.

Certainly the prospects were not rosy. In his misery he remembered with a pang of remose, that in the not so very remote past he had rejected with contempt the good offices of a hair-tonic agent, who had guaranteed for the paltry sum of ten rupees, to transform his shining scalp to the hairy head of a gorilla. This impossible looking feat was to be accomplished within a month. That son of a satan had also confidently predicted that even his dear wife would not be able to recognize him. He was particulary enamoured by the latter prospect, but resented on principle, the imperious tone of the arch-enemy of shining scalps. Everybody seemed to be so cock-sure in his presence and this irritated him not a little. Consequently the champion of the cause of 'Grow Hair' campaign had to scramble through the front door in a rather dishevelled

fashion inconsistent with the dignity of his profession, with the ample frame of the outraged Munnuswamy looming threateningly large on the threshold. It was the last scene of the buried past.

Alas! if wishes were hair-tonic bottles...........crash! The missile had missed his invitingly shining scalp by a narrow margin, and had crashed in a nearby tea-tray, bringing the contents to the ground with a resounding noise. Beads of perspiration stood on his brow. He tenderly felt the part of the body under consideration to reassure himself. Even in his misery he acutely felt the injustice of the whole thing. The Almighty God had given the Orang-outang and the sly fox thick hair and plenty of fur as a protective coating against the vagaries of the elements. Even birds had their warm, multi-coloured plumages for the same reason. Could anything be more dangerous than this woman? Yet the same all-knowing God had in his wisdom, completely forgotten to arm him with this doubtful armour. It was a consoling thought that no good resulted from crying over split milk.

Meanwhile the missile was soaring above his head in a truly alarming manner. He must do something. But, alas! nature had made him essentially a passive organism. It was another irrevocable blunder of the omnipotent Providence! He went a step further than the mild doctrine of 'Leissez faire' in domestic matters. 'Do not trouble trouble till trouble troubles you', advises the tongue-twisting maxim. He acted up to it but the result was not gratifying. He had strictly left trouble to itself, but the latter, probably finding its own company not entertaining, tried to make a closer aquaintance of him. To pick up the 'slings and arrows of outrageous fortune' and fling them back was not a habit of his. So shielding his head with one hand he did what was best under the cirumstances. He scratched his chin and said nothing. He went on saying nothing.

But our milady was cast in a different mould altogether. She was made of more explosive stuff. She 'volleyed and thundered' at everything and everybody. At her clarion call the frightened underlings flew pell-mell to nooks and corners of safety. So great was their fright at seeing this feminine volcano burst forth, that they whizzed off to places of refuge behind comfortable looking sofas and chairs, like jack rabbits with an alacrity pleasing to the critical eye of an air-raid warden, who sees his men smartly doing their bit when the alarum sounds. She was roundly scolding, mind you, in none of your demure, feminine voice these human scare-crows at their laziness, slovenliness and utter incapability to form the executive arm of the 'petticoat government'. It was not a luke-warm government. The vigour and strength with which she carried on her programme would put to shame even a veteran like 'Ll.G.' Under her auspices a great crusade was launched against uncleanliness and every member of the family came under the magic spell, except, of course, the incorrigible Munnuswamy. Her enthusiasm was devastatingly infectious and dangerous. Indeed for Ramaswamy and Urmila, the rebellious children of Munnuswamy, it was a divine opportunity to show their mettle. Like every great leader in a crisis they rose to the occasion. The adept manner with which Urmila brandished the broom (after the manner of dear 'mum') and her equally enterprising brother hammered at the mahagony accompanied to the tune of falling china and breaking crockery was sufficiently eloquent proof of the grim earnestness with which they set out to do a thing. The din they made spoke more of an armament factory in full swing than the freaks and pranks of little kids engaged in lightening mum's hands. Even the children were appalled at the work.

To put it in black and white this has taken a goodly amount of space and time. But actually I saw, heard and felt all this in a few seconds. Experience had taught me the futility of

intruding on such domestic give-and-takes. I made up my mind to follow the dictates of wisdom and prudence. For once I decided to be one of those wise, detached guys, known to the world by the high-sounding title of special correspondents, who are always on the spot after an accident to give a wrong version of the incident to their boss. Consequently they poćket a few shining chips as a fitting recompense for their services and incidentally save their precious hides. With one stone these wise ones kill two birds.

By reading the above lines, I think that the reader must have rightly come to the conclusion that I had no desire to play the part of either a belligerent or a peace-maker. Even as it was, a true non-combatant, a term very much in vogue nowadays, my position was extremely precarious. Neither the broom-stick nor the hand which wielded it so expertly, was any respecter of the neutrality of non-belligerents. It might break the neutrality and incidentally my head at any moment in a truly Hitlerite fashion. The situation was not at all exhilarating and only a wet cat in a strange back-yard bears itself with less jauntiness than a man faced by such a prospect. I would cheerfully have given anything to have been elsewhere at that moment. Possibly it was not yet too late. Prudence came at the eleventh hour and I decided to beat a hasty, unobtrusive retreat through the invitingly open door. Unfortunately in the process of withdrawal I made an unwarranted noise. This created the same effect as the presence of an elephant in a china-shop. It broke down the magic spell. It arrested the motion of the boomerang and switched on all eyes upon me—those of Mrs. Chetty inquiringly. I felt as miserable as an opium eater in a tub-full of ice-cold water. I could not even utter my excuses to the mistress of the house.Even had I tried, I don't think I would have succeeded in my attempt.This little noise had also the gratifying effect of goading Munnuswamy to activity. He had no time to thank me but his eyes spoke

eloquently of his inner feelings. Firmly seizing my hand he dragged me upstairs to the library. In our ignominious retreat I forgot to pick up my hat, which I had dropped in my amazement at seeing the terrifying vision of Mrs. Chetty, and Munnuswamy was separated from the inseparable snuff-box. On the whole we had ample reasons for self-approbation. But for a few casualties, I think our retreat was no whit less successful than the famous, history-making evacuation of the B. E. F. from Dunkirk. No wonder we indulged in self-congratulation.

As soon as we entered the library, Munnuswamy bolted the door. This seemed to be a precautionary measure absolutely essential under the circumstances. Strangely enough my companion had not uttered a single word till then. At last he did open his mouth to speak. Munnuswamy, the human opossum, came to life. He had contrived to create about himself such a defensive atmosphere of non-exsitence that now when he spoke it was as if a corpse had popped out of its tomb like a Jack-in-the-box. He was profuse in his apologies and explanations. From his distorted utterances I gathered that the scene I had seen was not a family melee. It was not even a domestic give-and-take. From his remarks I came to the conclusion that the above-said activity was the direct outcome of Chetty's change of residence.

A little beginning of a big thing. What with change of furniture, the call of visitors, for some persons did insist on calling, I being a typical example; and the other one-and-thousand things; Mrs. Chetty and her obedient children had their hands full. A little dusting and cleansing was certainly not out of place. But Munnuswamy held a different opinion. In fact the only person who did not look at the feverish activity of Mrs. Chetty and her brood with an apprising eye was this nominal head of the family. To be candid, he preferred to live in a dustbin than be a martyr to

these sufferings. A profound scholar of the classics, he was reminded of the epic battle of the Kauravas and the Pandavas and in passing, hissed forth a passionate prayer that in the future cycles of Karma for the atonement of his sins; Rama will send him to a quieter nook than his present dwelling place. I sympathetically endorsed the point.

In the midst of our smooth conversation there was a discreet knock on the door. This had the magic effect of re-transporting Munnu the human being to Munnu the human opossum. Imagine my astonishment at seeing the previous amazon completely changed to the characteristically attentive Hindu hostess' smiling welcome. Even her smile had a caustic look and this was not inducive to making me at home. In her wake trooped master and Miss Chetty with a chorus of 'How do you do'? This sudden onslaught of the formalities of polite society took me by surprise, but regaining my composure, I thanked them for the kind enquiries and reciprocated the good wishes. This brought on me another hail-storm of, 'We are hale and hearty, thank you'. In their readiness to show me the excellence of their health they promptly proposed to lunch and very cordially invited me.

The proposition set me furiously thinking. The last few moments were not exactly pleasant for me, and I badly needed a strong pick-me-up. Surely a morsel or two of something really nice washed by a cup or two of coffee would do me no harm. On the contrary it would certainly serve as a strong restorative. Further retrospects were unnecessary. A gnawing sensation in the region of the waistcoat answered the question. I was feeling hungry.

On glancing at Munnuswany I instinctively knew that he was passing through a similar experience. Could he eat after the past experience? No, he couldn't. His pride revolted at that solution. At the same time he had to save his 'face'.

A decent interval among the husks and swine was essential. Again the tempter came in the guise of appetising aromas which made his nostrils twitch. He pluckily fought the devil as he unconsciously rubbed his expansive stomach, whose urgent rumblings would not be stilled. Why, he argued with himself, unconsciously giving way to the tempter, should he bear the sight, and more so the smell of the food at which his mouth watered; while his stomach grumbled and growled incessantly with indignation that it should be left empty when it might be so easily and deliciously filled. Yes, why indeed; finally, he succumbed to the tempter in good grace. He was dignified even in defeat.

That happily settled the matter for all of us. So with a gusto we sat down for the excellent luncheon. I was dealing strenuously with 'bhajiturkari' while my stout host, grimly silent, surrounded himself with 'dal bhat' in the forthright manner of a starving python. As for Mrs. Chetty, she was prattling unconcernedly with her equally voluble children.

I soon found that Mr. and Mrs. Chetty with all their divergent characteristics had one point in common viz, a sweet tooth. Presently I made another discovery that the ice between them was not broken; and it was extremely difficult for me to steer clear of the not so very old domestic upheaval. So we fell back to 'weather' and the marriage of Usha, Chetty's neighbour's daughter. From weather to politics was but a step, and before we had half-gone through the meal we found ourselves pleasantly entangled in a political cob-web. Of course we could not in all decency discuss international crisis without even a passing glance at our home politics. It was simply a perfidy in thought.

Within five minutes of realisation of our moral duty to our motherland we laid thread-bare every political organisation worth its name. Neither the League nor the Congress was safe under our handling. Then we proceeded triumphantly to

make a short work of the 'Mahasabites' and 'Khaksars.' Poor devils! We certainly kicked them high and dry on the shores of oblivion. Then the remaining 'All India' organisations were made the butt of our criticism. The Leftists, the Rightists, the Ghandites, the Royists, the Communists and Socialists, everyone of them, separately and collectively got their share of kicks. It was a warm work. This forced Mr. Chetty, the junior to come out with the solution that the future of India lay in the entire westernisation of Hind. He certainly erred on the side of enthusiasm but ere long he had to pay dearly for his volubility.

For the most part the talking was done by Mrs. Chetty and her children. Mr. Munnuswamy kept his own counsel and I could with great difficulty stiffle may yawns. Soon I was all eyes and ears as a bump on the table made me look up with a jerk. With a snort Munnuswamy emerged from cerements in which he had voluntarily buried himself. He was glowering at his imprudent son and chattering wife in a highly belligerent manner.

Mr. Munnuswamy Chetty was a nationalist of no luke-warm order, and the last remark of his hot headed son had touched him to the quick. His capacity for absorbing truths, half-truths and downright falsehoods about his country was exhausted. He could no longer control his rising anger. So he explosively gave vent to the lurking patriot in him.

Sunday pants of Holy Moses! The sight before us was astoundingly absurd enough to justify such an exclamation. A human bespectacled mouse had jumped over a chair and instead of meakly squeaking was dangerously growelling crash! The dish of 'dall' split its contents on the silk sari of Mrs. Chetty and her husband did not even condescend to turn his head. This was rich! This was a comedy of high order!

Addressing or rather thundering at his ignorant son, he roared, "Eh, you, the apostle of westeren customs and ideas, listen. Do you know what you are doing. Simply selling your country and its greatest heritage, culture and civilization. Look what you have done to your country by your unpatriotic gestures. You have encouraged the foreigner and now he is laying seige to your culture and civilization. Yet you have the audacity to talk to me about the virtues of the west. Go and pour your venom into some uncultured ear. Do not try to land it on me. This westernisation stuff is over-rated. I care a pin for it. I am a person of intellect and imagination and I shall not stand this westernisation non-sense in my home." He pulled himself up in a self-righteous way and his warth was positively awe-inspiring. He continued with even greater vigour, "I have no faith in the decadent society of the west nor have I any respect for those Indians who slavishly take to western customs and ideas. I believe that the salvation of India lies in the reversion of meantal outlook. Back to Indian India of Kalidasa's time," he roared and his eyes glowed with reminiscent fire. To emphasise his point he landed a well-aimed thump on the small-of-back of his erring son, sending that gentleman howling to the back-yard. This had the desired effect on the members of his household who listened to him with greater respect.

He poo-poohed westernism in a masterly fashion and went on roundly condemning anything and everything which had not the authentic stamp of Indianism upon it. He illustrated his point by an example. He showed us the universal usage of the evil sounding epithets Mister and Miss with the name of Indians, great or small, depending upon their sex. He particularly blamed the British government for the introduction of these hateful words. Loud was he in his protestations against this further inroads of the Britishers into the cultural aspects of Hinduism. 'Sir' was not so bad but a mere 'Mister' was poison to his culture-conscious, sensitive soul. Darn it, 'Sri'

sounded far sweeter, homlier and more in company with the Renaissance of India than this jarring unmusical 'Mister.' Further 'Sri' was the outcome of a reshuffle of the alphabets comprising 'Sir'—thus combining in one the quiet dignity of British Knighthood with the all-permeating, democratic spirit of a great, freedom-aspiring people waiting with folded hands and a grin from ear to ear for the ruling nation to grant them independence to be quietly put aside by any power which takes the trouble to come over to this haven of rest – consequently enjoying peace and prosperity for say, another three hundread years. How could anyone accept to be reminded the cultural grounds India is losing before the onslaught of the West by the sound of this unmusical, semi-guttural, occidental term 'Mister'; without even resorting to hartal or a satyagraha, was beyond his comprehsion.

Then he descended like an avalanche on the fair-sex. Men were men but how about the fair-sex. Mrs. Chetty by her numerous activities had convinced Mr. Chetty, within three months of married life, about the martial qualities and superiority of the weak sex. In his heart of hearts he considered 'weak sex' a misnomer. He had a great faith (again an unconscious triumph of Mrs. Chetty) in the good sense of women. He could understand mere men consenting to be 'Misterised', but the very idea of women belonging to the same species as the greatly loved and a little terrifying wife of the speaker—quietly accepting the annoying prefixes Miss & Mrs. made him sick with disgust. Imagine a girl, that too a modern one, giving her modest consent to be 'Missed' like a member of the vain-glorious male sex meekly agreeing to add the evil-sounding prefix Mister to his name. In defending the cause of 'Sri' and 'Shrimati' he argued like a Demosthenes or a Cicero or a combination of the both and wound up his harangue with the irrefutable argument—it is better to be 'Shrimatised' than 'Missed'! As he had anticipated the shot silenced the enemy's

battery. Even Mrs. Chetty, who had, incidentally, never missed any opportunity to enjoy to the full life's good things, either in her pre-nuptial or post-marriage days; was overpowered by the subtlety of the argument and cowed down by the force of logic. She readily recognised her master in Munnuswamy.

Munnusway delivered his peroration with the same effect as a fire-eating magician accomplishes his feat. He spoke with aspirity. His remarks cut through and through. It had the greatest possible effect on Mrs. Chetty. She was staring blankly at her erst while domesticated husband. She had never seen him like this before. It was as if a rabbit had turned and growled at her. Munnuswamy looked like an undersized lion, as he faced his wife. He determined to face and outface his spouse. He fumed and bristled. The recollection of his past trials came to strengthen his determination. To cemplete the *coup d'etat* he required a scape-goat. His erring son served that purpose very well.

'Take that boy to his lessons. Feed him on Ramayana and Mahabharatta,' snarled Mr. Munnuswamy.

Mrs. Munnuswamy Chety was not a coward, but this was a veritable bolt from the blue. In all her married life she had not known what fear was. She had stood her ground against big, square-shouldered, square-jawed, whiskered gentlemen at her father's shop and as for the mild Munnu she trampled on him. Further she was not a Jany-who-is-brainy. Plain daughter of plain merchant she was rushed off her feet by this little man's harangue; the man she had despised and made no secret of it. But now he loomed large in her imagination. She admired his intellect and adored the cave-man in him. This cave-man whom she had married, under the impression that he was a gentle domestic pet, had taken all the spirit out of her. She felt weak and remorseful.

A low, rumbling sound cut short her retrospects. This was a final order for her to clear out. Even the idea to disobey did not enter her mind. The past experience had robbed the pith out of her. As she hastily collected the repentent culprit in record timing, usually a long process, and shepherded him to his new prison of classics, she made a secret vow to the Goddess of Love that in future she would try to be worthy of her husband.

Her departure left a big void in that small room. I had not yet recovered from the stunning effect of this miracle. I had seen the under dog's snarl. Now it was the calm after the storm.

Suddenly there was a rush and a scurry in the corridors of my brain as about half a dozen thoughts tried to squash simultaneously into that main chamber where there is room for only one at a time. Why was I there ? What had I done ? My brain was gradually becoming clearer at every moment. Presently I understood why I was there and beads of perspiration stood upon my brow. I felt giddy. Slowly things began to shape in my mind. It was a Friday and I hurriedly glanced at the calendar for reassurement. Yes, unfortunately it was, and as such a holiday. Till now no blemish could fall upon my superb analytical talents. But a holiday is not such a pleasant thing, specially when our parents are faddy. As an illustration look at mine. My parents were found of entertaining people. Could anyone imagine where that harmless fad had landed me. I was there to ask the Chettys to lunch. Instead of that what had I done ? Took my grub like a shameless cad and attended a thrilling human drama scot-free. Yet human nature is such that I felt no pang of remorse at my unconscions disobedience of parental commands. I anticipated the coming parental storm with equanimity. I felt an uncalled-for confidence in my ability to cope with it on my return to the roost. D—it, miracles do not happen daily.

You do not come across them at every street corner as you would a barber's shop, or a doctor's dispensary or a High-Court Vakil's office. I, a man who had never been able to bring myself to believe in miracles, revised the views of a life-time. I was an eye-witness to the real stuff. A cornered rat had hit back.

F'RUZ MEHTA, B. Sc., (Alig.)
LL. B. (Previous).

HALF - PAST TEN: MY BLUE (Sherwani)

Trrrr......Trrrr........

Shhhh....what is it that disturbs my peaceful sleep? Oh yes, it is my time-piece giving the clarion call to me to wake up. Well, my dear Ben, whether you are big or small, I am not prepared to welcome you now. So down goes my hand and he stops with a reluctance, as if to say, "All my effort has been a waste." Yes, but you are my slave and it is left to me either to listen to you or not.

Well, off you go to sleep again. Six....Seven....Eight.... Half-past Eight! Do I feel like getting up? My resolution to wake up early has remained only a resolution. Even the Alarum hasn't succeeded in getting me out of bed. To-morrow I must surely do it, and certainly I will. I am resolved.

So to-day is Wednesday. Two long days before Friday! Anyway the first period to-day is to be engaged by Prof: Courteous. But he wants us to be very punctual. Too formal, I suppose. Doesn't like the tea to get cold.

I must hurry up. Off I am from my bed and in a moment smashing things in the kitchen. Good Lord, how time flies! Past the Ten! Yet it looked like a few minutes only. Well, here I am before my table. The books have been arranged.

But where is my Blue? I am not sure whether I left it in my wardrobe yesterday, or put it beneath the bed, which, incidentally serves the purpose of a press for me. After all I have only one sherwani. Why stitch more? We have to be very economical these days. Further the brand cannot be used outside the College unless one wishes to be dubbed as a Papad cap-a-pie all the 24 hours.

Well, it is not in the wardrobe. Roll up the bed and see. Yes it is here. Twing! There the Clock indicates half past ten. What a silly boy am I? No value of time.

I rush out buttoning my sherwani on the road, to catch the ponderous giant in green. But ah! me! It is loaded up to the footboard and the jovial crowd passes past me with a hearty cheer, leaving me behind.

Now I stand up to my full stature. I need not be ashamed of going late to the class. Here is a bus-load (maximum of course) going late ; and late whether by a minute, or by half an hour, is in essence the same. Further if the bus is not prepared to accept even a lean chap like me, I really can't help it.

So I wait and wait. But no sign of the green monster. Look north, or south, or east or west; sweep the horizon with your hand shaded before your eyes, but nowhere is it to be seen. Meanwhile, why not look at the passing array of cars? I may have the good fortune of seeing a beaming face peeping through the folds of a purdah.

At last here it comes—the green monster. Is it also going to leave me behind? No; since it is the last bus for the up-journey to-day, it is prepared to take in any number. If it is not able to carry such a large number, why, all the better for the driver. Osmanias are too well known for their chivalrous nature and sportsmanlike spirit. Out of the two hands of every man in blue', one will easily push it up the 'Varsity'.

Luckily the bus seemed to take pity on us and carried us to our destination "at a walking pace". But what is it O'clock? A quarter past eleven. Five more minutes for the period to end. But I walk triumphantly into my class. Well Prof: Courteous, I am sure you will send for some hot tea. But first mark my attendance please. With a smile on his countenance,

he replies, "I am very glad that you have come." What a compliment! To go late and still be welcome.

What a pleasure to spend my probationary period of life in the midst of such a jovial folk. May these be repeated every day. Amen.

P. PRABHAKAR RAO,
LL. B. (Previous).

TEARS SPEAK THEIR INNOCENCE

Those were the happy summerdays—bright and cheerful and the chief justice of the City High Court was seated on a bench in his garden. Sweet was the time and lonely was the place. The evening sun was sinking far away behind the dark mountains and its pale light-red rays were playing on the ever restless waves of the Atlantic. There was life but gloomy and a happiness that was already faint.

The judge had a peaceful evening to spend—a pleasant time to pass—but ah! he had no peace of mind. His bright face gradually grew pale like the yellow rays of the sun and his mind was as much worried and as restless as the waters of the great ocean in front of him. The sequence of thoughts, their juxtaposition, the conflict of evidences could be read in the lines of his face. This was because of the case of a young widow of eighteen who was charged with the murder of her husband. The age of the girl, her lovely appearance and her charming beauty could never prove that she was guilty. The hands of a murderer can never be so smooth, can never be so handsome. Though a connoisseur, he could not diagnose this case.

The charges laid against her were as clear as the shining bright stars in a dark clear night. The jury had opined that she was guilty and the young lady had no answer to give to this accusation. To every question put to her by the court her answer had silence. She could only say "I am innocent." The judge moved his pen to write down the decision against her and sentence her to death, but he found that he was doing an act of injustice. The decision was postponed to the next day.

Two consecutive hard days were spent but he could not decide. Every evening he was of the opinion that she was guilty and every morning in the court before her, he found that he could not solve the riddle. His heart was beating with these words "This is not justice—she is innocent" and he dismissed the court for the third day's final decision.

The audience felt that she was guilty, the jury proved that she was guilty and the judge himself decided in his conscience that she was guilty yet the court was prorogued. He could not arrive at a decision. Every one was in a state of wonder. The judge himself was in a dilemma.

This last night he sent for the lady that she may speak of her innocence at least in secrecy.

The moon shone brightly over the restless waves of the ocean and on one side of the shore were seated two silent souls. They knew not how to break the ice.

Again and again the young judge asked her to explain her case, but her only answer was silence. Her eyes were lifted once again and they rested on his face and then gently the lids dropped down. The judge found that she would not speak, but he could read, innocence, helplessness and modesty in her eyes. He found that his own heart pulsated with sorrowful emotions. He felt some burning sensation in his heart. He looked at her face, once again with trembling eyes and she looked in his.

There was a grave silence—a silence which was to decide the destiny of a human being. There was a tug-of-war between death and life; and one of the two was to be conquered.

There was a light breeze which blew off the judge's thought from his mind—a decision dawned upon his mind. It was a revelation. He wanted to gather his ideas, but he could not.

Slowly was the moon sailing high above over the clouds. At times there was darkness and at times there was light again. The storm was blown off. The fair maiden was seated silently on the sand.

To the judge's continuous request she could only say "I am innocent." She looked again in his eyes with the same innocent looks. But this time her eyes were wet and two pearly tears slowly dropped down her rosy cheeks—she could say no more.

The next morning there was the final decision. There was a large gathering. The judge entered the court-chamber. This time his face was more worried, more sad and more nervous than on any other previous day. The audience expected a judgement against her. The jury was sure that the judge would speak against her—the maiden knew that she would be sentenced to death.

The decision was read—it was in favour of the girl—she was exonerated. The wonder of the audience was great.

But the same evening it was heard that the judge had committed suicide—the wonder of the audience was still greater.

S. AHMED HUSSAIN,
Junior Intermedite,
Osmanai University.

LORD BASAVA OF KALYAN

(A Prophet and Path-Finder)

"Can we say that the elephant is huge
and the goad that controlleth it is small?
Can we say that the mountain is big
and the diamond that breaketh it is small?
Can we say that the darkness is impenetrable
and the light of knowledge which vanisheth it is small?
Can we say that the forgetfulness is deep
and the mind that remembereth is small?
We cannot, O! Lord Kudal Sangama, we cannot."

—LORD BASAVA.

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

The thought that the dominions of our benevolent Ruler—H.E.H. the Nizam of Hyderabad and Berar—have been the cradle of ancient Indian culture, fills my heart with pride and exhilaration. Mighty empires, including the famous Lingayat empire of the Kakatiya dynasty of Warangal, (see "History of Telugu Literature" by Raja M. Bhujanga Rao) sprang out of this sacred soil, and world-renowned buildings of marvellous architectural beauty and grandeur, including the Ellora temples, Ajanta caves and the thousand-pillared temple, were built, and amazingly rich, varied and precious literatures were produced in Kannada, Telugu, Marathi and Urdu.

It was here that Kannada literature was fostered and nourished in its infant years, under the patronage of different Kannada rulers, the most out-standing of them being Nripatunga of the Rastrakuta dynasty of Manya Kheta (now Malkhed). His Kaviraja-Marga written in the 9th century is the first book written in Kannada. And it was here that the great

Lingayat religion was revived, rejuvenated, reconstructed on sound and solid social structure and popularized throughout India by Lord Basava.

Lord Basava, the great Lingayat reformer and Prophet who stands on that highest plane of spiritual greatness, where the Prophets of the universe Krishna, Christ, Mahammod and Buddha stand, rose to eminence in the 12th century, as a minister to King Bijjala of the Kalachurya, dynasty, that ruled in Kalyan which, too, is in our state.

Almost all great prophets and reformers came to the world with all their grace and greatness, when the world was desperately in need of their arrival to lift it up from sinking into the darkness of demoralization and socio-religious degradation. Basava was also born at a time when India was in the melting pot. Bijjala had ascended the throne of the Chalukyan rulers, by rebelliously overthrowing the weak and powerless King, Jailap, to whom he owed his allegiance as a general and this rebellion had caused far reaching political unrest in the country. Then there was the religious chaos and social anarchy. The Muslim invasions in the north had driven the Shaiva Saints of Kashmir—of the Pashupata, Qakuleesha and Kalamukha schools—to the south and they were preaching their own religion and philosophy everywhere. The great teacher—Ramanuja who fled away from the capital of the Shaivist Chola King, found an asylum in the court of Vishunvardhana and founded his Sri-Vaisnavism in that part of the country which is now in the Mysore Province. Caste-system had attained unprecendented power and rigidity, and held its stern sway over the Hindus. Real religious principles were cast aside and completely forgotten and in their stead ceremonial customs, ritualistic performances, sacrificialism and blind superstitions reigned supreme. The social structure, based on the caste-system, was exploited by the privileged few of the higher-castes, to streng-

then their own position, to gain their own selfish interests, and keep the reins of society in their own hands—consequently enioying the free services of the lower castes, with all the rudeness and pride of their privileged birth; while no room was left to the tyrannised, victimized, enslaved and down-trodden members of the lower castes for the growth of their latent faculties, for the unfoldment of their powers of head and heart and for the attainment of spiritual knowledge and glory through the study and practice of the scriptures. In the silent moaning and bewailment of the dumb millions of the oppressed and depressed classes, one could hear the echo of a melancholy prayer to God—which came unbidden and automatically to their lips in an outburst of intense sorrow—to send a saviour for the emancipation of their sufferings, for the redressing of their grievances, and for the upliftment of the fallen millions. This prayer was heard and Basava—the friend and father of the fallen millions—came to the world, as a dazzling light, bursting forth from amidst the dark clouds of tyranny, grief, degradation, socio-politico-economic deterioration, moral bankruptcy, atrocities misinterpretation and mis-representation of religious tenets and principles, and a steady growth of destructive, evil forces that were eating into the very vitals of the country—that had clustered on the horizon of the Hindu society.

II

Basava was born at Bagewadi, in the Biiapur district in an Aradhy family. His father, Madarasa, was the chief of Bagewadi and his mother, Madalambika, was an extremely God-fearing chaste lady who, having no children for a long time, worshipped Nandinath of her town and gave birth to Basava, through the blessing of the Deity. Even now, many mythologists among the Lingayats hold the view that Basava is 'Dwiteeya Sambhu' or the incarnation of Nandi—the vehicle of Shiva; and consequently many miraculous deeds are attri-

buted to Basava, both during his boyhood and his after life. But, as M. R. Murthy, the author of 'Bhakti Bhandari Basava' in Kanada writes: the orthodox Lingayats may regard Basava as the incarnation of Nandi; the rationalists among them, may regard him as a saint who, born a man, became one with the Almighty Power; but, as a reformer Basava's place is higher than this; as a servant and savant of humanity, it is higher still; and as a saint and devotee of God it is the highest. Basva belongs not merely to the Lingayats, not merely to Karnataka, not merely to India; but he is a prophet, with a mission and message universal, who belongs to all humanity, all the universe'.

Basavaraj became seven years old and his parents wished to perform his 'Upanayana' ceremony according to the Brahmin rites; but Basava, who had already embraced Veerashaivism or Lingayatism through the advice of his Guru, Gati Veda Muni, contradicted his parent's idea, explaining that he was not ready to forsake the religion of his heart—the religion that desired good to all mankind—for the sake of their religion of 'Karma' and sacrifices. A hot discussion followed between Basava and his father and finding his parents strictly adherents to orthodoxy. Basava abandoned his home, forsook his parents and, to the amazement and astonishment of all, went alone in search of Truth, accepted the descipleship of his Guru at Sangameshwar and began to study the Scriptures to find out a universal religion, based on equality to all beings, regardless of caste, colour, country sex and race. Wonderful! To forsake one's parents at the age of seven to find out a religion of liberation to ones fallen fellow beings, to find a remedy for the ills and wrongs of the world, and jump in the battle-field of the tumultuous world around all—alone and single-handed—is a feat of boldness and courage which is unparelleled in the history of the world!

At this time Baladeva, a minister to King Bijjala and the father-in-law of Basava, died and the question of appointing a new minister in his place seized the mind of Biijala. It was a question of immense magnitude. The overthrow of the Chalukyan dynasty had caused country-wide resentment and there was growing discontent among the people owing to religious conflicts and social intricacies and clashes. The fear of external aggression and internal discontent and disorder overshadowed the destiny of Bijjala's Kingdom; and after much consideration and consultation with his officers, he selected Basava as the successor to Baladeva. Basava was baffled and beruffled. Whether to accept office or not was a question which seemed almost unsolvable to him, and at last, after a great deal of persuation, he accepted the offer.

III

None can deny the fact that Basavaraj dischared all the duties of a minister and handled all the affairs af the State sagaciously and judiciously, with far-sightedness and statesmanship, in as much as there were neither external invasions nor internal conflicts during the Premiership. But Basava's life-work was not that of a premier, but it was that of a prophet. Simultaneously with the State affairs, he took up the cause of Lingayatism and began to propagate and popularise its tenets and principles—broad and all-embracing as they were—and flung its door open to all beings of all castes and creeds—high and low; touchable and untouchable. As soon as he lefted the banner of this new cosmopolitan, humanitarian and universal religion, countless helpless men of depressed and forsaken classess, trampled over by the insolent, arrogant pride of birth of the upper classes, found a message of hope and solace in the clarion call, and rushed in their tens of thousands to embrace this new faith. Basava's prophetic call caused a stormy convulsion in the country and a new rejuvenating torrentuous life-current ran the views of the decaying society. People awoke

from a slumber of centuries and were captivated by the message of this new catholic, cosmopolitan faith, and ran with maddening zeal and ardour to enlist themselves as servants of a humanitarian cause, under the banner of Basava. Basava's personal magnetism, ineffable love for mankind, his unspeakable compassion and sympathy for the poor and forsaken, his humility and unbounded devotion to God, his unimaginable spirit of service and above all, his message of universal brotherhood through a common faith, arrested the attention of all the thinking men of India and attracted the minds of the masses. People of different castes, from Brahmins to untouchables, and of all occupations, from Kings and ministers to shoe-makers came from Kashmir to Kanya Kumari (Ceylon) to offer their services to the great cause which Basava championed. Sakalesh Madarasa, a King, abdicated his throne and came as a humble servant of God from Kashmir; Adayya, a great merchant and millionare, came from Gujrat Sidha Ram Shivagogi came from Sholapur, Allama Prabhu from Banawasi, in Karnataka, Panditaradhya from Andhra Desha, and Akka Mahadevi from Udi Tode and thousands of others who came and assembled to-gether in Kalyan, then the greatest and richest city in South India.

Multitudes after multitudes of followers of his faith came every day to his door, with folded hands praying to elevate them, and Basava was never tired of welcoming them with incomparable courtesy and kindness. He named every new comer—of whatsoever faith he may belong to—with unwavering faith, a "Sharana" and sang thus:

As a child forlorn its mother seeks,
The deserted beast its herd,
I seek the coming of Thy Sharana, O Sangamesh.
Just as the lotus blooms at sun-rise
My heart leaps at the sight of 'Sharana',

And Further:

The white lotus blooms at sunrise
While the black one smiles at the moon;
Sight is life to the lover and loved
While the sight of 'Sharana' is life to me, O Sangamesh!

Basava never enquired what was the profession, caste and creed of the new comer, because he regarded caste distinction sheer nonsense and a heinous tendency, threatening the great ideals of equality and fraternity which alone can bring out world harmony and peace. This is his view regardindg castes :

He that Killeth is a 'madiga'—(untouchable)
He that eateth food forbidden is a 'Holiya'.
What is caste? what is there in caste ?
Those that wish good to all beings alike,
They are the pure devotees of Lord Sanagamesh—
Ye, They are the truly high-born!

Thuse, he shattered castes and shunned sacrificialism. Lo! an innocent goat is being carried away mercilessly to be sacrified in the name of Dharma—though only for the taste of the tongue. Basava's heart melts at the piteous sight of this helpless dumb creature and he sings in agony :

Weep, weep thou innocent goat;
Weep unceasingly that they would kill thee;
Weep before these knowing Shastras;
Thy wail shall be heard by the Lord Sangamesh
And he will do the needful!

Besides this, Basava became an iconoclast, and side by side with exposing and expelling shams and superstitions, absurdities and incongruities prevalent in Society, destroyed images and demolished idols and idolatry. At the time when

Basava preached his gospel, everything from the earthenware to the crest of sky—from rivers and mountains to a dried blade of grass served as a God, owing to the primitive tendency of humanising God. This heinous anthropomorphic regarding of God-hood -which looms large among the intelligentia and the illiterate Hindus even to-day—had split the one true almighty into a hopelessly unimaginable plurality of Gods, which is the mother of all mischief in this world. Basava could not allow this state of affairs to continue any longer; because:

Wher'ver a glance is cast, there a God exists.
An earthern pot, a tree, a stone,
Bow-string, fire and a measure jar—
All are divinities!
Rubbish! How stupid is man!
Sangamesh is the one and only God.

And how bogus is the worship of such images and idols!

"Pour milk" they say.
When they perceive a life-less snake of stone;
"Kill, kill" they say,
when they see a real live-snake;
"Avaunt!" they cry hoarse,
when an hungry being prays for food;
"Take food" they implore
to an idol which hungereth not!

Why do you foolishly implore to an idol in a stony temple to take food and offerings! Instead of it extend the same to a hungry soul the living image of God on earth—which lives in a living temple of God—i. e. the human body ?

Dear reader! recapitulate in your mind the depth of meaning and the breadth of feeling which are contained in the following weighty inspiring and illuminating lines of Basavâ!

"Such of those as can afford
have built magnificent shrines for the Lord.
But I am poor. What shall I build for thee, O Lord ?
My body is Thy temple : my legs its pillars ;
and my head its pinnacle of gold.
Hearken my Lord Kudal Sangama Deva !
With the stationary shrines, others may tamper,
But not with this moving, living, one !"

If all the people of the world could realise that all the bodies of all beings are the living temples of the Lord, and that the all-pervading Soul enshrined in these temples is indivisible and one—all the pride, prejudices, bitterness, enmity, intolerance, between man and man would vanish in a moment; and every one would embrace every other man as his own blood-brother ! Look at the birds and animals.

A grain of food makes a crow call its flight,
The hen calls its flock to peck a bit of food ;
Worse than crow or hen is the man
Void of feeling of unity and devotion. Oh Sangamesh !

Being an out and out monotheist, Basava respected all the people of the world as the children of the same Almighty Father and established the unquestioned equality of all men ; but then came the question of the sex. In Manu's Smruti it is unequivocally declared that woman is unworthy of liberty and freedom and is denied all the rites and rights in religion and society ; but Basava recognised the equal status of women in society and allowed full freedom and liberty in religious and educational matters. He regarded every woman as a goddess and sang : 'I see sister Mahadevi in virgins not my own ! Among the Lingayats both the males and females wear Linga—the symbol of the Infinite God Power—and enjoy equal liberty and freedom in all walks of life. It was owing to this fact that

about a score and ten ladies wrote 'Vachanas' or sayings in Basava's own age and in the spiritual, religious, metaphysical discussions, conducted in the Anubhawa Mantapa"—the Abode of ultimate Reality—under the presidentship of Allama Prabha, an immeasurably great Yogi and philosopher, women sometimes overpassed and mortified men. We find nearly twenty seven Lingayat ladies who have left priceless treasures of their 'Vachanas' behind them and it will be no exaggeration to say that so much mystic literature is not found in any single religion's literary heritage. In the history of Karnataka, we find a great number of Lingayat queens who ruled over vast areas of land with marvellous courage, bravery and statesmanship and some of them won the praise and admiration of European travellers of their age.

Basava is rightly called the Father of the Kannada, language. He wrote a good number of "Vachanas" in Kannada, which—first as he was to conceive the significance of preaching religion and morality to the people in their own mother tongues and vernaculars—he chose as his medium of religious instruction and the vehicle of his thoughts, innermost feelings and expressions. These 'Vachanas'—a peculiar touching tint of auto-biographical charm as they have got—reveal with immense strength and abiding influence, his magnetic, winning personality, the conflicts and struggles of his inner life and the gradual, steady stages of his spiritual ascendency, his child-like simplicity pregnant with profound philosophy, together with his soft, tender, gentle, kind and compassionate heart which even a fleeting glimpse of human wretchedness could set astir with grief and compassion and crowning all, his over-flowing, all-embracing love for all mankind—especially the humble and the helpless ; poor and the forsaken. In them we find truth, love, beauty and vision blended together in a sweet harmony and consonance. Basava's lead was followed by an out-burst of rich literature,

both in prose and poetry, and the 'Vachanas' form the most out-standing characteristic feature of Kannada literature, in as much as the like of them are not found in any other literature of India. These 'Vachanas' are short, pithy, epigramatical sayings—balanced, candid, convincing; simple in style and get rippling with profound philosophy and meaning; vigorous and yet easy-flowing, lucid unobstructed by running elegantly; containing lofty ideas and sublime thoughts, divine emotions and ennobling feelings and yet understand-able to the man in the street! This movement brought about a tremendous literary upheaval and revival which finally constituted the golden age of Kannada literature.

Basava taught his followers the dignity of labour and emphatically said that Kayaka, (any honest profession to earn a liveli-hood) is Kailasa (heaven) itself, and all the daily avocations which one has to pursue to earn one's daily bread are all equally sacred. Among the 'Sharanas' that had assembled together in the Shivanubhava Muntapa, one could see every one pursuing a different occupation and get all seated in one row, with equal prestige to all. One 'Sharana' Chandayyer by name, even goes to the extent of saying that while engaged in a righteous avocation, one should forget even the worship of Linga. This sense of the dignity of labour continues unabated even to this day among the Lingayats.

Thus, Basava worked as a reformer in all spheres of human life and in all branches of the world's affairs. Not a single needy man missed his heedful eye; and not a single evil escaped his watchful look. But this was not to continue long.

IV

In the 'Anubhava Mantapa', there was one Haralayya—a great Sharana—who was an untouchable by birth, and there was the minister, Madhuwarasa, who was a Brahmin by birth. Both of them embraced Basava's Faith and became Lingayats.

The matter did not end there. Madhuwarasa gave his daughter in marriage to Haralayya's son; and the marriage, which Basava and all the Sharanas regarded as the triumph of equality and brotherhood over the aggressive inequalities, inequities, injustice and pride of the established higher classes, was celebrated with extra-ordinary enthusiasm, amid shouts of delight and victory. A revolutionary step, indeed; In this progressive twentieth century, when the removal of untoucha-bility has become a national problem in India, and English education and western democratising ideas and ideals exceed-ingly popular, thousands reprimanded Mr. C. Rajagopalachari for giving his daughter in marriage to Mahatmaji's son—although the difference between their respective castes was negligible. But just consider what far-reaching repercussions that relationship between Haralayya and Madhuwarasa might have caused in the orthodox Hindu circles, whose sole religion was the caste system? Vehement, indignant protests were recorded and wild, furious outcries raised against this bold revolutionary deed of the 'Sharanas'; and the enemies of Basava—who had long been waiting for such an opportunity to overthrow him—exploited this public discontent and indigna-tion to embitter and instigate the feelings of Bijjala against Basava. In a mad fury at the prospect of the abolition of the time-honoured caste-system, which had the backing of the ages and not the sanction of the sages, Bijjala ordered Haralayya, Madhuwarasa and the newly married couple to be hanged publicly. The order was carried out instantaneously. Now comes the tragedy of a great cause.

Maddened by the execution of their two famous Sharanas, frenzied by the brutal assassination of the newly wedded innocent young lovers, some of the more dogmatic ardent lovers of Lingayatism rushed to avenge the death of sharanas in spite of the incessant, ceaseless efforts of Basava to dissuade them from their barbarous violent decision Basava's heart was

broken at the thought of carnage drear and human bloodlshed, and unable to convince them of the importance and practicability of his favourite principle, non-violence, he left Kalyan for Sangameshwar in utter dismay, with a heavy sorrow-laden heart, frustrated in his last strenuous efforts to maintain peace. So severe was his disappointment and mental agony that he commenced meditation and become one with the Omnipresent, Abolute, Almighty Power.

Since his passing away innumerable poets and authors in Kannada, Telugu, Sanscrit, Marathi and Tamil have written countless volumes on his life, message and philosophy, and even to-day great scholars of all communities in Karnataka are writing biographies, dramas, short-stories of Basava. Mr. Alur compared Basava with Lenin in his famous Jaya Karnatak, Mr. B.M. Srikantaiah with Christ, Dr. Sir K.P. Puttanna Chetty Kt. C. I. E. with Buddha, Khsatriga Jagadguru with Martin Luther and so on. Basava-Jayanti is celebrated every year with unexampled enthusiasm, unity and grandeur, more or less as a national festival, by all people of all castes and communities in Karnataka; while it is steadily gaining ground and popularity in Maharatta, Andhra Desh and other parts of India.

Such is Basava, the great Prophet and path-Finder of the twelth century-great because the world has not been able to leave him alone. He is one of those world shakers and world-makers who have moulded the world into what it is to-day. His is a life, the purity of which perisheth not; his is a message, the freshness of which fadeth not; his is a philosophy the value of which vanisheth not. The following passages from the editorial of the Times of India will serve as a fitting conclusion to this brief article on Lord Basava.

"It was the distinctive feature of his mission that while illustrious religious and social reformers in India before him

had each laid his emphasis on one or other items of religious and social reform, either subordinating more or less other items to it, or ignoring them altogether, Basava sketched and boldly tried to work out a large and comprehensive programme of social reform with the elevation and independence of womanhood as its guiding point.

"Neither social conferences which are annually held in these days in several parts of India, nor Indian social reformers, can improve upon that programme as to the essentials. As were in substance remarked by the late Sir James Campbell, whose knowledge of Indian History, customs and manners was almost phenominal, the present day social reformer in India is but speaking the language and seeking to enforce the mind of Basava."

SIDDAYYA PURANIK
Junior, B. A.

MUSINGS ON WRITING

I wished to write an article for the Magazine. I felt awfully depressed. I did not know what to write, yet I wanted to write something, on nonsense, on college, on anything. Suddenly these words of Mr. Winston Churchill flashed across my memory. "You should go to your room everyday at nine o'clock, and say to yourself, 'I am going to sit here for four hours and write'. Writing is a job like any other job, like marching an army, for instance. Discipline yourself, kick yourself, irritate yourself. But write. It's the only way."

So I sat down in my room at nine o'clock—in the night—thinking and thinking hard. Nothing entered my frigid brain. Then, forgetting the very purpose for which I sat down there, I began to muse.

Moonless, that dark night was all the more alive with stars. The darkness was perfumed with faint, enrapturing aroma from the 'Ratkirani' tree that stood in front of my window. There was silence all around me, but a silence that breathed with the soft breathing of the sea; and the harmonic ticking of the clock insistantly, incessantly marked the onward march of time. Occasionally the buzz of a mosquito—the most unscrupulous enemy of mankind, the beast of prey that is out for blood, as Robert Lynd tells us—would awaken me to all the horrors of a malarial fever, and I would have half a mind to rush into my bed and enjoy a few sweet hours of nocturnal rest, with the mosquito curtain guarding me like an impregnable fort from the attack of these detestable invaders. The shrill note of a train in the distance would break the silence, echo and re-echo in the distance, and fade away with an imperceptible gentleness. There was no past or present or

future for me. Ah! the reminiscence of that memorable night sends me into raptures.

Dear reader; you would say, it was a fitting time for music. But what need of artificial music, when I had become a part of some universal music? All the same, my hand inadvertently reached the knob of my "Philco." What a blessing of science! Sitting in my room I am able to listen to any part of the world I please. The music went on, I know not how long, till a continuous whirr told me that the station had closed down. Switching off the radio, I began to muse again, for what else could I do and what else was I fit to do then.

At college when those dark faces taught us what they technically called English, they used to tell us to 'express in our own words' some passage from the prescribed plays of Shakespeare. So down we would sit, laboriously translating, 'Fish not with this melancholy bait' into 'This bait is too insipid to catch any sea fish'; 'The quality of mercy is not strained' into 'Mercy is manufactured by the latest machinery untouched by hand and is pure without straining; or 'we are such stuff as dreams are made on' into 'the constituents of our body are dreams, only dreams'. After finishing it, we would hand in our papers and the professor would give us marks according to the accuracy with which 'our own words' had 'expressed' the meaning of the 'Bard of Avon.'

Of course, he ought to have given us all big cyphers and never set such a silly exercise henceforward. Nobody's 'own words' except those of Shakespeare himself can possibily 'express' what Shakespeare meant. The professor was probably ignorant (and as so many are) of the fact that "the substance of a work of art is inseparable from its form; its truth and its beauty are of course two, and yet mysteriously one." 'Our own words' are inadequate even to express the meaning of

other words! how much more inadequate, when it is a matter of rendering meanings which have their original expression in terms of music or one of the visual arts!

"When the inexpressible had to be expressed, even Shakespeare laid down his pen and called for music." And if the music should also fail? Well, there is always silence to fall back on. Such was this eventful night to me.

Everywhere was silence. My mind ceased to work. Blissful sleep had spread her mantle over me, I know not how long. Suddenly a cold breeze fanned my cheek and the 'trumpet of the morn' blew his warning note. I woke up with a start.

And lo!

"'The dawn, the dawn' and died away,
And East and West, without a break
Mixt their dim lights, like life and death
To broadden into boundless day.

In the grey sky of early dawn, stars still glowed as happy memories light up a life that is nearing its close.

Gentle reader, you judge for yourself what I accomplished by following that advice of Mr. Churchill. "Discipline yourself, kick yourself, irritate yourself. But write. It's the only way."

P. PRABHAKAR RAO,
LL. B. (Previous).

THE PHILOSOPHY OF A MIRROR

A small beautiful round mirror is on my table. As I am reflecting deeply to choose a subject, on which I could let off that 'head of steam somewhere that must blow off,' that small mirror which reflects my face, as I am looking into it, has given rise to a profound thought which I must tell you.

It is a clear, bright thing, in the strict sense of the term comparable to itself only. The brightest gems of the 'Purest ray serene' are not so faithful and sincere in reflection, as a simple mirror. But many things, even the world, nay, even God is compared with it!

A clear current of a stream of water that smoothly glides on with a sweet music of its own has a bright mirror-like surface. The beautiful surrounding scenery, the azure sky, the passing clouds, the biazing sun are all faithfully reflected in the stream. In the moon-lit nights, the views of a stream or lake is very alluring. The moon and her train of innumerable stars are beautifully reflected in the blue waters and it appears to be the part of the blue robe studded with bright pearls all over, which the mother earth wears during night! Lo! the whole celestial world is below us and we above!

The Sun which is said to be far bigger than this world, is amazingly a tiny thing in a mirror. If we look at a river or lake on a bright day, we observe innumerable little suns tossing and twisting and playing on the lap of water. In a vast expanse of the sandy deserts, every particle of sand has the miniature splendour and resplendant dazzle of the sun. The brightest as well as the darkest objects of the universe, unmixed with impurities are all reflected.

The Highest thing that man conceives is nothing but the reflection and reproduction of the innermost shrine of his heart. Plato says that the world of reality is the world of Ideas. Ideas are the reflections of mind. The human mind recollects and reflects the infinite in the finite, just like a small mirror that reflects the mighty sun!

Lord Basava, the reviver of Veerashaivism, says "Even as an elephant is contained in a mirror, So art thou contained in me, O my Lord".

Thus even the omnipresent God is imprisoned in the human heart!

Thus the human heart is a mirror omnipotent, reflective of the Highest. It can conceive the Highest-Good and if held from another angle of vision reflects the Highest Truth and if seen from another angle reveals the Beautiful. This universe is beautifully knit with these three threads by the Great Artist. His work, if we penetrate into it, reveals his wonderful personality, which reflects diversity in singularity and singularity in diversity.

Man, who is singularly gifted with the power and intellect to conceive and comprehend the wonderful work of God, has been rightly called the image of God. That is why many poets and philosophers have sung that man is a diversity on earth and the measure of all things.

Though Wordsworth has sung:—"Nothing we see in nature that is ours", yet we will find that man is everything'. The elements of nature, the sky, the air, the water the earth have all got meaning for him. He has wonderful vision that grasps the images of them in a comprehensive form. He looks at this world and finds in it the same image, which he imagines to be. It is as we think and make it to be. It is like a mirror. 'If you smile, it smiles, if you frown, it does the same in return.'

The universe, which is a wise work of God is a mirror reflecting God-hood and His marvellous capacity to harmonize the opposites, to keep in concord the contradictions, with which the human heart should learn to keep in time. Therein lies the absolute bliss, the realization of the Highest. Then man will become as clear, pure, bright and able to realize the infinite in the finite as a mirror unpolutable by any spot or stain!

C. S. INAMDAR,
Junior, B. A.

RELIGION AND POLITICS

What ought to be the relation of religion to politics? To that question many answers have been given at different periods of history. Religion has rarely been able to keep itself quite separate from politics. Let us take the case of Christianity. Although the first generation of Christ's followers abstained from participating in the politics of their day yet as soon as the Christian movement became widespread, in the fourth century A.D. under the Emperor Constantine, it began rapidly to take an active part in public life and political questions. This continued throughout the Middle Ages, when the Pope as Head of the Christian Church taking its part in politics was generally accepted with little question; for the Pope was often felt to be a kind of moral conscience of Christiandom, and his authority was a witness to the moral law and the authority of God, in a rough and lawless age. It was only when the papal authority was grossly misused that protests arose.

In England, after the Reformation, the political power, of the church was brought largely under the control of the secular government; but even then, the right of the church to exercise influence in the political sphere was generally admitted without question. The same might be said of the uprising against the papal power in Italy in the last century for although Garibaldi protested against the misuse of the Pope's influence in politics, he did not question in principle the right of the church to influence public life.

In more recent times, however, definite objections have been raised against any claim on the part of religion to exercise influence in public or political life. These objections have come both from those who wish to maintain the 'status quo' and

from those who wish to change it. An example of the former may be seen in the hostility of the government of France towards the Roman Catholic Church in that country; an example of the latter, in the determined effort of Bolshevism to silence the voice of the Orthodox Church in Russia. In Japan, religions of all kinds are carefully controlled by the state so that their influence may always be on the side of the government.

In most Christian countries. these objections to independent influence of religion upon politics have generally been directed only against corporate activity of religious bodies. only their official clergy of priests; the lay members being left free, as individuals, to take such part in public life as the may desire. Even then, however, it is generally assumed that these will be content to accept the correct popular standards of morality and public conduct.

Christian public men, for instance are expected not to allow the distinctive tenents of Christianity to obtrude in their public activities, nor to attempt to apply the principles and teaching of the New Testament to public questions. Occasionally indeed a further contention is put forward, that no active worker in a religious organisation has any right to take part in public questions. This was the view put forward by the conservative press in England in 1926, when it denounced the English Bishops for their "interference" in the general strike. This was also the contention of the European Association in India in its attack upon the Indian Y. M. C. A. in 1927, and it has been accepted by some missionary societies, which expressly forbid any of their agents—Indian or European to take part in any public activities in India. At the other extreme there are some who seem to regard Christianity as an adjunct to their own political activities: either it may be, as an effective agent of social reform, or on the other hand as an useful adjunct to the forces of Law and Order.

Amid this diversity of opinion, what ought to be the attitude taken up by organised religion in India towards public questions; and, as a particular aspect of this general question, what ought to be the influence of a university or school, through its old boys, upon the political life of this country? Can they take an active part in public life, and at the same time, remain loyal to the ideals and principles which they have learnt at university or college?

There are certain points which can be clearly laid down. In the first place, no man with definite moral convictions of his own ought so to bind himself to any political party as to fetter his own right of private judgement in matters of conscience. The programme of a political party is generally one of mingled good and evil, and a good party man "will often have to suspend his own conscience if he is always to follow the party-lead". Now a man whose life is built on religious principles ought to be the ally of all good men and causes, and the enemy of all that is evil; free to welcome the one and to combat the other, in whatever party, and under whatever political label, they may be found; and therefore he can never be a thorough-going party-man.

There have often been times when a certain religious organisation has been closely identified with a particular political party. For instance in England in the Eighteenth century, membership of the Established church was almost equivalent to membership of the Tory party in politics. And in India, both Islam and Christianity have in the past been generally associated with that section of political opinion which supports the 'status quo', and opposes movenents of a novel and radical type. In such cases, however, there is often a tendency for the pendulum sometimes to swing over to an opposite extreme. In England to-day for instance the younger clergy of the church of England are showing so much sympathy with the Labour

Party that they have been accused by a prominent Church Dignitary of being "Court Chaplains to king Demos" and in India certain members of the younger generation have of late seemed anxious at times to outdo their Hindu brethren in the violence of their denunciation of the existing system of Government. In such extremes there is always a danger, for a man of principle ought not so to surrender himself to any partisan point-of-view as to lose his own power of forming fair judgement and of keeping his mind balanced and open towards truth from any quarter.

But while deprecating an over-close association of religion with any existing political party we would equally deprecate that type of religious politics which seeks to form a 'bloc' or party with a religious label within the politics of the nation, independent indeed of other parties, but like them, self-centred and akin to them in general spirit and policy. In some European countries there is "Catholic party" of this type. But such religious parties are good neither for religion nor for politics.

In India if Christians were to form a Christian party, Muslims and Hindus, have their separate parties in the Legislative Councils and Assembly, striving primarly for its own community rights and privileges, and forgetful of a wider welfare, none of the parties would be the gainer thereby. Neither by selfish adherence to an existing political party, nor by the formation of new parties with religious labels can men of religious principles, best serve their country.

But what then? An easy alternative is to stand aloof from all public questions and politics, and not soil our souls with the corruption and intrigue of public life. Many good folk are doing this today, and are practising domestic virtues in the quiet atmosphere and affection of a truly religious home. Such lives are often beautiful, and undoubtedly have a real

influence for good, albeit in a small circle. Yet we are constrained to ask, is this really the highest way? surely not; at least, if we judge the issue by Islamic standard. For if the Islamic message is true, that "Mohammed" (May peace be on him) for us men and for our salvation was born from heaven on earth, not refusing to run the risk of the pollution of his own life through contact with humanity in all its squalor and sin ;—then have his followers any right to claim exemption from public service, when this was not granted to him by Allah? Party politician, he certainly was not; but public servant, he assuredly was, a friend of all, and a helper of all good causes. Surely then the truly Muslim way of life is not to endeavour to develop our own culture merely in the quietness of our home circle, or enough congenial companions only, but to be willing to go out into the rough and tumble of public life, ready, if need be, to suffer some loss to our own higher spiritual life through contact with those of rougher mould than ourselves, if we see that by such sacrifices we can best serve the welfare of our fellowmen.

There is an incident in the life of Christ which may be read a as parable of the influence which Christianity ought to exercise upon politics. Immediately after the story of the Transfiguration when the Master and his disciples had seen a great and clear vision of God upon the mountain-top, we read that as they went down from the mountain they came immediately into contact with dirt, degradation, and suffering, in a village where a lunatic boy was in the grip of one of the most dreadful afflictions that come upon human nature; and his friends were suffering an agony of distress on his behalf. Christ fresh from the vision of God, restores the lunatic boy to life. So we may picture the task of the Christian Church and of ture Religion. On the one side religion must keep its times for prayer and for renewing the vision of God on the mountain top of high spiritual experience. These are essential

for Religion. But no individual soul has the right in a world of suffering to attempt always to stay at those high levels. Such would be a way of spiritual selfishness. The vision must be taken and brought down to the common levels of life, and there passed on, to be an inspiriration and a message of restoration to those who have fallen in life's battle. It is good that religious men in India should value their places of worship their times of prayers their Ashrms for devotion and spiritual conference. But it is no less essential if they would be true to their highest ideas, that they shall go out into public life on this land, to bear their burden of reponsibilities in municipal councils, in the great assemblies of the nation, and in every campaign for reform and uplift of the people, bringing into all that spirit which they have learnt from God, and which they count it to be their duty and privilege to pass on to their fellow-men.

M. HAMIDUR RAHMAN, B.A., LL.B.
(Previous)

MUSINGS OF A MORNING

With the rise of the sun we should awake, for we see the hidden beauties of Nature. Warmth comes to our heart even in the extreme coldness of morn. It seems as if this glamorous time is going to pacify our griefs and sorrows, or heighten our pleasures and comforts.

Flowers blossom in the garden; Birds chirp on the trees; Clouds hang on the sky; and I sit here, thinking and struggling to know what they are and what they will be. The river slowly flows on! The waves toss higher and higher. I lie on the ground, and the cold breeze passes by, making me feel cold and chilly.

In this delightful morn, I lie wistful and sad. Sad, not because I don't like the weather, not because I am a pessimist by nature, not because I am shivering in the breeze; but because I think, and speculate and wonder, 'what God has made of man,' and what will become of him.

Sorrow is a morsel for some which can be swallowed easily: so also it is a mountain for most of us, who remain unaware of the attributes and gifts of God. Some became effete and worn-out, some look happy and delightful, and some linger in between the two.

The falls and misfortunes in life make one more elate and enthusiastic. Prepared to bear all ill-fortunes and disabilities, one feels a kind of delight in it. Sorrow even at its height, makes one more sturdy and more confident.

But still one craves for benefits, rewards and happiness. Death, even at its last moment consoles the soul of its prey. A

pauper or a prince, a slave or a knight, in discomfort and uneasiness has an assuage, a hope and a satisfaction, which cannot be tasted at all times in life.

The morn is cloudy. Bits of clouds gather high in the sky. Smoke rises up from the chimney's of the houses beside. Some admire the beauty of this place, some pass by not noticing it and some ponder over the idiosyncracies of nature.

A cow grazes here, and battens and grows fat. Unmitigatedly she is in hilarity and mirth. She does not know about the decadence of the world. But alas! a few who know about it, still lie in delusion and confusion.

KRISHEN DAYAL, B. Sc.

THE EXAMINER

It was a summer afternoon, In a corner of his reading-room, an earthly god was sitting at his table, presiding over the destinies of many innocent young people. He had a dark complexion, a bald head, a shaven face, hollow twinkling eyes, and a somewhat round belly. He was poring over a thick pile of papers, with his pencil restlessly moving over the pages, and his heart inwardly cursing the disagreeable productivity of their authors. He was working with the utmost speed; giving marks beforehand after a glance at the hand-writing, skipping over many pages, sorting away the additional books, and disapproving with great promptness the others which remained; but still the menacing bulk did not considerably dwindle.

At last the god grew tired of his labour. His brow was sweating, and the sharp edge of his pencil was blunted. In came his servant, announcing the arrival of one of his friends, and out rushed the god with his round belly and 'anointed' face, dropping the pencil on the floor, and the paper in the waste-paper-basket.

Aurif had come—Aurif the triangular shaped, skinny-faced-ghost like figure, with his legs almost staggering like wooden appendages, and his hands moving convulsively as he walked. The god had consigned his uncongenial task to the care of his wife, the goddess, and was now busy in conversation with his friend.

And now this goddess resumed the unfinished task. She had a fair boy, who sat by her side all the time she was busy with the papers. She told the boy to select those papers which could be disposed of within the shortest time. And taking the first of them, she began to read through the answers.

'What!' exclaimed she, passing for a while, this man writes nonsense! what's the spelling of "col-rij"?

'Why', answered the boy, 'it's so easy—coal-rij'.

'And the meaning—?'

'Oh, don't you know, mother? It's the biggest coalmine in England.'

'Coal-mine in England! But how can it speak? Look here, this man writes, "Coleridge says that an understanding of poetry requires an eagar suspension of disbelief." And then, what does he mean by suspension ?'

Why, suspension means doubt. But the fool doesn't know the real meaning. Give him a zero, mother, he is a big fool.'

'And so he is, to be sure! But what should I write on the margin? Will you ask your father?'

'Oh, there's no need of asking him. Write in bold letters "Sheer Nonsense." That's what my father does!

She did accordingly, for she knew that the boy was wiser than herself. Then taking the next answer book, she first looked attentively at the opening page. 'What a beautiful hand writing!' she exclaimed, 'I never could write so well. Even your father does not write so well. But it is a pity, he has written only seven pagos. Should I not give him the highest marks, my boy?'

'Certainly, mother. If I were you, I would give him one hundred and fifty out of hundred.'

'Now here's another peculiar word', she said, reading a third book. This fellow writes "John Drink water—a poet." I've never heard such a curious name in my life!'

'But it's what they call a short form—he only means to say: "Drink water at John & Co., and become a poet.",

'Oh! is it really so? But why has he omitted two words "& Co.," and "become". But it's wrong, I suppose. Your father drinks more things at John and Co., and yet he could never become a poet.'

'But that is what this fellow says—right or wrong.'

Apparently satisfied with these arguments and interpretations of her promising young boy, she proceeded to read the other papers, and before the return of her lord had considerably reduced their bulk. Hearing the sound of heavy foot steps at the door, she assumed an air of great concentration, and began to pore over the pages as if she would swallow them up.

'Have you seen No. 134, my dear;' asked her husband

'Yes, I think I have. Now, here it is. He's got 24 marks;

'No, no; it's not a he, it's a she. It's Aurif's niece, as he told me just now. A very brilliant girl.

'But the brilliant girl has failed, and I can't help it,' said she with great concern.

'Why, you can. Just make it '42'. It's so easy to do so. There's an end of the whole affair.'

And a slight movement of the pencil changed the figure into '42'.

Anything else'? she asked.

'Nothing. Be careful that nobody else should get more than fifty. I am going to the club—with Aurif—goodbye;

And with these words he departed with all the solemnity of an omnipotent god. Soon after, the goddess left her divine chair, enthroning her promising son on it, and hastening to the long-meditated preparation of jellies and sweetmeats.

M. NAZIMUDDIN SIDDIQI.
M. A. (Final).

Mr. ABDUL WAHAB, M.Sc. (Osm.)
Secretary Tennis Club.
He is both a scholar and a Sportsman.

Mr. S. K. SINHA, B.A. (Osm.)
A good writer, an excellent speaker and a sound scholar

AZAM STEAM PRESS

MY ALMA MATER

Mother, I am your child. You have given birth to my consciousness———consciousness which has like a sun shed its sunshine on my unmeaning soul. Though "far from the maddening crowd's ignoble strife," I linger in a sweet valley devoid of your charming presence and knowledge-scented love yet every moment of my life is a longing to court your presence and pay my homage. The time's severing-wave has placed me far from you practically on a foreign strand; still the fragrance of love that I bore for you is undying. I feel the touch of your golden hair in all my dreams. The dreams pass away like the monsoon winds but they leave me in the region of reminiscences. I begin to recollect those lyric hours in which you clasped me and I was like a baby nestling in your arms. Oh " clinging sadness of the vanished worlds ".

Mother—I owe to you my life—my real life. You have in a sweet whisper explained to me the secrets of life—the eternal truths. Above all you have awakened my dormant soul and filled the cup of life with the rosy wine of knowledge and love. Deprived of my other mother's love I took solace in your sanctuary——you read saddness on my brow and stretched arms to receive a forlorn child. From that time you have nursed me as your own child and kissed me as the morning breeze kisses the flower. These recollections make me all the more uneasy. The little boat of life drifts in the flood of passion and longs to go back to the old alluring world where you reign; I burst out saying :—

Time, you old gipsy man, will you not stay.
Put up your caravan just for a day.

Mother, Your enemies look upon you you with great con-

tempt in your moonlight, hours of success. But you are fearlessly quiet, highly modest, and serenely reserved. Perhaps you do not conjure with the voice of discord and hate. Yes, you are too sublime to respond to the brickerings of the old hobgoblins. But the fact of the matter is that those people who have no spiritual ties with their mothers depreciate your virtue. Only innocent children quarrel about the respective merits of their mothers. Mother is after all a mother—a sublime institution to be respected by one and all.

Some fugitive moments like spring flowers blossom in my heart and I feel one with the past. I feel that I stand like a beggar before the balcony of my Alma Mater's palace gate and she, a born princess with wealth immeasurable, gathers a handful and with a shimmering smile gives it to me, I take the gift and put it in the secret chest of my heart.

My Alma Mater, sometimes in a pensive mood when the mind's eye is busy in retrospection I see you seated on the mornings golden carpet; the sun paying tribute to you and a crowd bowing before you in admiration and respect. The world of knowedge is at your feet. I feel disinclined to stand enveloped in this mystic silence and my lips begin to utter voluntarily.:—

"Let thy love's sunshine kiss the peaks of my thoughts and linger in my life's valley where the harvest ripens."

S. K. SINHA

B. A.

MARXISM:
A Rationalised Thought-Process.

"He that will not reason is a bigot;
He that cannot reason is a fool, and
He that dares not reason is a slave."

—*Sir William Drummond*

Marxism, by its very name indicates that it is the philosophy, propounded by the great Philosopher—Karl Marx. (1818-1883). It was a special mode in the human thought process—generally known as 'dialectical materialism'. Marxism primarily stands on the pillar of rationalism—the way studded with logic and reason. As such, it strikes at the roots of blind belief and superstition, prejudice and faith. To profess Marxism, therefore, one has, first of all, to discard all conceptions born out of blind faith, which is the negation of rationalism. Marxism, being a rationalised philosophy is undoubtedly, a gift, a guiding torch through the intricate and abstruse problems of humam life. Therefore, it is not, as is largely supposed, merely an economic theory. Being a philosophy of life, it includes in it economic theories, political doctrines, social Problems—in a word—a programme of the 'human struggle for existance.'

The secial feature of a rationalized mode of thought is retrospection into human history. The best way, which Marxism presents us in order approach an intricate problem is to search out the cause and origin of the issue concerned.

Let us, however, contemplate some of the much bothered about problems and issuet and see how, as a matter of fact, each of them is but trifling. Only courage of conviction is needed to be convinced of the facts.

The 'existence of God' is perhaps one of the most baffling questions which has hitherto engaged thousands of thinkers, saints, philosophers and preachers. The result of these long-drawn wars of idealogies was the creation of two schools—one belonging to 'theists' and the other to the 'atheists'. Nevertheless the clash still goes on.

Why should there he a God ?—But before putting such a question, let us search out the evolutionary implication of the idea of God. A thorough investigation into the most backward civilization of humanity clearly discloses the fact that "in its origin the concept of God is nothing more than that of a 'Dead Man', regarded as a still surviving ghost or spirit, and endowed with increased or supernatural powers and qualities". Thus, out of pure fear of an undeveloped mentality, the idea of gods arose, with the hope that by offering sacrifices, the sinners might be forgiven. Thus again, we can deduce the evolution of Religions. "What is common to religions throughout, is custom or practice, a certain set of more or less similar observances."

When a rationalist—or more correctly speaking a Marxist has found out the chief causes of Gods, idol worship and religious doctrines, he will argue, " Well, the origin and implication of these gods and religions were quite all right in 'their' period and in 'their' civilization. But why should one be committed to blind-belief in them, even in the 'Age of Science and Invention?' Is there any one who will deny that Science, with all its stupendous and glorious, achievements, has struck down all fearful consequences out of an undeveloped mind? Then come along; let us have the courage to discard once for all, the long-cherished notions of gods, idols, supernatural elements and religions !"

The bigot on the other hand, committed to blind-belief and irrationalist mode of thinking, will sneer at the Marxist and let

him alone by conferring on him the degrees of a heretic, a *dharma-bhrashta*, and a *Kafir*! This critical moment is the most severe test for the Marxist, for, in the absence of firm and adamantine conviction, he will soon lose his balance and, for fear of being offered the above degrees, will at once stick to the bigot. The consequence is that, the camp of bigots being a majority, our hero feels that at last he has gained fame and prestige in his society! But dear friend, is it same to crush more rational and scientific views of life, simply in order to gain cheap prestige and popularity? The Marxist, therefore is not afraid of his society. He will go on propagating his opinion 'without any prejudice towards other schools' and if he realizes that he is on the wrong path, he at once gives it up. He will die for his rationalist views and facts, rather than for cheap honour in the camp of factions and bigots!

Another question equally harmful, if not baffling, is the question of being bounded by some of the moral philosophies and ethical doctrines—prevalent throughout. For example, the irrational will be struck with horror at the very idea of committing theft!' Because he was asked to swallow the moral pill. "To commit theft is a sin! Nor has he got enough courage to go deep into the dogma. He is satisfied to think that he is not committing any sin! But here comes the Marxist. He jumps headlong in the tide and fetches an argument, "To commit theft is a sin? Ah! my dear friends—do you know from where it comes? It comes from those selfish, inhuman and cruel bourgeoisie mentalities, who have preached it in order to protect their property, riches and money from the suffering, hungry creatures with hollow, sunken bellies! Society, with all its short-comings has divided itself into two classes—the rich and the poor. But is it wise and human to throw a great majorty into the wilderness of poverty and suffering, when a negligible minority has monopolised all the enjoyments and fortunes of Life—Fields,

factories, large magnificent edifices, electric fans and monumental pillows? Is it wise and logical to say that the man is suffering poverty because he has done some wrong in the 'Previous Life'?—No, Committing theft is not a sin."

Thus moral philosophy is not a special endowment from the Heavens above! All social laws, moral dogmas and ethical doctrines in one, are but a circuitous playhouse; built up by those who have monopolised the authority to do so! What is the State? But a changed form of the bourgeois, the capitalists, and the rich. It adopts a special technique to keep in subjection the suffering poor, so that they may not dare to revolt against the existing situation!

No need, however, to mention all those moral bondages encircling the individual. Whatever is fiction, whatever is useless, and whatever is harmful, is rejected by the Marxist. Being non-prejudicial and rational, he will approach all social, economic and political problems correctly. He is not a spiritualist, because he knows that modern Biology, Physics, the Theory of Relativity and the Wave-Theory have proved most explicitly that the whole Universe is matter. There is no 'external or supernatural Power' to govern the laws of Nature. To-day, the substratum of the World has been revealed to be an all-pervasive substance. The Marxist is not a rigorous orthodox, because a thorough study of all human history has exposed to him that due to lack of Science and Reason, man was bound to create imaginary Gods, idols and religious doctrines. Therefore the only religion which a Marxist can profess is 'the Service of Humanity'. Thus, he does not bother himself with the question of Hindu-Muslim unity or the solving of the Communal problem. He is not a *Hindu-Mahasabhite,* nor a member of the Muslim League. Nor does he belong to the Congress, if he sees that the Congress Policy is fatal to the rights of Minorities. A Marxist does not believe in a philosophy born out of 'inner voice'. Therefore he is not a Gandhist. He is not bound by a moral set of dogmas created by a selfish class, and therefore he wants to establish a new society where there are no classes. Thus he is a Socialist. Not being self-centred, he will not think about Indian Problems neglecting the International Situation. Therefore he will study all the political, economic and social problems of all nations. No current "isms" are likely to run away with the watchful Marxist. Consequently, Nazism and Fascism will prove by their true implications, to be the sworn enemies of human Liberty and Freedom. Therefore, a Marxist does not wish to see the whole world within the clutches of the Fascist Menace. He does not hesitate to co-operate in the efforts which have arisen in order to defeat the Fascist hordes and thus to check the growing tide.

Nevertheless, the Marxist will himself, after a thorough and consistent study in all the branches of knowledge, and of the situation of Indian society, come to realize that time has come when a revolution—a redical change— is quite inevitable, so that the old, rotten and superstitious systems and customs existing in the society must be struck down, thereby constructing a New Order, on the Pillars of Marxism—a rationalised thought process. Well, the hero, wishing to be called a Marxist, must not forget that even Marxism is not to be professed merely blindly. That is what Marxism tells us. A clear and thorough study, therefore, is needed. Without that, you cannot defend your issue. The very force of argument is rendered futile.

GOVARDHAN SHASTRI,
Junior Intermediate,
Osmania University.

"THE MOTHER'S HEART"

The world of the young man was painted by the fine imaginations of the love of his sweetheart. He could see in the depths of the attractive scenery only one word—the name of his beloved. "How long shall remain my impatient soul uneasy for you?", one day at last, the young man asked the sweetheart. "Bring me a thing of the world which is dearest to you," said the beloved. The young lover presented all his wealth to her. "No" said the beloved. "The Coins of silver and Gold cannot induce me to become yours ; the prize of my delicate body which you love, is the heart of your Mother." The young man looked up, the whole world was trembling before his eyes. "The heart of my mother," the idea of which sent a shiver through his body. His mind was entangled in the struggle of sin and love. At last love triumphed. The young man pulled up the heart from the weak and worn out body of his mother. While he was on his way to give it to his beloved, suddenly his foot slipped and he fell down. The piece of flesh which was the heart of his mother spoke, "Dear son, have you received any injury."

(Translated)

MD. MUKTAR AHMAD,
B. Sc.

BALLAD POETRY:
Its Origin, Nature and Influence

The Ballad is one of the oldest forms of poetry. Perhaps it is as old as the epic. Even the epic of Beowulf, (though not quite a regular one) is for its origin indebted to some of the ballads written in Anglo-Saxon which were then very popular among the folk.

There are many theories about the origin of the popular ballad but only three of them are considerable. The first is the "Communal" theory which supposes that the first ballads were made by the folk as a Community in some mysterious or rather in a miraculous way. The other is the "literary theory" which says that the ballad was founded on some romance of the Middle ages which it merely summarises, and must be considered as "part of the literary debris of the Middle ages" or that it is the work of the minstrels who elected to remain annonymous. The third, the theory of professor Gummere, and the one most generally accepted, is that the ballad originated with the individual, but was changed and modified due to the oral transition.

The word ballad, closely connected with ball, or ballet, and originally meant a dance-song, thus denotes its origin. The folk song ballads accompanied by dance at the time of some celebration of the religious or martial ceremonies of the tribe. The most primitive form of the ballad is made up of question and answer. Sometimes it was an individual who is questioned and the answer was also made by another individual, and sometimes the questioner was one man and the answer was made by all the people present, and sometimes it was a mere refrain at the end of every question.

e. g. (1) " O where hae ye been a'the day,
My wee wee croodlin doo doo?
O where hae ye been a'the day?
My bonnie wee Croodlin doo ?"
" O I hae been to my step-mammies,
Make my bed, mammy, noo noo!
Make my bed, mammy noo!"

(2) There were two sisters sat in a bower,
Binnorie, O Binnorie;
There came a knight to be their wooer
By the bonnie mill-dames O' Binnorie.

Afterwards the refrain of Edward was popular in ballads.—

"Why does your brand sae drop we' blind,
Edward, Edward?

With the lapse of time the chorus disappeared from the primitive ballad, and the two-line stanza was superseded by the four line, or what is known as ballad metre, which consists of alternate lines of eight syllables, the second and the fourth lines rhyming. By this time the ballad had become a narrative poem. This new form could not allow any dance or chorus.

The Ballad is a simple story in verse; it embodies incidents, superstition, beliefs and tales that are found in the folk-lore, not only of many European, but also of Asiatic peoples. Sir Henry Newbolt says: "The oldest of them are not of native origin; they come, as we have seen from the ancient folk-love of Europe, and in particular from Scandinavia. But they are British by choice and favour; they were congenial from the first. The world they tell of is full of powers stronger than man—of Tam Lins and Queens of England, and beyond it lies a grim life of the dead—fiery trials, mouldering graves, and vain revisitings of the beloved on earth......The ballads

present life as a tale that has significance; and the significance arises naturally......from the human passion", These ballads were made out of the experiences of daily life—love and hate, cruel death, supernatural dread. In the ballads of the "Wife of Usher's Well, "The Demon Lover", and "Clerk Saunders", futile revisitings are described.

After the simple ballad, there comes the historical ballad, a turn which marks a conspicuous change in the history of the ballad. The political condition of the life then in the Middle Ages gave rise to the idea of unification and organisation against the tyranny and aggression of other class. Some man of noble character and audacity will stand up, fight againt the enemies, defeat them and save his people, and the people in his praise sing songs, immortalise him in hymns, and adore him like some deity of theirs. Their songs not only contained his praise but they were also the chronicle of all his deeds of bravery. They were written in simple but passionate language. The "Robin Hood" Cycle, "Chevy Chace", the "Battle of Otterbourne", "Edom O'Gordon" are some of the famous historical ballads. But it must be noted that they are not all strictly historical, and the contents are also generally exaggerated. These historical ballads can preferably be called heroic ballads, as many of the ballads contain the deeds of a hero after whose name they are named. Enchantments and other supernatural instruments and agents find no place in the heroic ballad, and instead of the tragedy of love there is the tragedy of heroic death. Johnnie Armstrong, the outlaw, is treacherously trapped by the King and dies fighting:—

Says Johnnie "Fight on, my morry men all!
I am a wounded, but I'm not slain;
I will lay me down to bleed awhile,
And then rise up and fight again".

Robin Hood while dying, poisoned by the Abbess of Kirkeslea, comes to know that Little John is going to burn the nunnery and fair Kirklea-Hall, and prevents him from doing so:

"Now nay, now nay," quoth Robin Hood,
"That boon I'll not grant thee;
I never hurt woman in all my life
Nor man in woman's company.
"I never hurt fair maid in all my time,
Nor at my end shall it be!"

From being only an entertainment for the folk, the ballad now began to attract the aristocracy also, and ballads of the type of "Sir Patrick Spens," "Bewick and Graham," "Hynd Horn" were written. They were forged out of earlier versions or out of the longer romances which at the time were very popular in the courts and halls. The early ballad with its domestic themes receded farther and farther into the past to give its place to the heroic ballad with its historical setting and its extolling of aristocratic virtues. Along with this type of ballads come those which took their themes from the popular legends and famous romances e. g. "King Lear," "King Arthur", "The Jew of Venice". They are very interesting on account of their associations with the famous works of either the same name or the same theme.

The printing press gave enormous help to the spread of the ballads and their popularity. Till then they were preserved in the memories of the people and at the proper occasions were recited, thus suffering from all the defects and weaknesses of their preservers and reciters. But with the spread of printing came the wider circulation of not only existing ballads, but of new ones composed to satisfy the popular craving for them. Printed ballads were known as 'broad sheets' or 'broad sides', and were hawked about the streets, market-places and fairs. The more miraculous and incredible the incident, the readier,

the market it found. "Here is another ballad," Cries Autolycus, "of a fish that appeared upon the coast on Wednesday the fourscore of April, forty thousand fathom above water, and sang this ballad against the hard hearts of the maids; it was thought she was a woman, and was turned into a cold fish, for she would not exchange flesh with one that loved her: the ballad is very pitiful, and as true." 'This burlesque of the ballad is scarcely exaggerated', writes Downs and gives the same reason that the miraculons quality was prized more in those times. In the latter half of the seventeenth century the ballad was used to supplement the political pamphlet, and partook of its bitterness and invective.

After the commencement of the 18th century ballads-collecting began. As Downs writes, "Thomas D'Ufey rendered some service to the future of balladry by collecting songs and ballads, new and old, which he published with songs of his own as "Wit and Mirth, or Pills to Purge Melancholy (1719-20)" The Evergreen (1725) of Allam Ramsay, described by him as being one collection of Scots poems, wrote by the Ingenious before 1600," consisted of a number of genuine ballads, though unwisely modernised. He also published his Tea-Table Miscellany (1724); it shows more editorial taste and discreation. The most famous among them is Percy's 'Reliques of ancient English poetry (1765). This collection had a great influence both in England and Germany and played an important part in the Romantic Revival which is going to be discussed in this essay, though not very copiously. David Hurd did a parallel to Percy's work in Scotland. He was praised by Scott for his "shrewd manly commonsense, and antiquarian science." His "Ancient Scottish Songs" is the first collection of ballads free from the collectors' 'improvements.' This and other Scottish Collections were drawn upon by Scott for his 'Minstrelsy of the Scottish Border (1802—3). Scott was followed by Motherwell, Buchan, Jameson and Kinloch. Professor Child's 'English and

Scottish Popular Ballads (1882—98) which contains all the known ballads and their variants is 'the most comprehensive and scholarly collection.'

The ballad is essentially musical in quality and also simple for it was mainly meant for common people. It prevailed mostly in the Middle Ages and thus is very much inlined with the spirit of Medievalism. Though not quite directly yet the germ of drama can be traced in the ballads as well as the germs of the epic and of the poetry of nature. About the Epic it has been said that in its earlier form (in old English, as seen in Beowulf's) the epic was a collection of several ballads by different people or one man linked either by the plot itself or by some character as it is in the case of the 'Faerie Queene' which is also linked by King Arthur. About the germ of the drama it can be said that the duologue is significant of it and the drama in its earlier form in primitive days was nothing but a dialogue. In India we still have its reminiscences, and among the Arabs, their 'Zamine' and 'Samar' characteristically resemble the dialogue and the duologue system of the earlier ballads.

In my opinion the poetry of nature in England is much indebted to the ballads. On the authority of the Lyrical Ballads, which do represent the poetry of nature as well as take the name of ballads, it can be said that the poetry of nature in the English language has gained much from the ballads. Wordsworth has called them ballads, but they were not ballads in form. Then why did he call them so? The characteristics of Wordsworth's poetry are simplicity of language, a familiar theme and high imagination. Two of these qualities were taken from the ballads and as the contents of the 'Lyrical Ballads' were ballads in their spirit, they were rightly named so by the author.

The ballads have wielded a great influence on the Romantic Revival, Percy's 'Reliques' is responsible for the renaissance

of wonder, The ballads were full of not only the life-pictures of the Middle Ages, but also of the spirit of the time, the spirit which gave to English poetry its supernatural element and has produced such great poets as Coleridge, Scott, Keats and Thompson. Many of the precursors of the Romantic Revival were in some way or other under the influence of the spirit of the Middle ages, and the ballads contained the very quintessence of it. One of the older poets of the Romantic age, Scott, both in poetry and prose epitomises the effect of the Medieval times, through the ballads. Chatterton, one of the pioneers of the Romantic Revival, who died a premature death, was a good writer of ballads, his style was so influenced by the obsolete form of the olden ballads, that he was able to deceive even the scholars of the time, regarding the dates of his poems.

In Coleridges' Ancient Mariner we perceive the spirit of ballad, the simplicity and the supernatural element. It is written in the ballad metre. Keats always looked back with admiration on the ballads, and before he reached the *Grecian lands* he had roamed about in the *native fields* for a longtime. His 'La Belle Dame Sans Merci' can be counted among some of the very fine ballads of the 19th Century. Tennyson's Lady of Shallot' is perhaps the best of the ballads written by great poets.

In modern times the form of the ballads has no attraction for poets, yet its spirit still affects and is extant in many other forms.

MOHAMMAD MAHMOOD HUSAIN,
M. A.

THE BLACK DEATH

England can never forget the losses incurred by her either in the Great Fire of London or the Black Death. Nothing can be more disastrous, and tragic to a country than a event like this. In the year 1347, the world witnessed the most terrible plague in the annals of European History. It is said that this malady first originated in China, from where it began to spread like fire treated with oil, towards the west. Medical Science in those days was in its infancy, hence this malady being unchecked easily diffused towards the adjoining areas. In 1346 the port of Caffa, on the Black Sea was the first place in Europe to be infected. Caffa was an important trading centre in those days and the trade ships were responsible for the spreading of this destructive plague. The plague have reached the Mediterranean shores appeared in England in 1348. Almost all the countries in Europe had to suffer a great deal from this disease, Every day hundreds of the mortals fell victims to the aforesaid malady. It is said that many gallies were found drifting over the seas with no human soul in them.

A Chronicler says :—

"The plague on these accursed galleys was a punishment from God since those some galleys had helped the Turks and Saracens to take the city of Romans which belonged to the Christians". The people were very horrified at the immediate appearance of the disease, Most of them thought of ridiculous cures against this. Some of them, being afraid of the affliction did not leave their houses. Many of them did not talk and left off drinking wine, as they thought that drinking was the cause of the disease. There were strange sights. At times men could be seen having flowers or some herbs applied to their noses, so that the outsiee infected air might not harm them.

This curse struck terror in the hearts of the people. When somebody fell sick all his relatives and neighbours deserted him. The poor man was left to die unaided. Everyday the number of deaths increased in leaps and bounds.

G. G. Coulten says:—

"So great was the multitude of the dying folk in Florence by day and night as was a marvel to hear and even more to see".

The fear of this tribulation was so great that even the wives deserted their husbands. The lower classes suffered a great deal. Their death rate exceeded those of other classes. Many were the corpses found exposed to air heat and rain in the streets. The chronicler of Meaux in Yorkshire writes that the living were scarcely sufficient to bury the dead. Even the most obedient son did not attend upon his father's funeral. Wives had no regard for their husbands nor husbands for their wives. G. G. Coulten says :—

"For things had come to such a pass that there was no more care for the dying folk than men would nowadays care for goats."

The churches were filled with the dead bodies. Often in one grave many corpses were put and pressed down since there was scarcity of space. A large percentage of the dead persons were not even taken out of the houses. Even the priests any not dare to go near a corpse. Rich people hired men to carry the corpses to the churcges and were given high wages. The priests could hardly get time to hear confessions.

Many died amoung the monks and often the churches were left to birds and beasts. Afterwards monks refused to accept any parish duty. The priests and the men who went to the sick persons immediately fell sick and breathed their last In many cases it so happened that ofthen the visitors died earlier than the sick person himself. The same case fell upon the

physicians who went to attend upon the sick persons. Most of the patients died in solitude, having none to attend upon them. How horrible it is to hear that the bonds of fraternal and maternal love failed. Physicians refused to go near the patients even for the most handsome fees. When a corpse was seen in street, men would flee like hares to their·dwellings or hide themselves anywhere. The fear of death haunted the hearts of people in such a manner that they did not even utter the name of the dead man for, if one died almost all his family was sure to undergo the same fate. A Chronicler, Angelo da Tura writes :—

"Nor was the funeral office sung, and I, Angela da Tura buried five of mine own children in one grave with my own hands and so did many others likewise and beyond this, some of them were so ill covered that dogs drew them forth and ate round the city."

The Irish friar John Clyn writes :—

"The patient and the confessor were taken to burial together and for fear and horror men scarely practise the works of piety and mercy that is to visit the sick and to bury the dead."

The high suffered less than the low. The poor people died in great number when compared to the wealthy classes.

Historians have different opinions regarding the casualties. Some say that more than half the population of England perished and some say that one-third of the population was driven to death during this period (1347–1350). Anyhow losses were such that they could not be compensated. Prior to the plague there were 30,000 students at Oxford University but within a short period the great number was reduced to 6000. In many cities one-tenth of the population survived

whereas in some places four died out of five. The following pair of couplets give an idea of the casualties.

"In thirteen hundred and forty eight,
Of a hundred there lived but eight"
"In thirteen hundred and forty nine
Of a hundred there lived but nine".

Nearly sixty thousand died at Norwich while in Bristol the living could hardly bury the dead. More than one half of the priests of Yorkshire perished.

The effects of this plague on the political economy of England and on English society and religion were remarkable.

Earthquakes, volcanic eruptions, floods and pestilences are the curses of God. During troubles and miseries the name of the Almighty comes automatically on our lips. The same was the case then. But no sooner did the plague cease, than men adopted their original behaviour. Coulten says :—

"Since men were few and since by hereditary succession they were abandoned in earthly goods, they forgot the past as hough it had never been, and gave themselves up to a more shameful and disordered life than they had led before".

After this great Pestilence men began fighting with each other for property. Women decorated themselves with fair and costly garments. Matters became still worse. Labour became costly. As most of the men died the supply became less; men demanded high wages. In those days the Barons who were powerful in Parliament wanted to check the increasing wages of labourers. In 1350 they passed the Statute of Labourers. This statute was to decrease the wages of the labourers. Those who took high wages were threatened with death sentence, still the labourers did not come. They only performed the work of those that gave them wages according

to their satisfaction. When the serfs were forced to cultivate their owners' soil, they refused to do so. all these things were the leading steps to the Peasants' Revolt in 1981. This catastrophe deeply affected the European civilization of those times.

The plague appeared like a devil in Europe when the hundred years war (1338-1453) between France and England had just begun. During Edward III's time the war had three stages. The English triumphed in the first and second stage but during the third stage owing to the Black death Edward could not recruit soldiers. The English were eefeated due to this and the war had to be temporarily stopped.

Religion in any way did not suffer as a whole, for in many cases men became more religious than before. Some of the religious institutions suffered very much. Many posts in the churches were vacant. Clergymen became pleasure loving. The churches were badly in need of reformation. Instead of universal love, piety and devotion their motto turned out to be "Eat drink and be merry for tomorrow we die". The follower of Wycliff the Lollards gained a high hand in society. Their number increased by leaps. and bounds. Knighton says that they multiplied like budding plants. After this calamity the system of slavery practised in those days came to an end.

It was the greatest curse that the English people suffered during the middle part of the fourteenth century.

SYED ABDUL BARI,
First Year (Arts).

THE PSYCHOLOGY OF SITUATIONS

There are situations and situations, abnormal and normal situations, good and bad ones; critical situations nearly equivalent to predicament. A single given situation is the effect of various causes, physical and moral. It is as if the different elements of a given environment conspired to alter the scheme of things in such a way as to baffle human attempts at their solutions. I shall only discuss teliologically the socalled abnormal situations, for the ordinary situations are co-extensive and continuous with life itself and they do not seem to have any claim on our attention unless we intend to modify them to suit our desires.

It is better to give it a definite content so that I may not be misunderstood. I take it to mean the position of the entire environment of man at a given time. It is abnormal if it is calculated to incommode for the time being, an individual or a group. Thus, the present war is an abnormal international situation. And the political situation in India is also abnormal in so far as it has given rise to discontent and unrest. Furthermore, an abnormal situation may be so to one and at the same time normal to another. For instance, if a band of free-booters plunder, as it is usual for them, a way-farer then from the point of view of the way-farer this is an abnormal situation, but from the point of view of the bandits it is not so. It is the power of the positive by deflecting the normal course of things to the detriment of an individual or a group that makes it abnormal.

The dynamic factors that bring about crises of great magnitude are different at different times. An earthquake shock, a flood, or an epidemic may be contributory factor; but

most often it is occassioned by factors originating in human mind and it is here that we are called upon to analyse it, to trace its ultimate source and thus abate or remove the dangerous elements from it. The national and international catastrophies are all traceable to human mind. The politicians, the economists are ill-equipped to tackle them, as they merely consider to superficial aspects. The politics, economics, and ethics of this pathological manifestation of human mind are only secondary causes. They are not all in all, yet we see statesmen regarding them as such, and neglecting to consider the personal elements in them.

Modern psychology has established that intellect and character are two different aspects of human personality existing independently of each other. Thus we should not think that a great scientist is incapable of devilish actions and conversely and inveterate criminal is incapable of intellectual flights. The historical instances of Lord Byron and Oscar Wilde's dangerously profligate lives are cogent evidences in support of the above statement.

Character is the main well spring in which originate all the human motives that have made Napoleans and Hitlers of some men, and Gouthamas and Alamgirs of some. This human character manifests itself in human behaviour and the actions and reactions of this human behaviour go to make up the composite picture at a given time in the great drama of human life. This wholly materialistic orientation is responsible for the prolongation of the national cataclysms. We should study character by the observation of its manifestations in human behaviour antecedent to a given situation. Only then can one hope to come at a good solution.

To take an illustration, the Hindu-Muslim problem in India that has proved an insurmountable obstacle to progress, is a continuous abnormal situation in my opinion. The mistaken

attitude of the national leaders is largely responsible for its continuance. They have merely calculated its motivations in terms of matter, entirely disregarding mind. One who means to tackle this problem should first of all study the typical Muslim mind and the typical Hindu mind, particularly their characters and dive still deeper below the statum of character to find out what essentially are the motive factors that have brought about such characters whose reactions to each other have occassioned so disastrous consequences.

Besides politics, economics, history, culture and anthropology, a knowledge of psychology, is required as a qualification, coupled with a philosophical and penetrating mind capable of accurate observation and sober judgement. Is there any leader with such encyclopædic qualifications?—He is hard to find. Then the explanation of our failure to compete with it is obvious. It is the same with regard to all situation of this nature.

Physical limits of space do not permit me to discuss this subject at great length. The main point that I have endeavoured through out this article to impress upon readers is this. It is dangerous to attempt to handle such situation unless one is fully armed with the latest findings of the modern psychology together with a competent knowledge of the other aforementioned sciences,

MOHD. JALALUDDIN AHMED,
IV Year B. A. Class.

THE WEST-MINSTER STATUTE OF 1931

AND

India's Political Future

(Translated from an article in Urdu in the "Payam")

A little after Britain declared war on Germany, His Excellency the Viceroy of India announced in his speech, delivered at the Rotary Club of Bombay, that it was the earnest will of the British Government, as already detailed in the West-minster Statute of 1931, to raise India to the status of a free and ful-fledged nation within the shortest possible period. Since the declaration of this war important changes have been taking place. The dispute between Germany and Poland took a tragic turn and war was the inevitable result. The war, that broke out between Poland and Germany, grew into a world wide conflagration.

The freedom of Holland, Belgium, Norway and France has been ruthlessly wrested by Germany and the desire of the German Dictator to extend the territorial boundries of his country has upset the political stability of Europe as well as that of Africa. Under this circumstance it was the moral duty of India to participate in this war on the side of Great Britain. The Indian Political parties, especially the Indian National Congress, therefore asked the British Government to declare its war aims as the Congress desired to know how they were going to affect India and her fight for freedom. The Government and members of the British Parliament promptly declared that they had taken up the gauntlet against Nazi Germany because Hitler was out to crush the sacred spirit of democracy. It was the aim of Hitler, they said, to snatch away the freedom of the peace-loving people and thus blot out democracy. The British

Government in the interests of juand humanity, wanted to prevent the Nazis from over-running small but democratic countries. The Congress urged that the people of India would help Britain, in this war, provided the British Government assured India of her complete freedom and left no room in the minds of the Indians for any doubt or suspicion.

In response to this demand of the Congress, statements were made by the Government of India and the British Government, but finding them unsatisfactory the Congress decided not to co-operate in the successful prosecution of the war, and all the Congress ministers went out of office. After this the Viceroy of India invited the leaders of the different national parties for an exchange of views but nothing useful transpired. The Congress demanded that the constitution should be framed by a Constituent Assembly composed of Indians. The Muslim League also placed her demands before the Viceroy but suffered the same fate as the Congress. On this the Muslim League also decided upon non-cooperation with the British Government. During this period many important and far-reaching changes took place on the different theatres of war in Europe. Hitler, the Dictator of Germany, came to hold sway over the major part of the European continent. All the western coast of Europe is now his and the German air Blitzkrieg over Britain is in full swing. The combined aggression of Germany and Italy began to disturb the peace of the European and the African countries. The freedom of the Middle East was in danger and the Indian situation grew delicate. Everything yet is in the melting pot and the political future of India is as uncertain as ever. The politicians of England have laboured in vain to solve the Indian political tangle, in consultation with the Government of India. Lord Linlithgow, the Viceroy of India; and Mr. L. S. Amery, the Secretary of state for India, have made many statments relating to the future constitution of India. The Politcal Pundits of India fondly thought that

Britain would, as a matter of necessity, promise India full and complete Dominion Status, and thus enable her to rise to her full political stature.

The statements of the Viceroy and the Secretary of State for India made on the 8th and 14th August 1940 respectively assert that the ultimate aim of His Majesty's Government is to give Dominion Status to India as soon as the conflagration in Europe dies down. At the end of the struggle India should form such a body as must comprise the best of the nationalists so that they might frame their own constitution and the British Government would take immediate steps and lend all possible support in implimenting the constitution. It was further laid down that the outline of the constitution and its fundamental principles, already announced in the Act of 1935 would be reconsidered and revised, if necessary, and while framing the new constitution the case of the minorities would be taken up and would receive careful consideration. Mr. Amery, referring to the Viceroy's statement, asserted that the ultimate aim of the British Government is to raise India, by a sure and steady process, to the status of a free country and to that of an equal partner in the British Commonwealth of Nations. Mr. Amery stated that it was his whole-hearted desire to see India grow into a full-fledged and independent state, free to make alliances with the other countries of the world. To the politicians of the prominent parties in India, this was no more than just another of the series of promises made to be broken. They turned it down as unsatisfactory. On 23rd August 1940 the Congress passed a resolution to the effect that the statements made by the Viceroy and the Secretary of State were not only against the spirit of democracy, for which Britain professed to stand up and in defence of which she claimed to have declared war upon Germany, but they are also against the interests of India, so neither the Congress nor the public can appreciate them. These

schemes fall far short of the Congress and may prove a hindrance rather than a help in the formation of a free and united India. Now the British Government is manufacturing vague excuses not to give India her "birthright" i.e., complete freedom. Mr. M. A. Jinnah, the President of the Muslim League, thought it unwise to publish any statement on the declarations made by the Viceroy and the Secretary of State for India without consulting the League. He saw the Viceroy, and placed before the League Working Committee a report of the talks with the Viceroy. On 22nd September 1940 the Muslim League, in its third meeting, passed a resolution to the effect that the statement of the Viceroy was unsatisfactory and vague. It is certain that the statement is regarded as unsatisfactory and it would be hard for the Muslim League to co-operate with the British Government.

The scheme outlined by the Viceroy should be examined in the light of the feelings of the political parties in India. Though Britain has repeatedly promised to concede to India the right to frame her own constitution what is its constitutional and political value? How far are the minds and the feelings of the Indians satisfied? Dominion Status is that constitutional and political condition that now, in the British Commonwealth, the Union of South Africa, Austrialia, New Zealand and Canada enjoy. These states enjoy self Government in the British Common Wealth and this was awarded in in the Statute of 1931. To get a clear idea of the significance of the Statute of 1931, we should recall the constitutional conditions of these states before the Statute was passed.

Before the Westminster Statute was passed the Legislatures of Australia, South Africa and New Zealand had meagre rights. These Legislatures were under the yoke of the supreme British Parliament.

According to the Colonial Validity Act of 1865 the Colonial Legislatures could formulate laws according to the British

Common Law but it was beyond their bounds to pass any act without the consent and the permission of the British parliament. It was left to the free will of the British Government to enforce any law, in these colonies, through the British Parliament. The British Parliament could frame laws for the colonies. The Imperial Government through its nominated Governers could veto the laws already passed by the colonial Legislative Assemblies or could withhold laws until further notice. Eventhough the Governor General passed laws, it was open to His Majesty not to accept them as long as he pleased. These time limits were different in different cases. So these colonies, as far as the framing of laws was concerend, had not the status of independent states. The trade and the political relations of the colonies with other countries were in the hands of the British Government i. e., the British Government framed their foreign policies. During the Great War 1914-18 the colonies fully realized that their Legislatures were governed with an iron hand. The White Hall Act was taken as an insult by the people of the respective colonies. The British politicians awoke to their difficulties and included the representatives of the respective colonies in the Imperial Cabinet, and the representatives of the colonies were given the right and distinction to affix their signatures to the Treaty of Versailles. Gradually they developed their relations with other countries and their representation in the League of Nations confirmed the individual status. In 1923 Canada made a separate pact with U. S. A. without the interference of the British Parliament. Thus the British paramountcy waned. In 1926 Lord Balfour called the Imperial Conference and the colonies were given freedom and equal status and since then the British Government has not interfered in their internal and foreign affairs. But they remained the faithful allies of the Imperial Crown and were the members of the United British Common Wealth. But India was ignored as an isolated factor and thus kept out of the sphere of Balfour's formulae. The reason given

was that "India has separate Status." The Imperial Conference accepted Lord Balfour's constitution but could not enforce it until the British Parliament had given it a constitutional shape. A special committee, for the above-mentioned purpose, was appointed. This committee drew up its report in 1929. In 1931 it was put before the Parliament in the form of the Westminster Statute. According to the Statute, Canada, Australia, New Zealand, the Union of South Africa and New Foundland were given the status of Dominions. The provisions of the Colonial Validity Act of 1857 were cancelled. Liberty was thus given to the Legislatures of these dominions and thus they could frame their own constitutions provided they were effective out side the Dominions.

The Westminster Statute of 1931 completely destroyed the supremacy of the British Parliament for it gave the dominions the opportunity to pass a law to the effect that they could separate themselves from the British Common Wealth if and when they pleased.

During the previous years the British Politicians and the Government of India took measures not to use the word Dominion Status in connection with India. No mention of this was made in the Acts of 1919 and 1935. Lord Irwin, in one of his Viceregal declarations, announced that the meaning of Dominion States is implied in the term Responsible Government. Several statements were published against Lord Irwin's declaration in England. From this time onwards the British politicians and the Government of India very carefully avoided using the word Dominion Status and instead of this the term Responsible Government was freely and frequently used.

When one studies the different sections of the Westminster Statute of 1931 it becomes clear that India will get complete freedom but will be a dependent nation and a member of the British Common Wealth. The Statute gave the

Colonial Legislatures powers to cancel or improve laws and acts passed for their respective countries in the British Parliament. Thus the colonies received rights that were no less than that of a free nation. The Statute gives freedom to other colonies. There is, therefore, no reason why India should not be given constitutional and politicl freedom. Under these conditions the duty of the Indian politicians, is to accept the status of being a Dominion of Westminster type and should not demand complete freedom. India cannot lead a solitary existance. It should be on friendly terms with the other nations especially with Britain and this very aim could be achieved by being a member of the British Common Wealth.

(*Translated by*) ABDUL HASAN SIDDIQI,
Junior Intermediate.

BOOK REVIEWS

(INAUGURAL NUMBER)

The Journal of the Literary Committee of the L. E. Association, Dharwar. (Anglo-Kannanda Quarterly), produced by an Editorial Board consisting of:- 1. S. S. Basawani, M. A., 2. S. C. Nandimath, M. A., PH. D., 3. V. B. Halbhavi, B.A., LL.B., is a quarterly magazine of the Lingayat Education Association founded about sixty years ago for the uplift of the Lingayat Community.

It deals with the Lingayat Community and its uplift. The inaugural number (Basava Jayanti April 1941) is dedicated wholly to the life of Basava, the great Prophet of the Lingayat community. As the need for improvement is being felt in every nook and corner of India, it is good if each community works for its own improvement and welfare. If many circles like these try to ameliorate their conditions, then only there can be a possibility of the removal of the general backwardness of the country.

Basava was the Prime Minister of Kalyan in 1160 A. D. His teachings are instructive and thought-provoking. This number has been dedicated to him, and we congratulate the association for doing such a commendable act. His teachings cannot be intended for this community alone, but are universal. Then only there is a way for salvation and peace.

We heartily congratulate the Lingayat Association in starting this journal, and hope that this will improve the condition of their community.

The Veerashiva Weltanchanung (a pamphlet) by Shri Kumaraswamiji, published by V. R. Koppal, printed by S. B. Harihar, Tontadarya Press, Dharwar -(Pages 29.)

An address delivered by Shri Kumaraswamiji at Adyar under the auspices of the 16th Philosophical Congress held at Madras, in December 1940.

The Swamiji has made a little change in the Philosophy of Indian Metaphysics by mingling it with the materialistic philosophy of the present day: according to Mr. Koppal between 'dynamism of will and conservatism of truth.' This is perhaps due to the great influence of the Basava's Philosophy.

Influenced much by Bergson, he has admitted everything which is "real", but he differs from him, when he says that there is an "impersonel and transcendant aspect of conscious existence." Hence the philosophy of Veerashaiva which has a central touch in it, becomes more dynamic and real. "Spiritual dynamic conception" is his chief conception and he says that in this materialistic age, our ideal must be to raise up the spiritual.

The whole address will be intensely interesting to the students of philosophy and may be read with profit even by students of other subjects.

Mr. ABU TURAB KHALEELUDDIN
B. SC. (OSMANIA)
Liberarian, Students Union.

Mr. QADIR MOHIUDDIN ASIR
Secretary: STUDENTS' UNION.
A very popular Student, is a man of good organisation and skill. He is also a good poet.

AZAM STEAM PRESS.

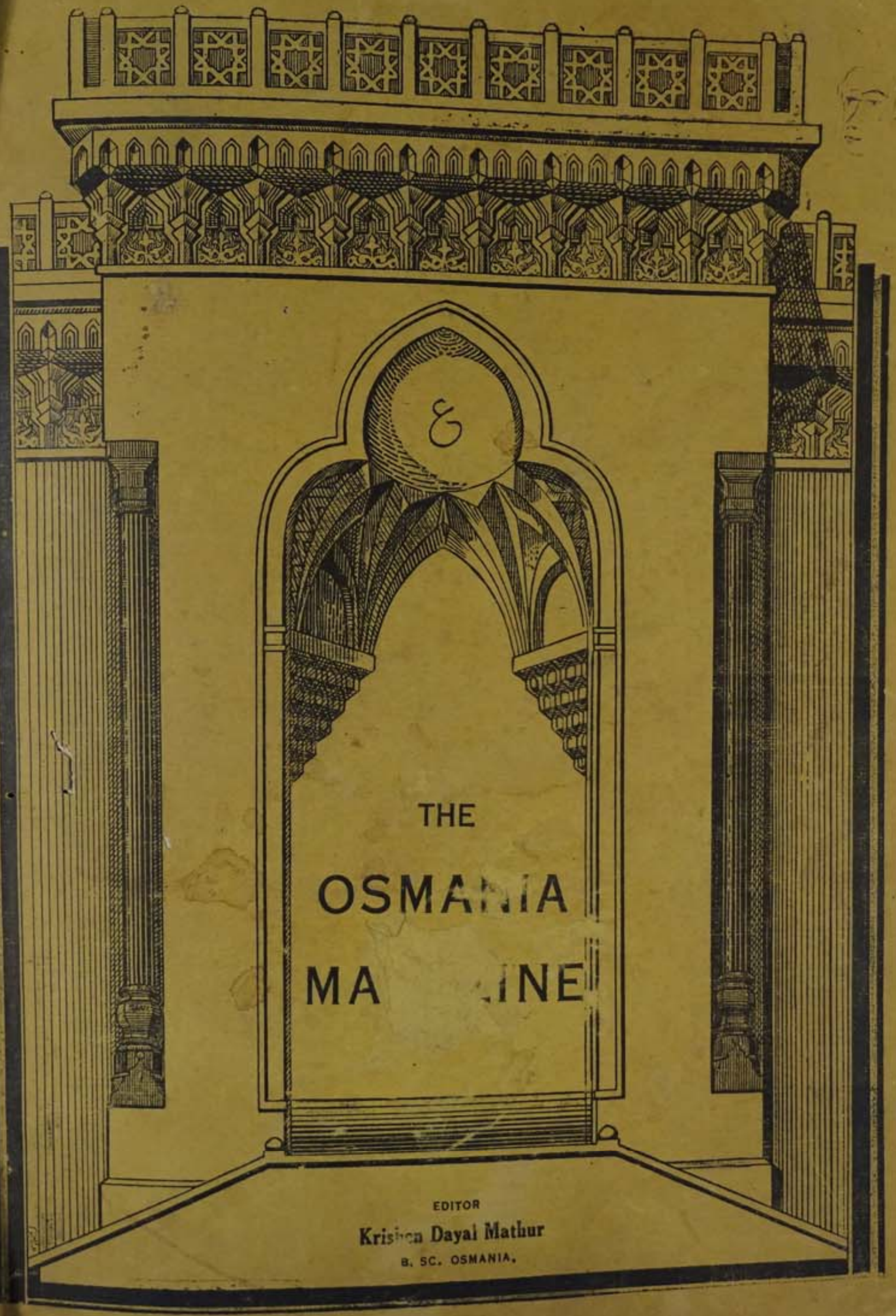

THE OSMANIA MAGAZINE

EDITOR

Krishen Dayal Mathur

B. SC. OSMANIA.